انیسویں صدی کا ہندوستان

لطف اللہ کی آپ بیتی

ترجمہ : ڈاکٹر مبارک علی

انیسویں صدی کا ہندوستان

لطف اللہ کی آپ بیتی

ترجمہ: ڈاکٹر مبارک علی

فکشن ہاؤس

۱۸- مزنگ روڈ، لاہور
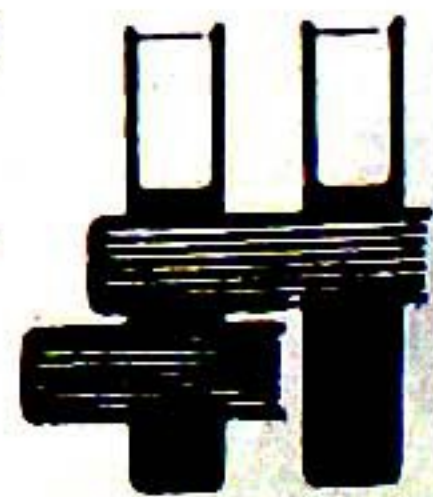
This is an Urdu translation of
Autobiography of Lutfullah
a Mohammadan Gentleman and His transactions
with his fellow creatures
Edited by: Edward B. Eastvick
(Third Edition)
London 1858

نام کتاب = لطف اللہ کی آپ بیتی
مصنف = لطف اللہ
مترجم = ڈاکٹر مبارک علی
پبلشرز = فکشن ہاؤس
18_ مزنگ روڈ، لاہور
فون :7249218, 7237430
پروڈکشن = ظہور احمد خان / رانا عبدالرحمان
معاون = ایم سرور
پرنٹرز = پریمیئر پرنٹرز لاہور
سرورق = ریاظ
اشاعت = 1996ء
قیمت = 150 روپے

اس کتاب کو میں اپنے عزیز دوست

منیر احمد شیخ

کے نام کرتا ہوں کہ جن کی بے وقت موت نے

ہم سب کو غم زدہ کر دیا۔

فہرست

دیباچہ

جیساکہ آپ کو اس کتاب کے مطالعہ کے بعد معلوم ہو گا کہ یہ یادداشتیں لطف اللہ سے اس کے انگریز دوستوں نے لکھوائیں تھیں۔ اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ 1858ء تک اس کے تین ایڈیشن چھپ چکے تھے۔ شاید یہ کتاب اس کے بعد بھی چھپی ہو یا 1857ء کے ہنگامہ کے بعد ہندوستان کے بارے میں انگریزوں کا جو رویہ ہوا' اس کی کتاب کی مقبولیت نہ رہی ہو۔

چونکہ لطف اللہ نے انگریزی زبان میں مہارت حاصل کرلی تھی اس لئے یہ فرض کیا کیا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب انگریزی ہی میں لکھی گئی ہوگی۔ اس کی تصحیح بعد میں اس کے دوست مسٹر ایسٹ وک نے کی اور اسے لندن سے چھپوایا۔ کیپٹن ایسٹ وک جو عرصہ تک سندھ میں رہا اور اس نے سندھ پر "ڈرائی لیوز آف ایجپٹ" "DRY LEAVES OF EGYPT" کے نام سے کتاب لکھی ہے جس کا اردو ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔ اس کتاب کی فوٹوکاپی کی فراہمی کے لئے میں قاسم سومرو کا شکرگزار ہوں۔ پروفسر فریدالدین کتابوں کی حصول میں ہمیشہ معاون رہتے ہیں اس لئے وہ بھی شکریہ کے حق دار ہیں۔

مبارک علی

مئی 1996ء

لاہور

تعارف

انیسویں صدی کا ہندوستان ایک انقلابی روح کو لئے ہوئے تھا۔ ہندوستان کا وہ معاشرہ جو ایک طویل عرصہ سے ٹھہرا ہوا تھا' نئے حالات سے اس میں تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی آہستہ آہستہ اپنے اقتدار کو بڑھا رہی تھی اور اس کے ساتھ ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہوگیا تھا۔ ایک ہندوستان برطانوی علاقہ تھا کہ جہاں نو آبادیاتی نظام اپنی جڑیں مضبوط کررہا تھا۔ دوسری طرف راجاؤں' نوابوں اور سرداروں کا ہندوستان تھا کہ جہاں قدیم روایات و ادارے' دوسری قسم کی تصویر پیش کرتے تھے۔ ایک طرف جدیدیت کا عمل تھا جسکی بنیاد نظم و ضبط اور ترتیب پر تھی تو دوسری طرف انتشار و افراتفری اور بے یقینی کی کیفیت تھی۔ نو آبادیاتی نظام اپنا منہ کھولے اس قدیم ہندوستان کو آہستہ آہستہ نگل رہا تھا۔ ریاستوں کو فتح کیا جارہا تھا۔ ان پر قبضہ ہورہا تھا۔ ضبطی کا عمل جاری تھا۔ راجہ و مہاراجہ اور نواب مجبوری و لاچاری کے عالم میں ہتھیار ڈال رہے تھے' معاہدوں پر دستخط کررہے تھے' اور خود کو اس نظام کی حفاظت میں دے رہے تھے۔ حکمران طبقوں کی یہ مجبوری اور لاچاری اس نظام کی وجہ سے تھی کہ جو صدیوں سے فرسودہ ہو چکا تھا اور جسے تبدیلی کرنے کی انہوں نے کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ سائنس' ٹیکنالوجی' اور فکری سوچ کی غیرموجودگی میں ان کے اسلحہ خانہ میں ایسے کوئی ہتھیار نہ تھے کہ جن سے وہ جنگ کرسکتے۔ اس لئے اکثریت نے خود کو حالات کے حوالہ کردیا۔ کچھ نے مزاحمت کی اور خود کو فنا کرلیا۔

لطف اللہ کی آپ بیتی اسی ہندوستان کی ہے کہ جہاں ایک طرف قدیم روایات و ادارے اپنی دلکشی کے ساتھ موجود ہیں' تو دوسری طرف ان کی افادیت کے ختم ہونے کا احساس بھی ہے۔ پھر انگریزی طور طریق و عادات اور طریق حکومت کا نقشہ بھی اس میں نظر آتا ہے۔ وہ اس ملک پر کہ جس کی حکومت ان کے ہاتھوں میں ہے اسے سمجھنے کی کوشش کررہے ہیں۔ یہاں کی زبانیں سیکھ رہے ہیں۔ تاریخ کا مطالعہ کررہے ہیں۔ یہاں کی قدیم اشیاء کو جمع کررہے ہیں اور یہاں کی ثقافت سے آگہی حاصل کررہے ہیں۔

لہٰذا ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستانی ملازموں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہورہا ہے جو ان کے

ساتھ تعاون کررہا ہے۔ اس ملازمت میں اور مقامی حکمرانوں کی ملازمت میں فرق ہے۔ یہاں ملازمت میں تحفظ ہے۔ پابندی سے تنخواہ کی ادائیگی ہے اور محنت کا صلہ ہے۔ دوسری طرف دربار کی سازشوں اور خوشامد کی وجہ سے ملازموں کے لئے ترقی و آگے بڑھنے کے مواقع مفقود ہیں۔ اس لئے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستانی ملازموں کا طبقہ سب سے زیادہ ان کے مفادات کا تحفظ کرتا ہے۔

سندھ کے بارے میں لطف اللہ کے مشاہدات بڑے دلچسپ ہیں۔ خاص طور سے معاہدے کے بارے میں۔ یہ معاہدہ خود انگریز لکھ لیتے ہیں اور میروں کے سامنے پیش کرکے انہیں اس کی شرائط تسلیم کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ میران حیدر آباد اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ معاہدہ ان کے حق میں نہیں مگر وہ انتہائی مجبوری اور لاچاری کے عالم میں نظر آتے ہیں اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کے ساتھ ناانصافی ہورہی ہے وہ اس پر دستخط کردیتے ہیں۔ دوسری طرف عام رعایا کی جانب سے جو تاثر ہے وہ یہ کہ وہ نہ تو برطانوی حکومت سے خوش ہیں اور نہ اس معاہدہ اور اس کی شرطوں سے۔ برطانوی طاقت کے آگے یہ بے بسی تقریباً سبھی ہندوستانی حکمرانوں میں نظر آتی ہے۔

لطف اللہ نے اگرچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کی مگر وہ انگریزوں کی بے جا خوشامد کرتا نظر نہیں آتا ہے۔ جہاں اسے ان افسروں کا رویہ درشت لگتا ہے وہ اس کی مذمت کرتا ہے۔ اس پوری آپ بیتی میں وہ کہیں احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہے بلکہ خود کو ان کے برابر سمجھتا ہے۔

اس آپ بیتی میں ان ابتدائی انگریزوں کی جدوجہد نظر آتی ہے کہ جو وہ نوآبادیاتی نظام کو استحکام دینے میں لگے ہوئے تھے۔ ہندوستان میں موسموں کی سختی' علاقوں کی اجنبیت' زبانوں کی ناواقفیت' رہائش کی مشکلات اور شدید بیماریاں' ان سب کو برداشت کرتے ہوئے وہ اس نظام کی جڑیں مضبوط کررہے تھے۔ آخر کیوں؟ قوم پرستی' حب الوطنی' عظمت و بڑائی کا احساس یہ وہ جذبات تھے کہ جو ان سے قربانی مانگ رہے تھے اور وہ خوشی سے اس قربان گاہ پر خود کو پیش کررہے تھے۔ جہاں نوآبادیاتی نظام نے ہندوستان سے اپنی قیمت وصول کی وہاں انگریزوں نے بھی اپنی قربانیوں سے اس کو مضبوط و مستحکم بنایا۔ اس کی خاطر انہوں نے جلاوطنی کی زندگی گزاری' خاندان و بچوں سے دور ایک اجنبی کلچر میں رہے اور پھر یہ سب کچھ کس لئے؟ آخرکار اس سے پہلے بھی بڑی بڑی امپائرز ٹوٹیں تھیں' سامراجی قوتیں کمزور ہوکر بکھری تھیں' اور انسانی توانائی قتل و غارت گری و لوٹ مار میں ضائع ہوئی تھی۔ ایک

بار پھر ایسا ہی ہوا۔ برطانوی سلطنت آخرکار سکڑ کر اپنی سرحدوں میں چلی گئی اور اپنے پیچھے تلخ و سہانی یادیں چھوڑ گئی۔

لطف اللہ کے ہاں نہ تو زوال پر نوحہ کنی ہے' نہ اپنے نظام پر تنقید ہے اور نہ ہی برطانوی راج کی برکتوں کا ذکر ہے۔ یہ ایک سیدھا سادھا بیان ہے۔ ان واقعات کی تصویریں کہ جو اس نے دیکھیں۔ ان تجربات کا تجزیہ کہ جن سے وہ گزرا ہے اس سے لطف اللہ کی جو تصویر ابھر کر آتی ہے وہ ایک دیانت دار' عالم' خوددار اور محنتی شخص کی ہے کہ جسے اپنے وطن سے محبت ہے اور جو وطن کی مٹی ہی میں واپس جانا چاہتا ہے۔

کتاب کے آخر میں لطف اللہ نے وعدہ کیا تھا کہ اپنی زندگی کا بقایا حال وہ دوسری جلد میں لکھے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاید حالات نے اسے یہ موقع فراہم نہیں کیا اور وہ بالآخر گمنامی میں وفات پا گیا۔ ہمیں اسکے بارے میں کچھ پتہ نہیں کہ وہ کب مرا اور کہاں دفن ہوا۔ مگر یہ کتاب اس کی یاد کو ضرور باقی رکھے گی۔

کرنل ڈبلیو - ایچ - سائکس - ایف آر - ایس وغیرہ

لندن

آنریبل جناب!

میں کمال لطف و مہربانی سے یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں جس کے بارے میں دس سال ہوئے میں نے آپ ہی کے گھر میں آپ سے ذکر کیا تھا۔ میں یہ کہنے کی جرات نہیں کرتا کہ یہ کتاب آپ جیسے اسکالرؒ کے لائق ہوگی' لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ اس میں جو سچائی چھپی ہوئی ہے اگر اسے آپؒ گرامر کی غلطیوں سے آزاد کردیں' اور اسے اپنی نگرانی میں شائع کرا دیں تو یہ ان لوگوں کے تجربات میں اضافہ کرے گی کہ جو اس کے متلاشی ہیں۔ یہ عام قارئین کو بھی معلومات فراہم کرے گی۔ مجھے امید ہے کہ آپ وقت نکال کر اس کتاب کو پڑھنے کی زحمت کریں گے۔

احترام کے ساتھ

لطف اللہ

سورت

24 نومبر 1854ء

دیباچہ

اس کتاب میں ایک مقامی ہندوستانی کے وہ صحیح جذبات ہیں کہ جن کی روشنی میں وہ ہماری حکومت کا جائزہ لیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ موجودہ بحرانی دور میں (انقلاب 1857ء) اس کو دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ اس کتاب کا مصنف بمقابلہ دوسروں کے کم متعصب ہے۔ لیکن اس کی ہمدردی اپنے ہم مذہبوں اور ان کے رہنماؤں کی طرف اس کتاب سے پوری طرح ظاہر ہوتی ہے۔ اگر کسی کا یہ خیال ہو کہ انگریزوں کو ہندوستان میں اجنبی سمجھا جاتا ہے تو یہ کتاب اس کی نفی کرتی نظر آئے گی۔ مختصراً" یہ کہ ہمیں یہ مان لینا چاہئے کہ ہماری فوج میں اور ہندوستان میں کم ہی ایسے لوگ ہوں گے کہ جو یورپی ترقی کو اس طرح سے دیکھتے ہوں کہ جیسے اس کتاب کا مصنف۔

پہلا باب

بروز جمعرات 7 رجب 1217 کو جوکہ عیسوی سنہ کے حساب سے 4 نومبر 1802ء ہوا' اس روز میں مالوہ کے شہر دھارانگر میں پیدا ہوا۔ میرے والد کا تعلق ایک صوفی سلسلہ سے تھا کہ جس کے جد امجد شاہ کمال الدین' اپنے وقت کے مانے ہوئے بزرگ تھے۔ یہ مالوہ کے سلطان محمود خلجی (1470-1434) کے روحانی مرشد تھے۔ ان کی وفات کے بعد سلطان نے ان کی قبر پر جو شہر کے مغربی دروازہ پر واقع ہے ایک شاندار مقبرہ بنوایا۔ اس کے بالکل بالمقابل اس نے ایک اور روضہ تعمیر کرایا تھا تاکہ اس کو وہاں دفنایا جائے۔ اس درگاہ کے برابر میں ایک قدیم ہندو مندر تھا کہ جسے سلطان کے حکم سے مسجد میں تبدیل کردیا گیا تھا۔ اس درگاہ شریف اور اس کے متولین کے اخراجات کے لئے سلطان نے تین سو ایکڑ زمین وقف کردی تھی تاکہ اس سے ان عمارات کی مرمت ہو سکے اور ان کی دیکھ بھال کرنے والوں کا خرچہ پورا ہو۔ اس کے علاوہ اس نے کچھ زمینوں پر روپیہ میں ایک پائی ٹیکس لگا دیا تھا تاکہ وہ بھی درگاہ کے اخراجات کے لئے کام میں آئے۔

میرے آباؤاجداد نے ان مراعات سے 1706 تک فائدہ اٹھایا مگر جب اورنگ زیب کی وفات کے بعد مالوہ پر مراہٹوں کا قبضہ ہوا تو انہوں نے جاگیر اور دوسری آمدن کو ختم کردیا۔ ہمارے گزارے کے لئے صرف دو ایکڑ چھوڑ دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک خاندان کو جس نے تین صدیوں تک خوشحالی دیکھی تھی' وہ غربت و لاچاری کا شکار ہوگیا۔ اس کو مشرقی استعارے میں اس طرح سے کہا جا سکتا ہے کہ دن کی روشنی ختم ہوگئی اور شام کے سائے بڑھ گئے۔

میرا باپ جبکہ صرف وہ سات سال کا تھا اس وقت وہ علم حاصل کرنے کی تلاش میں سفر پر روانہ ہوا اور کچھ سالوں میں اس نے مختلف علوم میں مہارت حاصل کرلی اور مذہبی درس و تدریس کا پیشہ اختیار کرلیا۔ پندرہ سال کی عمر کو پہنچ کر اس نے واپس اپنے وطن جانے کی خواہش کی۔ لیکن بالائی صوبوں کی آب و ہوا و خوبصورتی' اور دوستوں سے جدائی اس کی راہ میں حائل ہوئی اور اس طرح وہ مزید دس سال تک اور وہاں رکا رہا۔ جب وہ

26 سال کا تھا۔ اس وقت اپنے باپ کے اصرار پر اس نے واپسی کا ارادہ کیا اور دہلی سے آگرہ آیا۔ آگرہ میں جس کے ہاں ٹھہرا اس کو اس نے اپنی شکل و صورت' ادب آداب' اور سلیقہ سے اس قدر متاثر کیا کہ وہ انہیں اپنا داماد بنانے پر تیار ہوگیا۔ میرا باپ شادی کے بعد گھر کی واپسی کو بھول گیا اور اس طرح اسے گھر سے دور رہتے ہوئے چار سال اور گزر گئے۔ جب وہ آگرہ ہی میں تھا کہ اسے اپنے باپ کے مرنے کی خبر ملی۔ یہ خبر سنتے ہی وہ فوراً وطن روانہ ہوا اور پھر یہاں ہی اس نے زندگی کا باقی وقت گزارا۔

49 سال کی عمر میں اسے اپنی بیوی کی مفارقت کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ اس سے اس کی دو لڑکیاں تھیں۔ جو لوگ کہ مشرقی اقوام کے جذبات سے واقف ہیں' انہیں اس بات کا اندازہ ہے کہ ہندو یا مسلمان دونوں اپنے نام اور خاندان کی بقا کے لئے لڑکے کا ہونا کس قدر لازمی خیال کرتے ہیں کیونکہ ان کا خیال ہے کہ لڑکا (جیساکہ ایک انگریز شاعر کہتا ہے) ان کے نام کو ان وقتوں تک زندہ رکھے گا کہ جو ابھی مستقبل میں پوشیدہ ہیں۔ ان حالات میں اگر کوئی میرے باپ کے جذبات کا اندازہ لگاتا تو اسے معلوم ہوتا کہ وہ اپنی اس حالت پر کس قدر افسردہ تھے کہ قسمت نے انہیں اپنے خاندان کا آخری وارث بناکر چھوڑ دیا تھا۔ اگر اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دیا جاتا تو وہ یقیناً کبھی یہ خواہش نہیں کرتا کہ اپنے غم کو دوسری بیوی کی رفاقت میں کم کرے۔ لیکن اس کے دوستوں کے اصرار پر وہ اس بات پر مجبور ہوا کہ ایک سال کے اندر اندر اپنے رنڈوے پن کو ختم کردے اور ایک سترہ سالہ لڑکی سے شادی کرلے کہ جو خوبصورتی' نیکی و پاک دامنی' اور خاندانی وقار میں اس کے برابر کی تھی۔ قارئین ! یہ میری ماں تھی۔ آپ مجھے یقیناً معاف کریں گے اگر میں اس کی تعریف و توصیف میں مبالغہ سے کام لوں اور اس کے لئے نیک جذبات کا اظہار کروں۔

شادی کے تین سال بعد میرے باپ کی دلی تمنا پوری ہوئی اور میری پیدائش نے میرے والدین اور ان کے دوستوں کی خوشیوں میں اضافہ کیا لیکن ان کے علاوہ میرے باپ کے قریبی رشتہ دار بھی تھے۔ جو میری پیدائش سے بالکل خوش نہ تھے۔ کیونکہ میرے زندہ رہنے کی صورت میں انہیں سلطان محمود کی دی ہوئی جاگیر کی آمدن سے آدھا حصہ مجھے دینا پڑتا۔ اگرچہ اب یہ آمدنی کوئی زیادہ نہیں رہی تھی' تقریباً نو سو روپیہ اور اس میں میرا حصہ صرف دو سو روپیہ بنتا۔ لیکن چاہے تھوڑا ہی حصہ دیا جائے' یہ کسی کو گوارا نہیں ہوتا ہے۔ اس وجہ سے میرے رشتہ داروں میں میرے لئے نفرت و حسد کے جذبات پیدا ہوگئے۔ لیکن ان تلخ باتوں کو چھوڑ کر میں ان خوشگوار لمحات کی طرف آتا ہوں کہ جن سے میرے

والدین مسرور ہوئے اور انہوں نے خداتعالیٰ کا شکریہ ادا کیا کہ جس نے انہیں یہ نعمت دی۔ اس کو ذہن میں رکھتے ہوئے انہوں نے میرا نام لطف اللہ رکھا۔ میری پیدائش کے دو سال بعد میری ماں نے ایک اور لڑکے کو جنم دیا۔ لیکن بدقسمتی سے وہ صرف چند مہینے زندہ رہا۔ جب میں چار سال کا ہوا تھا کہ میرے باپ کا انتقال ہوگیا' اور وہ اپنے پسماندگان میں نوجوان بیوہ اور مجبور یتیم کو چھوڑ گیا کہ جنہیں اپنی زندگی کے لئے سہارے کی ضرورت تھی۔

اس وقت حقیقت میں ہماری حالت انتہائی افسوسناک تھی۔ میری ماں جوکہ دنیاوی طریقوں سے قطعی واقف نہیں تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس پر اچانک جو مصیبتیں نازل ہوئیں ہیں ان میں وہ کس سے مدد طلب کرے اور کس سے مشورہ کرے۔ میرے قریبی رشتہ جوکہ ہماری موروثی آمدنی میں شریک تھے' وہ مدد کرنے کے بجائے یہ سوچنے لگے کہ ہماری مکمل تباہی کا بندوبست کیسے کیا جائے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ اسی زمانہ میں سخت قحط پڑا کہ جس نے ہم لوگوں کی حالت اور مزید خراب کردی۔ قحط کی یاد میرے ذہن میں آج تک اس طرح سے تازہ ہے کہ جیسے یہ ابھی کل ہی کی بات ہو۔

قحط کے دنوں میں خاصی تعداد میں لوگ روزانہ بھوک کی شدت سے مر جاتے تھے۔ ان کی لاشیں گھسیٹ کر شہر سے باہر لے جائی جاتی تھیں اور انہیں یا تو کسی گڑھے میں دفن کردیا جاتا تھا یا سوکھے کنوؤں میں پھینک دیا جاتا تھا۔ اس تباہ کن قحط میں ایک واقعہ ایسا ہوا کہ جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ایک انسان بھوک اور فاقہ کی وجہ سے کس حد تک گر سکتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس واقعہ کو ضرور بیان کروں۔ مجھے یاد ہے کہ میں اپنے چچا کے ساتھ ایک عورت کو دیکھنے گیا کہ جس کی سربازار تشہیر کی جارہی تھی۔ اس مقصد کے لئے اس کے چہرے کو ایک طرف سے سفید اور دوسری طرف سے کالا کیا گیا تھا اور اسے گدھے پر الٹا بٹھایا گیا تھا۔ چونکہ مجھے اس کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ اس لئے میں اس کو اس حالت میں دیکھ کر محظوظ ہوا۔ لیکن میری یہ خوشی تھوڑی ہی دیر میں ختم ہوگئی کہ جب مجھے یہ بتایا گیا کہ یہ عورت ایک قریبی گاؤں کی ہے اور اس کا جرم یہ ہے کہ اس نے بھوک کی شدت سے مجبور ہوکر اپنے ہمسایہ کے بچے کو مار ڈالا اور اس کے گوشت کو ابال کر کھا گئی۔

لیکن اب میں اپنی کہانی کی طرف لوٹ کر آتا ہوں۔ میرے والد کے چہلم کے بعد میری ماں نے اس بات کو مناسب جانا کہ ہم اپنے باپ کے گھر کو چھوڑ دیں کہ جہاں ہم

اپنے نام نہاد رشتہ داروں کے ساتھ رہ رہے تھے اور جو خفیہ طور پر ہماری تباہی چاہتے تھے۔ لہٰذا ہم نانی اور ماموں کے گھر چلے آئے کہ جنہوں نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ ہمارا استقبال کیا اور بعد میں بھی ہمارا بڑا خیال رکھا۔ ان رشتہ داروں کے تعلقات میں ہمارے نہ تو کوئی جائیداد کے جھگڑے تھے اور نہ ہی مالی مفادات کا دخل تھا۔ اگرچہ ہم دو کے اضافہ سے ان پر بوجھ تو پڑا لیکن انہیں ہماری بے چارگی کا جو احساس تھا اس کی وجہ سے انہوں نے اس تکلیف کو برداشت کرلیا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میرے ماموں نے مجھ میں اور اپنے بچوں میں کوئی فرق نہیں رکھا اور اگر فرق رکھا بھی تو یہ کہ وہ مجھ سے اور بچوں کے مقابلہ میں زیادہ ہی محبت اور ہمدردی سے پیش آتے تھے اور یہی حال میری نانی کا تھا کہ جن کا رویہ میرے ساتھ انتہائی مشفقانہ تھا۔

ہمدردی کے اس ماحول میں ہم نے اپنا وقت بڑا خوشگوار گزارا۔ لیکن اس زمانہ میں' یعنی برطانوی حکومت کے قیام سے پہلے' ملک میں لاقانونیت کا دور دورہ تھا۔ سال میں دو یا تین بار یہ خبر ملتی تھی کہ پنڈاریوں نے قریبی علاقوں میں لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کررکھا ہے یا کسی قریبی راجہ و زمیندار نے حملہ کرکے شہر کو لوٹ لیا ہے اور لوگوں سے جرمانے وصول کئے ہیں۔ لوٹ مار کے اس خوف سے لوگ اپنے زیورات اور نقدی کو زمین میں دبا کر چھپا دیتے تھے۔ جس وقت شہروں پر حملہ ہوتا تھا تو اس وقت شہریوں کی حالت ایسی ہوتی جیسے وہ دو آگوں کے درمیان ہوں کیونکہ جو گولے حملہ آوروں پر قلعہ سے پھینکے جاتے تھے وہ ان تک پہنچنے کے بجائے شہر ہی میں گر جاتے تھے' جس کی وجہ سے جانی و مالی نقصان ہوتا تھا۔ لہٰذا اگر دشمن شہر پر قبضہ کرنے میں کامیاب نہ بھی ہو تو اس کی وجہ سے شہریوں کو خاصی تباہی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اور اگر دشمن کامیاب ہو جاتا تھا تو پھر شہریوں کو تشدد اور اذیت سے دوچار ہونا پڑتا تھا کیونکہ حملہ آور ان سے مدفون خزانوں کے بارے میں معلومات کرتے تھے۔ اس مقصد کے لئے اذیت کے مختلف طریقوں کو استعمال کیا جاتا تھا۔ ان میں سے تین سب سے زیادہ تکلیف دہ اور بھیانک تھے۔

ان میں سے ایک یہ تھا کہ کسی شخص کو رسیوں سے باندھ کر ننگے سر جلتے سورج کی روشنی میں کھڑا کردیا جاتا تھا اور اس کے کانوں کو بندوق کی لبلبی سے چھید دیا جاتا تھا۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ اسے دھوپ میں کھڑا کرکے اس کے سر پر انگور کے دانے برابر پتھر رکھا جاتا تھا اور پھر اس کے اوپر ایک بھاری پتھر تاکہ یہ اس کے سر میں داخل ہو جائے اور اسے تکلیف دے۔ تیسرا طریقہ یہ تھا کہ ایک تھیلہ میں راکھ اور سرخ مرچیں ملا کر اس

کے منہ پر باندھ دیا جاتا تھا۔ جب وہ سانس لیتا تو یہ اس کے منہ اور ناک میں جاتا جس سے اس پر ابتدا میں کھانسنے کا دورہ پڑتا مگر آخر میں اس کا دم گھٹ جاتا اور اس کی موت واقعہ ہو جاتی۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے طریقے جن کو بطور تشدد استعمال کیا جاتا تھا اور جیساکہ بعد میں میں نے پڑھا کہ یورپ میں چرچ کا محکمہ انکوئزیشن بھی تشدد کے نئے نئے طریقوں کو استعمال کرتا تھا۔ ان طریقوں کی وجہ سے انہیں کامیابی ہو جاتی تھی مگر پھر بھی ایسی مثالیں ہیں کہ جن میں دولت کی محبت زندگی پر غالب آگئی' اور کئی لوگ ایسے نکلے کہ جنہوں نے خاموشی اور قوت برداشت کے ساتھ اذیتوں کو برداشت کیا۔ یہاں تک کہ اذیت نے ان کی زندگیوں کا خاتمہ کردیا مگر انہوں نے اس بات کو ترجیح دی کہ وہ بھی اپنے مدفون خزانوں کے ساتھ دفن ہو جائیں مگر دشمن کو اس کی خبر نہ کریں۔

چونکہ ہمارے خاندانوں کی مذہبی حیثیت تھی' اس لئے حملہ آور افواج ہوں یا لٹیرے' وہ ہمارے ساتھ عزت و احترام کا سلوک کرتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ وہ میرے ماموں کی خدمت میں ہمیشہ تحفہ تحائف پیش کرتے تھے۔ شاید اس سے ان کا مقصد یہ ہو کہ ان کا لوٹ کا مال حلال ہو جائے۔ ہمارے محلہ میں جو بھی ہندو و مسلمان رہتے تھے ان کو جب بھی موقع ملتا تو ان حالات میں وہ اپنا مال و دولت اور بعض حالات میں خود کو اور اپنے خاندان کو ہمارے گھروں میں منتقل کردیتے تھے تاکہ وہ تشدد سے بچ سکیں اور اپنا مال بچا سکیں۔ اس لئے جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم ان مصیبتوں سے بچ جاتے تھے۔ لیکن ہم جو کچھ لوگوں کے ساتھ ہوتا دیکھتے تھے' وہ ہمارے لئے انتہائی تکلیف دہ ہوا کرتا تھا۔

میرے ماموں نے میرے غاصب رشتہ داروں کے خلاف ہمارا ساتھ دیا اور ہمیشہ ان سے مطالبہ کیا کہ وہ جاگیر میں ہمارا آدھا حصہ ہمیں دیں' اور درگاہ پر جو نذرانے آتے ہیں ان میں سے بھی جو ہمارا بنتا ہے اسے ادا کریں۔ اس دباؤ کے تحت کبھی کبھی وہ تھوڑے بہت روپیہ ہمیں دے دیتے تھے' مگر ان کا کہنا تھا کہ یا تو میں ان کی طرح روز درگاہ میں حاضری دوں اور جو نذرانے آتے ہیں ان کو جمع کرنے میں مدد کروں یا پھر اپنے بجائے کسی اور کو اس کام پر مقرر کروں۔ میرے ماموں کی مالی حالت ایسی تھی کہ ہم ان پر بوجھ نہیں تھے۔ لیکن میری ماں یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ ہماری تمام ضروریات کو پورا کریں۔

میری ماں کو اپنے جہیز میں چار سو روپیہ مالیت کے کچھ زیورات ملے تھے۔ جنہیں اس نے ضرورت کے تحت ایک ایک کرکے بیچنا شروع کردیا۔ یہاں تک کہ ایک سال کے اندر اندر یہ تمام زیورات غائب ہوگئے۔ مگر خوش قسمتی سے اس کے ساتھ ہی ہماری ضروریات

بھی باقی نہیں رہیں۔

کچھ عرصہ بعد ہی میری بچپن کی زبان ٹھیک ہوگئی اور میں الفاظ کی صحیح ادائیگی کرنے لگا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میری یہ عادت ہوگئی کہ میں قصہ کہانیاں گھڑ کر اپنی ماں اور رشتہ داروں کو سناتا اور اپنی باتوں سے انہیں محظوظ کرتا۔ یہ بھی ہوتا تھا کہ میری شرارتوں کی وجہ سے اکثر میرے گھر والے مجھ سے پریشان رہتے تھے۔

مثلاً میں مینڈک پکڑ کر انہیں عورتوں کے تھیلے میں ڈال دیتا تھا جس میں کہ وہ سوئی دھاگا اور روئی رکھتی تھیں۔ پھر میں اس وقت کا منتظر رہتا تھا کہ جب یہ ناشتہ کے بعد گھر کے کام کاج سے فارغ ہوں اور اطمینان کے ساتھ سینے پرونے کا کام شروع کردیں۔ جیسے ہی وہ تھیلا کھول کر اس میں ہاتھ ڈالتیں' اس میں چھپا ہوا مینڈک اچھل کر ان کی گود میں آجاتا۔ اس اچانک حادثہ سے یا تو وہ چیخ مارتیں یا کبھی کبھی بے ہوش ہو جاتیں اور یوں وہ دیکھنے والوں کے لئے ایک تماشہ بن جاتی تھیں۔

پانچ سال کی عمر تک میں گھر والوں کے لئے مصیبت بن چکا تھا۔ اس لئے انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ مجھے سکول بھیجا جائے۔ ایک اچھے دن اور اچھی ساعت میں مجھے کتابیں تھما کر سکول لے جایا گیا۔ اس موقع پر میری حالت ایسی ہی تھی کہ جیسے کسی بھیڑ کو زبردستی مذبح خانہ لے جایا جاتا ہے۔

میرے ماموں نے میرا تعارف سکول کے استاد سے کرایا۔ کچھ عرصہ پڑھائی کے بعد میرا استاد مجھ سے خوش ہوگیا کیونکہ میں اپنی کلاس کے لڑکوں کے مقابلہ میں جلدی سبق یاد کرلیا تھا۔ اور قرآن شریف کی تلاوت بھی میں کسی ملا سے بہتر ہی کرتا تھا۔ چھ مہینے کے اندر اندر میں نے تمام دعائیں یاد کرلیں اور یوں ہر جگہ میری تعریف ہونے لگی۔ جب بھی میں لوگوں کے درمیان کوئی دعا پڑھتا' سننے والے فوراً میری تعریف کرنے لگتے۔ اس عرصہ میں صرف ایک بار مجھے سخت سزا ملی' وہ بھی اس وقت جب کہ میں نے محترم شیخ نصراللہ کے ساتھ بدتمیزی کی۔

یہ شریف بوڑھا شخص حاصل پور کا رہنے والا جو کہ ہماری ڈسٹرکٹ سے پچاس میل کے فاصلہ پر تھا وہاں نماز پڑھاتا تھا۔ اس کی میرے ماموں سے دوستی تھی۔ اس لئے وہ اکثر ہمارے گھر آتا رہتا تھا اور یہاں کئی دن یا کئی ہفتہ رہتا تھا۔ میرے ماموں کی مالی حالت اس قابل نہیں تھی کہ وہ اتنے طویل عرصہ اس کی میزبانی کریں۔ مگر وہ اپنی عادت سے مجبور تھے۔ اور اس کے ساتھ خوش دلی سے پیش آتے تھے۔ مہمان کی خاطر داری کی وجہ سے

انہیں نہ صرف یہ کہ اپنے گھر کی چیزیں رہن رکھنا پڑیں بلکہ وہ قرض دار بھی ہو گئے۔

لہٰذا ہوا یہ کہ حسب معمول شیخ نصراللہ ہمارے گھر آئے۔ اس کی عادت تھی کہ وہ ہمیشہ بات چیت میں کوئی نہ کوئی ضرب المثل ضرور استعمال کرتا تھا۔ مجھے اس کی شکل و صورت اب تک اچھی طرح سے یاد ہے۔ وہ لمبا تڑنگا اور صحت مند شخص تھا۔ وہ ہمیشہ آنکھیں گھماتا تھا اور سر کو زور زور سے ہلاتا تھا جیسے کہ وہ ہر بات پر رضامندی کا اظہار کر رہا ہو۔ اس کے منہ میں کوئی دانت نہ تھے۔ لیکن اس کی سفید لمبی داڑھی نے اس کی تمام جسمانی بدصورتیوں کو چھپا لیا تھا۔ اسے باتیں کرنے کا بڑا شوق تھا۔ چاہے ان کا کوئی مطلب ہو یا نہ ہو اور چاہے کوئی سنے یا نہ سنے۔ اگرچہ کسی کی غیبت کرنا ایک ناقابل تلافی جرم ہے اور خاص طور سے ان لوگوں کی کہ جو وفات پا چکے ہیں۔ مگر جیسا کہ لارڈ بیکن نے کہا ہے کہ " بدصورت لوگ فطرت کے اس لئے خلاف ہوتے ہیں کیونکہ فطرت نے ان کے ساتھ بھلائی نہیں کی اور انہیں جسمانی خوبصورتی سے محروم رکھا۔" قصہ مختصر ___ میرے ماموں کے لئے یہ ایک مشکل کام تھا کہ شام کے کھانے کے بعد کس طرح اس سے جان چھڑائی جائے۔ وہ اکثر اپنے بوڑھے مہمان کی باتیں سنتے سنتے سو جاتے تھے اور جب تک انہیں کوئی اٹھائے نہیں، ان کی عشاء کی نماز قضا ہو جاتی تھی۔ بوڑھا آدمی ____ خدا اس کی مغفرت کرے (خدا مجھے اس جرم کی بھی معافی دے کہ جو میں نے اس کے ساتھ کیا) مجھے پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ میرا امتحان لینے کی فکر مین رہتا تھا اور جب بھی میں ذرا سا غلط جواب دیتا، یا کسی لفظ کا تلفظ صحیح ادا نہ کرتا، تو اس سے فائدہ اٹھا کر وہ مجے برا بھلا کہتا۔ اس کی ان ڈانٹ ڈپٹ سے تنگ آکر آخر ایک دن میں نے فیصلہ کیا کہ اس سے انتقام لیا جائے۔

ایک جمعہ کو میں بازار گیا اور اپنے جیب خرچ سے بچائی ہوئی رقم سے میں نے تھوڑی سی بارود خریدی۔ اسی دن بوڑھا آدمی جمعہ کی نماز سے واپس آیا اور برآمدے کے اس حصہ میں کہ جو ہوا دار تھا، وہاں سو گیا۔ سوتے ہوئے اس کی حالت بڑی مضحکہ خیز تھی۔ ابھری ہوئی توند، کھلا منہ، آدھی بند ہوئی آنکھیں، اور سینہ پر سفید داڑھی۔ اس طرح سے تھی جیسے کہ کوئی گھاس کا بنڈل پڑا ہو۔ میں خاموشی سے اس کے پاس گیا اور بارود کو اس کی داڑھی میں بکھیر دیا۔ اس کے بعد میں نے ایک بانس پر آگ لگائی اور دور سے اس کی داڑھی کے قریب لے گیا جس کی وجہ سے اس کی داڑھی میں آگ بھڑک اٹھی۔ بوڑھا شخص اس کی وجہ سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور اپنے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کلمہ پڑھنے لگا۔

میں موقع سے فائدہ اٹھا کر چپکے سے زنان خانہ میں چلا گیا اور بڑے اطمینان کے ساتھ دروازے کے سوراخ سے تماشہ دیکھنے لگا۔ بوڑھا آدمی گھبراہٹ میں ادھر سے ادھر بھاگ رہا تھا اور انتہائی غصہ کی حالت میں تھا۔ اس کے چہرہ اور ہاتھ کی جلد آگ سے جل گئی تھی اور اس کی ادھ جلی داڑھی نے اسے انتہائی بدصورت اور مکروہ شکل کر دیا تھا۔ اس کی چیخ و پکار سن کر میرا ماموں بھاگا ہوا آیا اور جب اس نے اسے اس حالت میں دیکھا تو پریشانی سے پوچھنے لگا کہ حضرت یہ آپ کے ساتھ کیا ہوا؟ شیخ نصراللہ نے غصہ اور صدمہ کے ساتھ کہا کہ "میں تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔ خدا نے میرے گناہوں کی سزا دی اور میری داڑھی کے ساتھ میری عزت بھی گئی۔ ہائے میری داڑھی۔"

اس کی شکل اور اس کی سراسیمگی کو دیکھ کر میرا ماموں بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس کی مسکراہٹ دیکھ کر بڑے میاں کو اور غصہ آگیا اور اسے ڈانٹتے ہوئے سختی سے کہا " کیا تمہیں اپنے بھائی کی مصیبت پر ہنستے ہوئے شرم نہیں آتی؟" اس پر میرے ماموں نے فوراً اس سے معافی مانگ لی اور پوچھنے لگے کہ آخر یہ سب کیسے ہوا؟ اس پر اس نے غصہ سے کہا اس بدمعاش' کتے' کافر اور چھوٹے شیطان کا کیا دھرا ہے' جسے تم ذہین اور قابل طالب علم سمجھتے ہو۔ یہ بانس جو یہاں پڑا ہوا ہے اس کا ثبوت ہے اور وہ اس قابل ہے کہ فوراً اس کی گردن اڑا دی جائے۔ یہ سن کر میں انتہائی پریشان ہوا۔ اور فوراً اپنے بستر پر جاکر لیٹ گیا اور ظاہر یہ کیا کہ جیسے میں گہری نیند میں ہوں۔ اس عرصہ میں میرے نیک ماموں نے اس کے چہرے اور ہاتھوں پر پھائے رکھے اور اسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ جو کچھ ہوا ہے' اسے برداشت کرنا چاہیئے' کیونکہ قسمت میں جو لکھا ہوتا ہے وہ پورا ہوتا ہے' اور انسان اس کے آگے مجبور ہے۔ اس نے شیخ سے وعدہ کیا کہ اس لڑکے نے جو کچھ کیا ہے اس کی اسے سخت سزا ملے گی۔ میرا خیال ہے کہ اس آخری جملے نے بڑے میاں کو اور دوسری نصیحتوں کے مقابلہ میں زیادہ تسلی دی۔ اس کے بعد میرا ماموں گھر کے اندر آیا۔ ارادہ تو اس کا یہی تھا کہ مجھے سخت سزا دے' مگر اپنے نرم مزاج کی وجہ سے وہ اس پر عمل نہیں کرسکا اور یہ سارا قصہ میری ماں اور نانی کو سنایا۔ جنہوں نے بغیر کسی ثبوت اور کسی سوال کے میری پیٹھ پر ڈنڈے برسانا شروع کردیئے۔ میں نے ان کی انتہائی منت سماجت کی' معافی مانگی' اپنی بے گناہی کا اعلان کیا اور بے وقوفی سے یہ بھی کہا کہ میں نے اس کی داڑھی کو قطعی آگ نہیں لگائی ___ اس جملہ نے میرے جرم کو ثابت کردیا۔ میری قسمت اچھی تھی کہ میرے ماموں کی موجودگی کی وجہ سے میری زیادہ پٹائی نہیں ہوئی اور مجھے ان

عورتوں سے آسانی سے نجات مل گئی۔
میری والدہ نے اس واقعہ کے بعد قرآن کی قسم کھا کر یہ کہا کہ اگر میں نے مستقبل میں ایسی کوئی حرکت کی تو وہ میرے ہاتھوں کو جلا کر رکھ دے گی۔ بہرحال مجھے اس بات سے خوشی ہوئی کہ میں اس عذاب سے آسانی کے ساتھ چھوٹ گیا۔ اگرچہ مجھے اس کا اندازہ نہ تھا کہ آنے والا کل میرے لئے مصیبتیں لا رہا ہے اور مجھے سخت قسم کی مار پڑنے والی ہے۔
دوسرے دن صبح صبح میں اپنی کتابوں اور ناشتہ کے ساتھ سکول کے لئے روانہ ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ میرا استاد مجھ سے کھچا کھچا ہے اور میرے سلام کا جواب تک نہیں دے رہا ہے۔ میرے کلاس فیلو نے جو میرے ساتھ ہی بیٹھا ہوا تھا۔ آہستگی سے مجھے بتایا کہ بوڑھے شیخ نے میری تمام حرکتوں کے بارے میں میرے استاد کو بتا دیا ہے لہٰذا اب مجھے ہر قسم کی سزا کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ کلاس میں طالب علموں سے آموختہ سنا گیا۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں تین دن کے پڑھے ہوئے اسباق کے بارے میں بتاؤں۔ جو میں نے بغیر کسی غلطی کے فرفر دھرائے۔ جب ہم اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے تو استاد نے مجھ سے پوچھا کہ "کیا تم نے کل شیخ کی داڑھی جلائی تھی؟"
"نہیں جناب!" میں نے جواب دیا۔ میں نے غلطی سے آگ جلائی اور اس کے نتیجہ میں ان کی داڑھی جل گئی مگر مجھے اس غلطی کی پوری پوری سزا مل گئی ہے۔
"غلطی سے" استاد نے انتہائی غصہ سے کہا۔ یہ ایک ناقابل معافی جرم ہے' اور اگر میں نے تمہیں اس کی سزا نہ دی تو کل تو تم میری داڑھی بھی جلا دو گے۔ اس کے بعد مجھے ستون سے باندھ دیا گیا اور میری پیٹھ پر اس قدر ڈنڈے مارے گئے کہ میری کھال ادھڑ گئی۔ اس غیر متوقع سزا نے مجھے اس بات پر مجبور کردیا کہ میں اپنے استاد سے اس کا انتقام لوں۔ اس مرتبہ میں نے جو منصوبہ بنایا وہ اس قدر مکمل تھا کہ کسی کو مجھ پر ذرا بھی شبہ نہیں ہوا۔ بلکہ میرا استاد جو توہم پرست تھا اس کو قہرالٰہی سمجھا کہ جو ایک معصوم یتیم لڑکے کو بلاوجہ سزا دینے کے نتیجے میں اس پر نازل ہوا۔ اس کے ان خیالات کی تصدیق ان خوابوں سے بھی ہوئی کہ جو اس نے دیکھے۔
اس مرتبہ جب میں بازار گیا تو میں نے جمال گوٹہ خریدا۔ اس کی خوبیوں کے بارے میں مجھے اس لئے پتہ تھا کہ میرا ماموں اکثر مریضوں کو بطور دوا استعمال کرنے کو دیتا تھا۔ میں نے اس کو خوب پیس کر اس کی پڑیاں اپنی ٹوپی میں چھپا لیں۔ میرا یہ دستور تھا کہ میں دوسرے طالب علموں کے آنے سے پہلے سکول آجاتا تھا۔ لہٰذا ایک دن مجھے اس کے

استعمال کا موقع یوں ملا کہ جب میرا استاد اپنے دو دوستوں کے ساتھ کلاس سے باہر کسی مذہبی بحث میں مصروف تھا۔ ان کے لئے کافی کے تین پیالے لاکر کلاس میں ہر ایک کی نشست کے سامنے رکھ دیئے گئے۔ اس وقت جب کہ ملازم اس کی اطلاع دینے باہر گیا' میں نے اپنے استاد کے پیالہ میں جمال گوٹہ کی ایک پڑیا ڈال دی اور اسے اپنی انگلی سے ملا دیا۔ اتفاق سے اس وقت ایک نوجوان طالب علم کلاس میں آیا اور مجھے کافی کے قریب دیکھ کر چلایا "ارے ___ ارے کیا تم چوری کر رہے ہو؟" میں نے پریشان ہونے کے بجائے' برجستگی سے کہا کہ "کیا تم اندھے ہوگئے ہو اور دیکھ نہیں رہے ہو کہ میں مکھیاں اڑا رہا ہوں۔ چلو' میرا وقت پورا ہوگیا' اب تم آؤ اور ان پیالوں سے مکھیاں اڑاؤ۔" وہ طالب علم اس کے لئے فوراً تیار ہوگیا۔ میں فوراً دوبارہ سے اپنی نشست پر آیا اور بڑی محویت کے ساتھ کتاب کا مطالعہ کرنا شروع کردیا۔ تھوڑی ہی دیر میں میرا استاد دو دوستوں کے ساتھ آیا' اور باتیں کرتے ہوئے انہوں نے کافی پی' حقے کے کش لگائے۔ اس کے ایک گھنٹہ بعد جب اس کے دوست چلے گئے تو میرے استاد نے اپنی نشست پر کسمسانا شروع کردیا۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ میرے دیئے ہوئے جمال گوٹے کا اس پر اثر ہورہا ہے' کیونکہ اس کے چہرے کی رنگت پیلی ہوگئی اور اس کی گہری د سرخ آنکھیں ڈھلک گئیں۔ جب حالات اس کے قابو سے باہر ہوگئے تو اس نے لڑکوں سے کہا کہ آج وہ چھٹی کرلیں' کیونکہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس نے بداحتیاطی سے کل رات دعوت میں زیادہ کھا لیا تھا۔" میرا خیال ہے کہ یہ دعوت ہی آخر ایک دن میری جان لے کر چھوڑے گی۔"

ہمیں چھٹی کا سن کر انتہائی خوشی ہوئی اور بستوں میں اپنی کتابیں رکھنا شروع کردیں۔ اسی دوران میں استاد کی حالت بگڑنے لگی۔ اس نے اپنی تسبیح کو ایک طرف پھینکا اور پگڑی کو دوسری طرف اور تکلیف سے فرش پر لوٹنے لگا۔ ساتھ ہی میں وہ رات والی دعوت اور اس کے میزبان کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔ جب ہم نے اسے الوداع کہا ہے تو اس کی حالت یہ تھی کہ وہ مسلسل قے کررہا تھا او رپیٹ کو پکڑے درد سے چیخ رہا تھا۔

جہاں تک میرا تعلق ہے تو جاتے ہوئے مجھے اس کی اس حالت کا افسوس بھی تھا مگر ساتھ ہی میں اندرونی طور پر خوش و مسرت بھی۔ اگرچہ میں نے اپنا بدلہ لے لیا تھا' مگر میں اس خیال سے خوف زدہ بھی تھا کہ میں نے استاد کو کچھ زیادہ ہی سزا دے دی ہے۔ اگر اسے کچھ ہو جاتا ہے تو اس خون ناحق کی تمام ذمہ داری مجھ پر آئے گی اور روز قیامت میں

اس کا جواب وہ ہوں گا۔ میں انہی الجھے ہوئے خیالات کے ساتھ گھر پہنچا۔ میری والدہ اس غیرمتوقع وقت پر میرے آنے سے پریشان ہوئی، مگر جب میں نے اسے بتایا کہ میرے استاد کی طبیعت کل رات دعوت میں زیادہ کھانے سے خراب ہوگئی ہے، تو اس نے مجھ سے کہا کہ میں اس کے پاس بیٹھ کر پچھلے ہفتہ میں نے جو کچھ پڑھا ہے وہ اسے سناؤں۔

یہ آموں کا موسم تھا۔ اس لئے میرا ماموں صبح ہی سے باغ میں درختوں کو دیکھنے گیا ہوا تھا، جب وہ دوپہر کو واپس آیا اور اسے استاد کی خرابیِ طبیعت کے بارے میں بتایا گیا تو اس نے کہا کہ وہ کل رات دعوت میں اسے کھاتے دیکھ کر پہلے ہی سے کہہ چکا تھا کہ اس طرح ندیدے پن سے کھانے کا انجام برا ہوگا۔ وہ فوراً ہی اس کے گھر گیا جہاں پر میرا استاد کمزوری سے نڈھال ہوا پڑا تھا۔ اس نے اسے کھانے کو دوا دی اور پرہیز کے بارے میں ہدایات دے کر واپس گھر آیا۔ اگرچہ میرا استاد دوسرے دن بہتر ہوگیا، مگر کئی دن تک وہ اس قابل نہیں رہا کہ ہمیں پڑھا سکے۔ اس عرصہ میں میں نے گھر پر اپنی ماں سے پڑھا۔

استاد کی صحت یابی کے بعد سکول کی سرگرمیاں دوبارہ سے شروع ہوگئیں اور میں نے بھی معمول کے مطابق جانا شروع کردیا۔ اس کے بعد سے استاد کا رویہ میرے ساتھ بہت ہی مشفقانہ ہوگیا۔ اس نے بار بار اپنے دوستوں سے کہا کہ اس کی بیماری کی اصل وجہ میرے ساتھ غیرہمدردانہ رویہ تھا۔ جس کی وجہ سے میرے بزرگ و آباؤاجداد کی روحیں اس سے ناراض ہوگئیں اور انہوں نے کئی بار خواب میں آکر اسے تنبیہہ بھی کی بلکہ اس نے اپنے رویہ کی مجھ سے معافی بھی مانگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سات سال کی عمر ہی میں، میں پیر بن گیا۔ ہر شخص نے میرے ہاتھ چومے اور میرے ساتھ احترام سے پیش آنے لگا۔

اس کے بعد سے اس کی ضرورت نہیں رہی کہ میں مزید قرآن شریف کا مطالعہ کروں، کیونکہ میں اب تک اسے حفظ کرچکا تھا۔ مجھے دعاؤں کی تمام قسمیں ازبر تھیں، بلکہ اکثر ممبر پر کھڑے ہوکر جمعہ کو وعظ بھی دے دیا کرتا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے مذہبی رسومات کی ادائیگی اچھی ہی ہوتی تھی۔

اس کے بعد مجھے فارسی کی تعلیم کے لئے ایک دوسرے استاد کے سپرد کردیا گیا۔ مجھ پر اب تعلیم کا بوجھ زیادہ ہی ہوگیا تھا۔ مجھے دو اسباق پڑھنے ہوتے تھے اور دونوں میں پڑھنے اور لکھنے کی مشق کرنا ہوتی تھی۔ دن میں، میں فارسی کی مشق کرتا تھا اور رات میں میرا ماموں مجھے عربی پڑھاتا تھا جس کی گرامر سے مجھے نفرت ہوگئی تھی کیونکہ مجھے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ میں جو کچھ سیکھ رہا ہوں اس کی اہمیت کیا ہے۔ لیکن میں فارسی میں دلچسپی لے رہا

تھا کیونکہ ہم روزمرہ کے معمولات میں فارسی زبان بولا کرتے تھے۔ اس کا استعمال ہمارے گھر کے لوگ اس وقت کرتے تھے کہ جب وہ کوئی خفیہ بات کرنا چاہتے تھے یا مذہبی امور پر گفتگو کرتے تھے۔ میرا نیا استاد بہت ہی شریف اور اچھی عادات کا شخص تھا۔ میں اس سے جو بھی سوال کرتا وہ اس کی پوری طرح تفصیل سے وضاحت کرتا۔ خود جو سمجھاتا اس کو منطقی طور پر ثابت کرتا۔ اسے غصہ کبھی کبھی آتا تھا۔ مگر جب بھی آتا تو وہ میرے پہلے والے استاد کی شفقت سے اچھا ہوتا تھا۔ وہ پڑھانے کا کام محض اپنے شوق کے لئے کرتا تھا۔ وہ گیکواڑ کے راجہ کے ہاں ملازم تھا' اس لئے اس کا اپنا کوئی سکول نہ تھا۔

آٹھ سال کی عمر میں' میں نے مشہور زمانہ استاد شیخ سعدی کی تمام کتابیں پڑھ ڈالیں تھیں۔ میں فارسی میں خوبصورتی کے ساتھ لکھ سکتا تھا اور عربی گرامر سے بخوبی واقف ہو چکا تھا۔ اس سال میں ایک زبردست حادثہ سے دوچار ہوا' مگر خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے موت کے منہ سے نکال لیا۔ یہ اس طرح ہوا کہ میں اپنے ماموں کی درخواست پر ایک جمعہ کو درگاہ گیا' کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ اس طرح سے میں آمدن سے اپنا حصہ لے سکوں گا۔ درگاہ میں میرے دو چچازاد بھائیوں نے منافقانہ انداز سے میرا استقبال کیا' میں نے کچھ دیر ان کے ساتھ بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کیں۔ وہ مجھ سے کہنے لگے کہ میں اپنی عمر کے لحاظ سے سنجیدہ معلوم ہوتا ہوں۔ لیکن جب میں ان کی عمر کو پہنچوں گا یعنی سترہ یا اٹھارہ سال کا ہوں گا' تو دنیا کے بارے میں میرا تجربہ کچھ بھی نہیں ہوگا' کیونکہ میں اپنا زیادہ وقت سکول میں اساتذہ کی نگرانی میں گزارتا ہوں۔ ان کی ان باتوں کا میں نے کوئی جواب تو نہیں دیا' مگر میں یہ ضرور سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ میرے مقابلہ میں ان کی حالت کس قدر اچھی ہے۔ ان پر سکول جانے کی کوئی پابندی نہیں ہے اور یہ آزادی سے گھومتے پھرتے ہیں۔ ہنستے بولتے ہیں' کھیلتے ہیں' جبکہ میں کتابوں کے بنڈل کے ساتھ تنگ و تاریک کمرے میں بند رہتا ہوں۔ لیکن میں نے اپنے معاشرے کی روایت کے مطابق خود کو اس طرح سے تسلی دے لی کہ یہ میری قسمت ہے کہ مجھے سخت مزاج ماں ملی ہوئی ہے۔ جبکہ ان کی ماں مہربان اور رحمدل ہے۔ چونکہ یہ سب کچھ قسمت کا کھیل ہے اس لئے اس پر سوائے مطمئن ہونے کے اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ اسی دوران کچھ اور لڑکے آئے او یہ سب مل کر کھیلنے میں مشغول ہوگئے۔ دس بجے کے قریب جب ہم کھیل کود سے تھک گئے تو میرے چچازاد بھائیوں نے تجویز پیش کی کہ ہم سب قریبی تالاب میں چل کر نہائیں۔

جس تالاب میں ہم نہانے گئے یہ ایک خوبصورت اور چھوٹا تالاب تھا کہ جس کا پانی

پہاڑوں سے گرتا ہوا نیچے آتا تھا اور تالاب کی شکل میں جمع ہو جاتا تھا۔ تالاب کا صرف ایک حصہ گہرا تھا' ورنہ تین حصوں میں پانی کی سطح نیچی تھی۔ یہ جگہ درختوں سے گھری ہوئی تھی' اور اس کے کنارے پر ایک ہندوؤں کا ایک شاندار مندر تھا۔ یہاں پہنچتے ہی میرے ساتھیوں نے بلندی سے تالاب کے اس حصہ میں چھلانگ لگائی کہ جہاں پانی گہرا تھا اور پھر وہ ادھر سے ادھر ہنستے ہوئے تیرنے لگے۔ میری بھی خواہش تھی کہ میں ان کا ساتھ دوں۔ میرے چہرے کو دیکھ کر انہوں نے میری خواہش کا اندازہ لگاتے ہوئے مجھے تیرنے کی دعوت بھی دی۔ اگرچہ میں نے انہیں بتایا کہ میں تیرنا نہیں جانتا ہوں۔ لیکن انہوں نے کہا وہ مجھے سکھا دیں گے۔ لہٰذا ان پر بھروسہ کرتے ہوئے میں نے کپڑے اتارے اور تالاب میں اتر گیا۔ میرے چچازاد بھائی نے تھوڑی دیر تک تو تیرنے میں میری مدد کی مگر پھر بیچ تالاب میں مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ میں نے پانی میں دو تین بار ڈبکیاں لگائیں اور آخری بار میں بالکل ڈوب گیا' اور شاید قدرت کو منظور ہوتا تو میں کبھی بھی زندہ نہیں نکلتا۔ میرے چچازاد بھائی اور دوسرے لڑکے (جیساکہ مجھے بعد میں بتایا گیا) وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے بعد میں کہا کہ وہ مجھے بچانے کے لئے کسی کو مدد کے لئے بلانا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس عرصہ میں کہ جب تک مدد آئے میں پانی میں ڈوب چکا ہوں گا۔ مجھے پتہ نہیں کہ مجھے پانی سے کتنی دیر بعد نکالا گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ میں ایک درخت سے الٹا لٹکا ہوا ہوں اور میرے منہ' ناک اور آنکھوں سے پانی بہہ رہا ہے۔ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ ایک برہمن میرے پاس کھڑا مجھے زور زور سے ہلا رہا ہے۔ اس وقت مجھے اپنی حالت کی وجہ سے تکلیف ہوئی اور کوشش کی کہ برہمن سے کچھ کہوں' مگر میں اس قدر کمزور تھا کہ مجھ سے بولا نہیں گیا اور صرف اشاروں سے اپنا مطلب اس نیک برہمن کو سمجھایا۔ اس پر اس نے مجھے سیدھا کیا۔ اس کے بعد اس نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر الٹا کیا اور اپنے گرد کئی چکر لگائے۔ یہاں تک کہ وہ خود بھی تھک گیا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد جب مجھ میں تھوڑی طاقت آئی تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا' مگر اسی وقت مجھے متلی ہوئی اور میں نے قے کرکے اس کے کپڑوں کو خراب کردیا۔ میرے منہ سے ایک گھنٹہ تک پانی جاری رہا۔ اس دوران برہمن نے کپڑے دھوئے اور خود کو نہا دھو کر پاک و صاف کیا۔ پھر اس نے مجھ سے تھوڑے فاصلہ پر کھڑے ہوکر سنسکرت میں دعائیں پڑھنا شروع کیں۔ اس پورے عرصہ میں وہ ہمدردی کے ساتھ مجھے تکتا رہا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ اب میں کیسا محسوس کررہا ہوں؟ جواب میں' میں نے کہا کہ اب میری طبیعت کافی بہتر ہے۔ اس کے بعد

میں نے اسے بڑے ادب سے سلام کیا اور اس کا نام پوچھا۔ اس نے کہا کہ اس کا نام راجا رام ہے اور وہ سامنے والے مندر کا متولی ہے۔ وہ اپنے مندر سے ہم سب کو نہاتے ہوئے دیکھ رہا تھا' جب لڑکوں نے مجھے پانی میں چھوڑ دیا اور خود وہاں سے بھاگ گئے تو اسے دیوتا مہادیو نے حکم دیا کہ وہ آئے اور میری جان بچائے لہٰذا اس نے اس مقدس حکم کی تعمیل کی۔ اس کے بعد اس نے مجھ سے کہا کہ میں شکرانہ کے طور پر مہادیو کے حضور میں سر جھکاؤں اور اسے سجدہ کروں۔ اس وقت میں جس حالت میں تھا میر لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ اس کی حکم عدولی کروں۔ لہٰذا اس کے کہنے کے مطابق میں اس کی مورتی کے آگے جھکا اور اس کے سامنے سر بسجود ہوا' لیکن میں دل میں اس قادر مطلق اور خالق کائنات کا مشکور تھا۔ جو واحدولاشریک ہے۔ پیروں کے خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے پہلی بات جو میرے دل میں بٹھائی گئی تھی وہ یہ تھی کہ ہندوؤں کی اس حماقت کا مذاق اڑایا جائے کہ وہ ان پتھر کی مورتیوں کی پوجا کرتے ہیں کہ جنہیں خود وہ اپنے ہاتھ سے بناتے ہیں۔

لیکن اس حادثہ نے میرے ذہن میں کئی سوالات کو پیدا کیا اور میں سوچنے لگا کہ یہ بت پرستی تو ہر جگہ ہے۔ اگر ہندوؤں کے مندروں میں پتھر کی مورتیاں ہیں تو ہماری درگاہوں میں مٹی اور ہڈیاں ہیں۔ اس لئے یا تو ہر ایک پر یقین کیا جائے' یا سب کو رد کردیا جائے۔ بہرحال یہ میرے لئے بڑا پیچیدہ سوال تھا۔

دوسری طرف جب میری معلومات عیسائیت کے بارے میں بڑھیں تو مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ عیسائیوں میں بھی حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں بڑے غلط خیالات ہیں۔ کچھ ان کو خدا سمجھتے ہیں' کچھ خدا کا بیٹا اور کچھ تثلیث کا ایک حصہ۔

اگرچہ میں اپنی بقایا زندگی میں اچھا مسلمان رہا' لیکن اس قسم کے سوالات جو میرے ذہن میں پیدا ہوتے رہے میں ان کا تسلی بخش جواب نہیں پا سکا۔ یہاں تک کہ تیس سال کی عمر میں جب کہ میں نے کئی عمدہ کتابوں کا مطالعہ کیا تو اس وقت مجھے ان سوالوں کا جواب ملا کہ میں کون ہوں؟ اور مجھے کس طرح سے اپنے خالق کی عبادت کرنی چاہیۓ؟ میں یہاں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ اب تک میں اس راز سے ناواقف ہوں کہ آخر میری ابتداء کیا ہے؟ اور جب میں اس دنیا سے جاؤں گا تو کیا ایک ایسی دنیا میں جاؤں گا کہ جس کے بارے میں کسی کو پتہ نہیں' اور جہاں سے جاکر کوئی واپس نہیں آتا تو پھر میرا کیا ہوگا؟ اگر میں ان موضوعات پر' انتہائی احتیاط کے ساتھ' اپنے قریبی دوستوں اور عالموں سے بحث کروں تو وہ یقیناً مجھے کافر کہنے میں تامل نہیں کریں گے۔

اب میں دوبارہ سے اپنی کہانی پر واپس آتا ہوں۔ ابھی میں دیوتا کے سامنے سجدہ کر کے فارغ ہی ہوا تھا کہ برہمن نے اشارہ سے مجھے بتایا کہ لڑکے رسی اور ڈنڈے لئے ہوئے آ رہے ہیں تاکہ مجھے تالاب سے نکالا جائے۔ مجھے دیکھ کر میرے چچازاد بھائی دوڑ کر مجھ سے گلے ملے' اور میرے جسم پر لگی ہوئی مٹی کو صاف کیا' مجھ سے مخاطب ہو کر منافقت کے ساتھ کہنے لگے کہ انہیں افسوس ہے کہ میں ان کے ہاتھوں سے پھسل کر ڈوب گیا' اگر وہ مجھے پانی سے زندہ نکالنے میں ناکام ہو جاتے تو وہ تہیہ کئے ہوئے تھے کہ وہ بھی پانی میں ڈوب کر مر جائیں گے۔ برہمن ان کی یہ جھوٹی باتیں سنتا رہا اور دیکھتا رہا کہ وہ کس طرح سے میرا جسم صاف کر رہے ہیں اور کپڑے پہنا رہے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے ساتھ چلنے کو کہا' جس پر میں اٹھ کھڑا ہوا' جب میں چلنے لگا تو برہمن نے ناراضگی سے لڑکوں سے مخاطب ہو کر کہا "یہ لڑکا بغیر میرے اس جگہ سے نہیں جائے گا' اور میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دوں گا کہ اسے یہاں سے لے جا کر کسی دوسرے کنویں میں اسے پھینک دو۔"

میرے چچازاد بھائیوں نے اپنے خلوص کو ظاہر کرتے ہوئے برہمن کو بتایا کہ درحقیقت میں ان کا بھائی ہوں اور وہ میری مدد کو آئے ہیں۔ مگر اس نے ان کو مزید سننے سے انکار کر دیا اور انہیں دھمکی دی کہ اگر انہوں نے مجھے ساتھ لے جانے پر اصرار کیا تو وہ قریب سے مالیوں کو مدد کے لئے بلا لے گا اور انہیں میرے ساتھ راجا کے وزیر کے پاس بھیجے گا تاکہ وہ اسے ان کی نفرت انگیز کارروائی کے بارے میں بتائیں۔ یہ سن کر وہ ڈر گئے اور اس کے قدموں میں گر کر معافی مانگنے لگے۔ انہوں نے اسے کچھ روپے بھی دیئے اور اس سے یہ وعدہ لیا کہ وہ ان کی اس کارروائی کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائے گا۔

میں نے بھی ان معاملات کو اس طرح سے طے ہونے پر اپنی رضامندی ظاہر کی کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ اگر یہ راز فاش ہوا تو مجھے اس کی سزا ملے گی۔ برہمن نے اور معاملات پر تو اپنی رضامندی ظاہر کر دی مگر وہ اس بات پر تیار نہیں ہوا کہ کسی بھی قیمت پر مجھے ان کے حوالے کرے۔

اس معاہدے کے بعد میرے چچازاد بھائی تو چلے گئے اور راجہ رام مجھے مندر کے پچھواڑے لے گیا جہاں اس نے ایک درخت کے سایہ میں گھاس کو بچھا کر مجھ سے کہا کہ میں یہاں سو جاؤں۔

جہاں تک مجھے یاد ہے میں زندگی میں کبھی اس قدر گہری نیند سویا ہوں جیسا کہ اس دن۔ اور نہ ہی کسی نیند کے بعد میں نے خود کو اس قدر تروتازہ محسوس کیا جیسا کہ اس دن۔

جب برہمن نے مجھے بیدار کیا تو اس وقت تک رات کا اندھیرا چھا چکا تھا۔ میرے تمام کپڑے اور گھاس پسینے کی وجہ سے گیلی ہوئی تھی۔ اس وقت میرا سر بھاری' میرا جسم سن' اور میری ذہنی حالت بڑی خراب تھی۔ برہمن نے کہا کہ پہلے میں ہاتھ منہ دھوؤں' پھر اس نے پوچھا کہ میں کہاں رہتا ہوں۔ میں نے اسے اپنے محلّہ کا بتایا اور اپنے ماموں سے اس کا تعارف کرایا۔ پتہ نہیں کہ کیوں ____ ماموں کا ذکر کرتے ہوئے میں اچانک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ برہمن میرا ہاتھ پکڑے ہوئے میرے بتائے ہوئے پتہ پر میرے ساتھ ہوا۔ راستہ میں اس نے مجھ سے پوچھا کہ میرا باپ کہاں ہے؟

"اس کو مرے ہوئے عرصہ ہوگیا۔" میں نے اسے جواب دیا۔

راستہ بھر وہ مجھ سے میری عمر' ہمارے گھر کی آمدنی اور رشتہ داروں کے بارے میں سوالات پوچھتا رہا۔ میں جو کچھ بھی بتا سکتا اسے جواب دیتا رہا۔ میری حالت زار کو دیکھ کر اور میرے حالات کو سن کر وہ نیک برہمن خاصہ غمگین ہوگیا۔ اس نے بطور عنایت دو روپے مجھے دیئے اور نصیحت کی کہ میں پھر کبھی نہ تو تالاب میں نہانے جاؤں اور نہ ہی اپنے چچازاد بھائیوں پر اعتماد کروں۔

اس نے مجھے گھر کے دروازے پر چھوڑ دیا۔ میرے پہنچنے پر میری ماں' ماموں اور دوسرے گھر والوں کو بڑی خوشی ہوئی۔ میرا ماموں میرا انتظار کرکے میری تلاش میں جانے ہی والا تھا۔ جب انہوں نے میرے دیر سے آنے کی وجہ دریافت کی تو میں نے کہا کہ میری طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ اس کے بعد میں کھانا کھا کر سو گیا۔

پانچ یا چھ دن بعد ان میں سے کسی لڑکے نے میرے ماموں کو اس حادثہ کے بارے میں بتا دیا۔ میرے ماموں نے اس کا ذکر میری ماں سے کیا' مگر اس مرتبہ مجھے برا بھلا کہنے کے بجائے ان سب نے میرے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا اور میرے ساتھ ہونے والے واقعہ پر افسوس کیا۔ راجارام کو بلا کر خاص طور سے اس کا شکریہ ادا کیا گیا۔ میری ماں روائتی پردے کو توڑتے ہوئے ذاتی طور پر برہمن کے سامنے آئی اور بڑے خلوص سے برہمن کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے اس کے اکلوتے لڑکے کی جان بچائی۔ اس کے صلہ میں اس نے اپنی چاندی کی چوڑیاں اور دس روپیہ پیش کئے اور کہا کہ اس کے پاس سوائے اس کے اور کچھ نہیں۔ اگر اس وقت اس کے پاس دس لاکھ ہوتے تو وہ بھی وہ اس کی خدمت میں پیش کردیتی۔ اگرچہ وہ جو کچھ اسے دے رہی ہے یہ اس کی مہربانی اور مدد کے صلہ میں کچھ بھی نہیں ہے۔ نیک' غریب اور ایماندار برہمن نے کہا کہ وہ اپنی مدد کے بدلہ میں کچھ نہیں لے

گا۔ اگر اسے اصرار ہی ہے تو یہ سمجھو کہ اس نے یہ پیشکش قبول کرلی ہے۔ اس کے بعد اس نے میری ماں کی خوشی کی خاطر ایک روپیہ بطور تحفہ قبول کرلیا۔

اس کے بعد سے مجھے اس بات کی اجازت نہیں تھی کہ میں سکول کے علاوہ کہیں اور جاؤں۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مصیبت اکیلی نہیں آتی ہے بلکہ ساتھ میں اوروں کو بھی لاتی ہے۔ اگرچہ میں ڈوبنے سے تو بچ گیا تھا' مگر اس کے دو مہینے بعد مجھے سخت قسم کی پیچش ہوگئی کہ جس نے مہینوں کے اندر اندر مجھے گھلا کر رکھ دیا اور میں محض ہڈیوں کا ڈھانچہ ہوکر رہ گیا۔ مجھ پر ہر قسم کی دوائیں استعمال کی گئیں' ایسی بھی کہ جن کا ذائقہ انتہائی بدمزہ تھا' مگر ان سب کا میری بیماری پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ مجھے صرف چاول اور دال کھانے کی اجازت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ دنوں بعد مجھے کھانے کی پلیٹ دوا سے زیادہ زہر لگنے لگی۔ قصہ مختصر کہ سب کو میری زندگی کی طرف سے مایوسی ہوگئی۔ غریب برہمن اکثر مجھے دیکھنے آتا تھا۔ وہ میری موجودگی میں تو مجھے تسلی دیتا تھا' لیکن جیسے ہی میرے پاس سے جاتا' وہ میری حالت زار پر آنسو بہاتا اور میری مجبوری' یتیمی اور بیماری پر افسردہ ہوتا۔

وقت گزرتا رہا' یہاں تک کہ محرم کا تہوار آگیا کہ جس موقع پر شہر میں دس دن تک ماتم کیا جاتا تھا۔ مجھ میں اتنی طاقت بھی نہیں رہی تھی کہ خود سے چل سکتا' لہٰذا میں نے اپنے ماموں سے درخواست کی وہ مجھے گھر کے دروازے تک لے جائیں۔ یہاں میں باہر ایک بنچ پر بیٹھ گیا اور گلی میں لوگوں کے مجمع کو آتے جاتے اور کھیل میں مصروف دیکھتا رہا۔ میں نے جب لوگوں کے صحت مند چہرے دیکھے تو یہ احساس ہوا کہ اس دنیا میں میرا وقت ختم ہوگیا ہے۔ لہٰذا اب اس دنیا کے بارے میں کہ جہاں مجھے تھوڑے وقت کے لئے رہنا ہے' زیادہ سوچنا بیکار ہے۔ یہ سوچتے سوچتے مجھ پر اداسی کی کیفیت طارق ہوگئی اور قطعی اس کا اندازہ نہیں ہوا کہ ابھی مجھے زندگی کے بہت سے نشیب و فراز سے گزرنا ہے' اور اس خوبصورت دنیا میں لمبے عرصہ زندہ رہنا ہے۔ یہ میری غلطی تھی کیونکہ میں نے قادر مطلق کی لامحدود طاقت کا اندازہ نہیں لگایا تھا جو اس وقت اپنی قدرت کو ظاہر کرتا ہے جبکہ انسان کی طاقت ختم ہو جاتی ہے۔

دروازے پر بیٹھے بیٹھے میری نگاہ بھٹیارے کی دکان پر گئی کہ جہاں کئی قسم کی روٹیاں اور قیمے بھرے سموسے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے ماموں سے درخواست کی کہ مجھے کچھ پیسے دیں تاکہ میں کھانے کی ان چیزوں میں سے کچھ خرید سکوں' کیونکہ انہیں دیکھ کر میری اشتہا بے انتہا بڑھ گئی ہے۔ مگر ان حالات میں میرے ماموں کا جواب تھا "تمہیں ان

میں سے کچھ کھانے کی اجازت نہیں۔ گوشت ان لوگوں کے لئے زہر قاتل ہے کہ جو پیچش کے مریض ہوتے ہیں۔ اگر تم نے اس کا ایک نوالہ بھی کھایا تو یقیناً تم مرجاؤ گے۔" اگرچہ میں اس نصیحت سے بیزار تو ہوا، مگر میرے لئے اس کو تسلیم کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔ چنانچہ میں نے ایک منصوبہ کے تحت اپنی ماں کے صندوقچہ میں سے کچھ پیسے چرائے اور ارادہ کیا کہ رات کو ان سے سموسے خریدوں گا۔ سموسے کھانے کی میری خواہش اس قدر شدید تھی کہ میں نے اپنے مرنے کی بھی پروا نہیں کی۔ جب رات ہوئی تو میں نے اپنا عصا اٹھایا اور اسکے سہارے چلتا ہوا گھر کے باہر گیا۔ باہر بنچ پر بیٹھ کر میں نے بھٹیارے کو آواز دے کر کچھ سموسے منگوائے لیکن اب مسئلہ یہ تھا کہ میں انہیں کسی پر ظاہر کئے بغیر کیسے کھاؤں؟ بہرحال میں نے ایک خاموش جگہ پر سموسے کھائے اور پھر بستر پر جاکر سو گیا۔ میرا خیال تھا کہ میں نے یہ زہر جو کھایا ہے یہ فوراً اثر کرے گا اور شاید میں سونے کے بعد دوبارہ سے زندہ ہی نہ اٹھوں۔ لیکن دوسرے دن مجھے اور میرے گھر والوں کو اس پر تعجب ہوا کہ میری حالت بہتر تھی۔ جس کو میرے سرپرست اور دوست زہر سمجھ رہے تھے وہ میرے لئے تریاق ثابت ہوا۔ اس کے بعد سے میں نے وزن بڑھانا شروع کردیا اور دو مہینوں کے اندر اندر میں بالکل صحت مند ہوگیا۔ اگرچہ اس کے بعد سے میرا معدہ بالکل ٹھیک تو نہیں ہوا، مگر مجھے اب تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ اس کے علاج کے لئے میرے کچھ دوستوں نے کہا کہ میں حقہ پینا شروع کردوں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے میری تکلیف آہستہ آہستہ کم ہوگئی۔ یہ ضرور ہوا کہ اس طرح سے میں اب حقہ کا عادی ہوگیا ہوں۔ یہاں میں اس باب کو ختم کرتا ہوں کہ یہ میری زندگی کے آٹھ سالوں کی کہانی ہے۔

دوسرا باب

اس وقت ہر طرف سے اس کا چرچا تھا کہ جنگ ہونے والی ہے۔ دہلی سلطنت کو اس وقت سخت صدمہ پہنچا کہ جب 1707 میں اورنگ زیب کی وفات ہوگئی۔ لیکن سلطنت کی اصل طاقت اس وقت ختم ہوئی جب شاہ عالم کو کہ جس نے عیاشی و لہو لعب کی زندگی گزاری۔ 1788 میں غلام قادر خاں نے اندھا کردیا۔ اس کی موت 1806 میں ہوئی۔ اس کے بعد اس کا لڑکا اکبر دوم بادشاہ بنا۔ اس کی تخت نشینی میں مرہٹوں نے مدد دی تھی۔ لٰہذا جب سلطنت کی یہ حالت ہوئی تو صوبوں کے عمال نے بغاوت کرکے خودمختاری اختیار کرلی۔

ان تبدیلیوں میں جو دلچسپ خبریں ہم تک پہنچیں وہ یہ تھیں کہ:

ساٹھ سال پہلے محمد شاہ کے دور حکومت میں کچھ غیرملکی جو اپنی عادات و اطوار کے لحاظ سے ہم سے مختلف تھے، ہندوستان میں آئے اور یہاں بادشاہ کی کمزوری، امراء و عاملوں کے اختلافات و خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر اپنا اقتدار قائم کرنا شروع کردیا۔ ان عجیب و غریب لوگوں کے بارے میں طرح طرح کی باتیں مشہور تھیں۔ مثلاً یہ کہ ان کی کوئی کھال نہیں ہوتی ہے، بلکہ ایک باریک غلاف سے ان کا جسم ڈھکا ہوتا ہے جس کی وجہ سے یہ کراہیت کی حد تک سفید نظر آتے ہیں۔ انہیں جادو ٹونا آتا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی تمام مہمات میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ وہ ہمارے پیغمبرؑ پر ایمان نہیں رکھتے ہیں اور خود کو عیسائی کہتے ہیں۔ مگر وہ مقدس انجیل کے قوانین پر عمل نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ اس میں اپنے دنیاوی مفادات کے تحت ترمیم کرلی ہے۔ ان میں سے اکثر بتوں کی پوجا کرتے ہیں اور کھانے میں ہر چیز کھا لیتے ہیں۔ خاص طور پر وہ چیزیں کہ جن کی حضرت موسیٰ نے ممانعت کی ہے۔ اس طرح وہ انجیل کی تعلیمات کی منافی کرتے ہیں۔ کیونکہ اس ممانعت کا ذکر سینٹ میتھیو کی انجیل میں آیات 18 اور 19 میں ہے۔ وہ اگر ضرورت پڑے تو انسانی گوشت تک کھانے سے گریز نہیں کرتے۔ ان کے ایک کے بجائے تین خدا ہیں۔ اپنی مذہبی تعلیمات کے برخلاف یہ ایمان رکھتے ہیں کہ خدائے بزرگ نے شادی کی تھی اور ان کے بچے بھی ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ وہ اپنے پیغمبر کو خدا کا بیٹا اور خود کو خدا کے بچے کہتے ہیں۔ یہ اور اس طرح کی باتیں ان کے بارے میں ہر جگہ کی جاتی تھیں۔ اکثر باتیں ان کے خلاف تھیں۔ مگر صرف ایک بات تھی جو ان کے حق میں تھی اور وہ یہ کہ وہ انصاف پسند ہیں اور انتظامی امور میں وہ کبھی مقدس کتاب اور حضرت سلیمان و حضرت داؤد کے قوانین کی خلاف ورزی

نہیں کرتے ہیں۔

یہ اور اس قسم کی باتیں ہمارے لئے نہ صرف تفریح کا باعث تھیں' بلکہ یہ سن کر ان کے بارے میں ہمارے تعصبات بڑھ جاتے تھے۔ میری اور میرے ماموں کی خواہش تھی کہ ہم ان عجیب و غریب لوگوں کو دیکھیں اور ان سے ان کے جھوٹے مذہب کے بارے میں سوالات کریں۔ چونکہ وہ اب تک ہمارے شہر میں نہیں آئے تھے اس لئے ہم نے کسی یورپی شخص کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ اس وجہ سے ان سے ملنے کا ہمارا جذبہ روزبروز بڑھتا جارہا تھا۔

آخر کار ہماری قسمت اس وقت جاگی کہ جب پنڈاریوں کا زور ختم ہوگیا اور انگریزوں کا یہ ڈر ختم ہوگیا کہ انہیں راستے میں لوٹ لیا جائے گا۔ اگرچہ ابھی تک پہاڑوں میں چھپلے لٹیرے باقی تھے جو رات کو شہر میں آکر لوٹ مار کرتے تھے۔ اگر انہیں پکڑ لیا جاتا تھا تو ان کے لئے قید سے بھاگنا ناممکن ہوتا تھا اور یہ صرف اسی صورت میں چھوٹ سکتے تھے اگر وہ وزیر کو رشوت دیں یا خود راجہ کی خدمت میں تحفہ تحائف پیش کریں۔ ورنہ انہیں اذیتیں دی جاتی تھیں اور بڑے ظالمانہ طریقوں سے ان کو قتل کردیا جاتا تھا۔ ان سزاؤں میں کچھ یہ تھیں:

انہیں ہاتھی کے پیرے سے باندھ کر شہر کی سڑکوں پر گھسیٹا جاتا تھا یا ہاتھی کے ذریعہ ان کے جسم کے دو ٹکڑے کروا دیئے جاتے تھے۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ مہاوت کے اشارے پر ہاتھی مجرم کی ایک ٹانگ کو اپنی سونڈ میں پکڑتا اور دوسری پر اپنا پیر رکھتا' پھر سونڈ سے ٹانگ کھینچ کر جسم کے دو ٹکڑے کر دیتا تھا۔ دوسرے طریقہ میں سر کو پھاڑ دیا جاتا تھا۔ یہ سزا کا سب سے زیادہ خوفناک طریقہ کار تھا۔ اس میں سر پر ایک پتھر کی چھوٹی سی گولی رکھ دی جاتی تھی۔ اس کے بعد جلاد تین مرتبہ اجازت لیتا تھا۔ جب تیسری بار اجازت مل جاتی تو پتھر کی اس گولی پر زور سے ہتھوڑا مارتا تھا۔ جس کی ضرب سے سر پھٹ جاتا تھا اور اس میں سے مغز نکل کر باہر آجاتا تھا۔ سزا کے دوسرے طریقوں میں مجرم کو اونچی دیوار سے نیچے پھینکنا' تلوار سے سر اڑانا' اور توپ سے باندھ کر اڑانا شامل تھے۔ ان میں سے اکثر سزاؤں کو میں خود دیکھ چکا ہوں' لہٰذا میں اپنے قارئین سے درخواست کرتا ہوں کہ جہاں تک ہو سکے وہ ان سزاؤں سے دور رہیں۔

اب میں دوبارہ سے پھر اپنی زندگی کے حالات کی طرف آتا ہوں۔ ہمارے حالات بڑی حد تک خراب ہو چکے تھے۔ ہمارے پاس جو کچھ تھا وہ ہم فروخت کر چکے تھے اور نوبت یہ

آگئی تھی کہ ہمیں کبھی کبھار فاقہ کرنا پڑتا تھا۔ اس کے بعد اگر کھانا بھی ملتا تو سخت محنت و مزدوری کے بعد۔ تمام عورتیں یا تو صبح سے آدھی رات تک چرخا کاتتی تھیں یا سلائی کا کام کرتی تھیں۔ میرا ماموں مختلف کتابوں کی نقل تیار کرتا تھا اور میں ان کو زور سے پڑھ کر غلطیاں درست کراتا تھا۔ لیکن اس سے ہم جو کچھ بھی کماتے تھے اس سے ہمارا گزارا مشکل ہی سے ہوتا تھا۔ ایک دن غربت اور مفلسی سے تنگ آکر میرے ماموں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ بڑودہ جائے کہ جہاں پر اس کے اور میرے باپ کے کچھ مالدار مرید تھے' ہمیں امید تھی کہ ہمارے وہاں جانے سے وہ شاید ہماری مدد کریں اور اس کے نتیجہ میں اگر ہمیشہ کے لئے نہیں تو وقتی طور پر ہمارے حالات بہتر ہو جائیں۔

جب ہم نے جانے کا ارادہ کر ہی لیا تو میں' میری ماں اور ماموں نے سفر کی تیاریاں کیں تاکہ ہم افیون کے تاجروں کے پہلے قافلہ کے ساتھ جاسکیں۔ لہٰذا جب سفر کا وقت آیا تو ہم نے سب گھر والوں سے رخصت لی اور یوں شہر کو چھوڑ دیا۔ قافلہ میں گاڑی بانوں نے ہمارا خیرمقدم کیا۔ ان میں تقریباً سب ہی مسلمان تھے اور تیلیوں کی ذات سے ان کا تعلق تھا۔ یہ سب کے سب پابندیٔ سے عبادت کرنے والے تھے۔ یہ ہمارے ساتھ پانچوں وقت کی نماز پڑھتے اور گاڑی میں ہمارے لئے آرام دہ جگہ محفوظ رکھتے۔ یہی حال کھانے کا کھانا' وہ اپنے مقابلہ میں ہمیں اچھا کھانے کو دیتے اور کوشش کرتے کہ ہمیں سورج کی گرمی' یا رات کو شبنم کی وجہ سے تکلیف نہ ہو۔ یہ میرا پہلا سفر تھا کہ جس میں میں نے پہلی مرتبہ فطرت کو اس قدر قریب سے دیکھا۔ صبح نماز کے بعد جنگل کی تازہ اور صاف ہوا ایک نئی زندگی دیتی اور ذہن کو تروتازہ کر دیتی تھی۔ اونچے اونچے پہاڑوں کا نظارہ' دریا اور شفاف پانی کے بہتے ہوئے چشمے' سرسبز اور مختلف رنگ برنگے پھولوں سے لدے ہوئے درخت' پرندوں کی سریلی آوازیں' ان سب نے مل کر مجھ پر بے انتہائی اثر کیا اور بعض اوقات تو میں فطرت کے ان مناظر کو دیکھ کر مبہوت ہوگیا۔ اکثر ایسے خوشگوار لمحوں میں میرا ماموں خوش الحانی سے سعدی شیرازی کے یہ اشعار پڑھتا تھا کہ سرسبز درخت' دانش مند کی نظر میں' ایک کتاب ہے کہ جو اسے خالق کی لامحدود طاقت کا احساس دلاتا ہے۔

ہم نے ان گاڑیوں میں آرام سے روز تیرہ یا چودہ میل کا سفر کیا اور اپنی منزل مقصود پر 21 دن میں پہنچ گئے۔ پہنچنے پر ہمارے مریدوں نے گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ بدقسمتی سے پانچویں دن میں اور میرا ماموں سخت بیمار ہوگئے۔ اگرچہ میں تو جلد ہی ٹھیک ہوگیا' مگر میرے ماموں کی بیماری بڑھ گئی اور اس نے ہیضہ کی شکل اختیار کرلی جس کی وجہ سے وہ بے

انتہا لاغر اور کمزور ہوگیا۔ ان حالات میں فیصلہ کیا گیا کہ ہم واپس گھر جائیں۔ ہمارے مریدوں نے ہماری مدد کے لئے تین سو روپیہ جمع کرکے ہمیں دیئے اور ہم نے شدت کے ساتھ کسی قافلہ کی تلاش شروع کردی کہ جو ہمیں واپس لے جائے۔

شہر کو چھوڑنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ اپنے قارئین کو کچھ اس شہر کے بارے میں بتاؤں۔ بڑودہ کا اصلی نام "بارپتر" تھا۔ یہ پہلا بڑا شہر تھا جو میں نے دیکھا تھا۔ اس لئے میں اس کا مقابلہ اپنے چھوٹے اور شکستہ حال شہر سے نہیں کرسکتا کہ جو اس کا مشکل سے بارہواں حصہ ہوگا۔ شہر کا اندرونی حصہ فصیلوں میں گھرا ہوا ہے اور اس میں جگہ جگہ پہرے داروں کے لئے منار بنے ہوئے ہیں لیکن اس سے باہر کا حصہ کھلا ہوا ہے اور کہیں کہیں وہ فصیلوں کے درمیان ہے۔ اس کے مرکز میں ایک چوکور بڑی شاندار عمارت ہے' جسے منڈاوی کہتے ہیں۔ اس کے اندر تقریباً سو دکانیں ہیں۔

شہر میں جو محل ہے وہ مرہٹوں کے اپنے انداز کا ہے۔ اس لئے وہ محل سے زیادہ بدصورت تہہ خانہ معلوم ہوتا ہے۔ شہر کی آبادی اس وقت ایک لاکھ کے قریب ہوگی۔ بروڈہ کی حکومت اس وقت مرہٹہ راجہ گیکواڑ جس کا تعلق گائے پالنے والی ذات سے تھا' اس کے پاس تھی۔ راجہ کا نام آنند راؤ تھا' اور یہ خاندان کے بانی پلاجی کی چھٹی نسل سے تھا۔ چونکہ یہ راجہ ان پڑھ ہوتے تھے' اس لئے حکومت کے امور میں ان کے وزیروں کا عمل دخل ہوتا تھا' جو سلطنت کے ہر شعبہ میں اس لئے بے ترتیبی اور پیچیدگی پیدا کرتے تھے کہ اس میں ان کی بدعنوانیاں چھپ جاتی تھیں۔

آنند راؤ اپنے بھائی سیاجی راؤ کے بعد گدی نشین ہوا تھا۔ سیاجی راؤ روپیہ پیسہ خرچ کرنے میں کنجوسی کرتا تھا۔ اس لئے اس نے خاصی دولت اکٹھی کرلی تھی۔ اس کے لڑکے اور کئی لڑکیاں تھیں۔ اس کا سب سے بڑا لڑکا گنپت راؤ گیکواڑ' جسے راؤ صاحب کہتے تھے' اسے سیاجی راؤ نے اپنی زندگی ہی میں اپنا جانشین مقرر کردیا تھا۔

بروڈہ میں پہلی مرتبہ میں نے دو قسم کے لوگ دیکھے : ایک انگریز او دوسرے پارسی۔ اب میں اپنے قارئین کو ان کے بارے میں بتاؤں گا۔ ایک دن جبکہ میں تفریح کی غرض سے شہر میں گھوم رہا تھا کہ اچانک میں نے چار اشخاص کو دیکھا کہ ان میں سے دو گھوڑوں پر سوار تھے اور دو ان کے ساتھ پیدل جا رہے تھے۔ میں نے غور کیا تو ان کی رنگت ایسی ہی نظر آئی جیسا کہ میں اس سے پہلے سن چکا تھا۔ وہ آپس میں باتیں کررہے تھے اور ان کی زبان و لب و لہجہ مجھے انتہائی کرخت معلوم ہوا۔ وہ تنگ قسم کے لباس پہنے ہوئے تھے۔

جس کی وجہ سے ان کے جسم کے وہ حصے نظر آرہے تھے کہ جنہیں ڈھکنا ضروری ہے۔ میرا دل چاہا کہ میں ان کے پاس جاکر ان سے ملوں' لیکن میں اس لئے رک گیا کہ اجنبی شہر میں میرے جیسے کم عمر لڑکے کے لئے یہ مناسب نہیں ہے۔ بہرحال میں نے ہاتھ اٹھا کر انہیں سلام کیا۔ لیکن "السلام علیکم" کے الفاظ ادا نہیں کئے' کیونکہ میرا ایمان تھا کہ اس کا حق صرف مومنوں کو ہے اور دوسروں کو نہیں۔ انہوں نے میرے سلام کا جواب بڑی شائستگی سے دیا' جس کی وجہ سے میرے دل میں ان کے لئے جو تعصب تھا وہ کم ہوگیا۔

بڑودہ میں میں ایک پالتو گینڈے سے بے انتہا متاثر ہوا' جسے شہر کے ایک دروازے کے پاس رکھ رکھا تھا۔ یہ دنیا میں سب سے زیادہ طاقتور جانور ہے۔ مجھے اس کو دیکھنے کا اس قدر شوق ہوگیا تھا کہ میں گھنٹوں اس کے دیکھ بھال کرنے والوں کے ساتھ بیٹھا رہتا اور اس کو گھورتا رہتا۔

چند ہی دن میں ہمیں اطلاع ملی کہ ایک قافلہ میں کچھ گاڑیاں خالی ہیں۔ اور یہ قافلہ ہمارے علاقہ میں افیم کی خریداری کے لئے جانے والا ہے۔ اس قافلہ میں کچھ وہ لوگ بھی تھے کہ جو پہلے والے قافلہ میں تھے۔ اس لئے جب انہیں ہمارا پتہ چلا تو وہ خوشی سے ہمیں ساتھ لے جانے پر تیار ہوگئے۔ ہمارے مرید ہمارے ساتھ دو تین میل تک گئے اور پھر عقیدت کے ساتھ سلام دعا کرکے ہم سے جدا ہوگئے۔ اس مرتبہ ہمارا قیام کم ہوا۔ اس لئے ہم جلد ہی گھر پہنچ گئے۔ میرا ماموں سفر کے دوران بغیر کسی دوا کے جلد ہی صحت یاب ہوگیا۔ اس سے ہم نے یہ اندازہ لگایا کہ ہوا اور پانی کسی شخص کو بیمار بھی کرسکتا ہے۔ اور اسے بیماری سے نجات بھی دلا سکتا ہے۔

مختصراً یہ کہ ہمارا سفر کامیابی سے پورا ہوگیا اور واپسی پر ہم اپنے رشتہ داروں سے مل کر بے انتہا خوش ہوئے۔ میں بیان نہیں کرسکتا کہ مجھے اپنی نانی سے مل کر اور ان سے لپٹ کر کس قدر خوشی ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ اس دنیا میں اس سے زیادہ خوشی کی اور کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ کوئی بچھڑے ہوؤں سے دوبارہ ملے۔ کچھ عرصہ تک ہم سب خوشی و مسرت کے ساتھ رہے اور اس کے لئے خدائے برتر کا شکر ادا کیا کہ جس نے ہمیں اطمینان اور سکون عطا کیا۔ اب گھر میں میری بھی بات سنی جانے لگی تھی کیونکہ ایک تو سفر کے تجربات سے میں نے کچھ سیکھا تھا' دوسرے میں اپنی تعلیم پر بھی زیادہ توجہ دینے لگا تھا۔

میری زندگی کا دوسرا سال بھی پلک جھپکتے ہی گزر گیا اور ایسی کوئی خاص بات نہیں ہوئی کہ جس کا میں ذکر کروں۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ اس عرصہ میں ایک یہودی رسم کے تحت

میری ختنہ ہوئی کہ جس پر تمام مسلمان، سوائے دہلی کے شاہی خاندان کے، پوری طرح سے عمل کرتے ہیں۔ یہ بڑی تکلیف دہ تھی اور اس کی وجہ سے میں ایک ہفتہ تک اپنے بستر پر رہا۔

یہاں پر میں اس امر کی جانب اشارہ کروں گا کہ نہ جانے کیوں مسلمان ایک تکلیف دہ اور نفرت زدہ رسم کو اختیار کئے ہوئے ہیں کہ جس کا کوئی ذکر قرآن شریف میں نہیں ہے۔ عقل کی بات تو یہی ہے کہ ہمارے لوگوں کو چاہئے کہ جسم کے کسی حصہ کو جو خدا نے اسے دیا ہے، اس سے جدا نہ کریں۔ تعجب اس بات پر ہے کہ ہمارے مسلمان بھائی ایک ایسی رسم کو تو اپنانے میں پیش پیش رہتے ہیں کہ جس کا ذکر تک قرآن پاک میں نہیں، مگر وہ باتیں کہ جن پر قرآن میں اصرار کیا گیا ہے کہ ان پر عمل کیا جائے۔ انہیں وہ نظرانداز کر دیتے ہیں۔ مثلاً پانچوں وقت کی نماز، تیس دن کے روزے، سال میں زکوٰۃ اور زندگی میں ایک بار اگر ہو سکے تو حج کرنا۔ اچھے مسلمانوں کو اس کی ممانعت کی گئی ہے وہ شراب پئیں اور سودی کاروبار کریں۔ مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ اور اسی قسم کی دوسری تعلیمات پر مسلمان کم ہی توجہ دیتے ہیں۔

جہاں تک نماز اور روزے کا تعلق ہے، تو بہت کم نیک مسلمان ہوں گے جو اس پر عمل کرتے ہیں، زکوٰۃ ہزار میں سے ایک دیتا ہوگا، صبح بہت کم لوگ مسجد جاتے ہیں، اس فرض کو صرف ایسے غریب اور ناکارہ لوگ ادا کرتے ہیں کہ جو اور کسی کام کے قابل نہیں رہتے ہیں۔ شراب اور نشہ آور اشیاء سے پرہیز کرنے والے بھی ہزاروں میں ایک دو ہوں گے۔ جہاں تک سودی کاروبار میں ملوث ہونے کا سوال ہے تو شاید اس سے کوئی بھی محفوظ نہ ہو۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ اس موضوع پر خاموش ہوا جائے اور حالات کو خدا کی مرضی کے مطابق چھوڑ دیا جائے۔

کچھ مہینہ بعد ہماری بچت پھر ختم ہوگئی اور میرے ماموں نے اس بار اجین جانے کی تیاری شروع کردی تاکہ وہاں وہ کچھ مسودے فروخت کرسکے۔ میں اور میری ماں چونکہ سفر کے اچھے ساتھی تھے لہٰذا ہم اس کی خواہش پر اس کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہوگئے۔ ہم نے ایک گاڑی کرائے پر لی اور دن میں چار یا پانچ میل کا فاصلہ طے کرتے ہوئے سفر کیا، راستہ میں ہم ہر اس گاؤں میں ٹھہر جاتے تھے کہ جہاں چند مسلمان گھرانے آباد ہوتے تھے۔ ہم انہیں اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کرتے اور حرام و حلال کا فرق بتاتے۔ اس کے بدلے میں وہ ہمارے ساتھ عقیدت مندانہ سلوک کرتے۔ آخرکار ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ شہر

کے گرد و نواح کا علاقہ بڑا خوبصورت تھا اور یہاں سے شہر میں مندروں کے کلس اور مسجدوں کے مینار، درختوں کے جھنڈ سے ابھرتے اور بلند ہوتے نظر آرہے تھے۔ ہم شہر میں داخل ہوئے اور یہاں پر ایک جاننے والے کے گھر پر قیام کیا۔

یہ شہر دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی، میرے پوچھنے پر بتایا گیا کہ یہ شہر ہندوؤں کے دیومالائی قصوں کے مطابق ہزاروں سال پہلے آباد ہوا تھا۔ ہندوؤں کے لئے اس شہر کی بڑی توقیر ہے کیونکہ یہاں راجہ کرن، بھرتری اور مشہور زمانہ وکرم جیسے بادشاہ تخت نشین ہوئے اور روحانی طاقتوں کی مدد سے یہاں حکومت کی۔ راجہ وکرم، جس کی وفات 57 ق۔ م میں ہوئی، اس کا سن بطور کلینڈر پورے ہندوستان میں ہندو استعمال کرتے ہیں۔ مسلمانوں نے اس شہر کو 1224 میں فتح کیا تھا۔ محمد شاہ کے عہد زوال میں اس پر مرہٹوں نے قبضہ کرلیا، اور جب سے اب تک یہاں پر سندھیا خاندان کی حکومت ہے۔ 1860ء اس کی آبادی ایک لاکھ بیس ہزار تھی۔

شہر میں قیام کے دوران میری ماں کو دوسری شادی کے لئے کئی رشتے آئے۔ میرا ماموں ان میں سے کچھ رشتوں پر راضی تھا۔ اگرچہ میری ماں کی عمر اس وقت 27 سال کی تھی، مگر اس کی خوبصورتی اور جوانی ابھی تک باقی تھی۔ لہٰذا اس نے میری ماں کو اس بات پر آمادہ کرنا شروع کردیا کہ محض کسی کے نام پر زیادہ عرصہ تک بغیر شادی کے بیٹھے رہنا گناہ ہے۔ دوسرے یہ انتہائی حماقت ہے کہ فطری ضرورت کو پورا نہ کیا جائے، کیونکہ اس سے کئی پاک باز اور نیک لوگ بھی گناہ میں ملوث ہو جاتے ہیں۔ اس پر میری ماں نے سختی سے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کا لڑکا اس پر بوجھ ہوگئے ہیں لہٰذا آج سے وہ علیحدہ رہے گی اور اپنا خرچہ محنت مزدوری کرکے پورا کرے گی، جہاں تک دوسری شادی کا تعلق ہے تو وہ یہ گوارا کرے گی، جہنم میں چلی جائے مگر اپنی اس زندگی میں اس قسم کا احمقانہ فیصلہ کبھی نہ کرے گی۔ میرے ماموں نے اس کے غصہ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور اسے زندگی کے نشیب و فراز کے بارے میں بتایا اور اسے یقین دلایا کہ ہم لوگ اس پر بوجھ نہیں بلکہ اس کے لئے باعث مدد ہیں اور یہ اس کی خوشی ہے کہ ہمیں خوش حال اور پھلتا و پھولتا دیکھے۔ آخرکار اپنے بھائی کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے میری ماں نے دولت راؤ سندھیا کی ماں میناجی کے ایک فوجی ملازم، جس کا عہدہ اچھا خاصہ تھا، شادی کرلی، اس شخص کی عمر چالیس سے زیادہ تھی۔ اس کو دنیاوی تجربہ کافی تھا۔ جس خاتون کے ہاں یہ ملازمت کررہا تھا اس نے اسے اپنے تمام نجی اور پبلک امور دے رکھے تھے۔ وہ اس کی مرضی کے مطابق

کچھ نہیں کرتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس عورت اور اس کے لڑکے کے درمیان جو اختلافات تھے وہ اس کے غلط مشوروں کی وجہ سے تھے۔ وہ ایک لمبا تڑنگا اور صحت مند شخص تھا' لیکن اس کی گول توند باہر نکلی ہوئی تھی۔ اس کی رنگت کالی تھی' اور میرا خیال ہے کہ اس کا دل اس سے بھی زیادہ کالا تھا۔ کسی کافر کے دل کی طرح۔ وہ بالکل ان پڑھ تھا' اور اس کی ساری دلچسپی دنیاوی امور میں کامیابی حاصل کرنا تھی۔ کچھ عرصہ تک تو میں اس بے جوڑ شادی سے ناخوش رہا' مگر چونکہ اس شخص کے پہلی بیوی سے کوئی نرینہ اولاد نہ تھی' اس لئے اس نے مجھے اپنے بیٹے کی طرح سمجھنا شروع کردیا۔ اس نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا کہ وہ مجھے گھڑسواری اور اسلحہ کے استعمال میں تربیت دیں۔ میری خدمت پر دو نوکر تعینات تھے۔ صبح میں شہر کے امراء کے ہاں جایا کرتا تھا اور شام کو اپنی ڈیوڑھی پر بڑی شان سے لوگوں سے ملاقات کیا کرتا تھا۔ اسی طرح سے دو مہینے گزر گئے۔ اس عرصہ میں وہ بوڑھی خاتون جو کہ ہماری محافظ اور مالکن تھی' وفات پا گئی۔ اس کے مرتے ہی وہ تمام لوگ جو ہمارے ساتھ تھے۔ دور ہونے لگے۔ کیونکہ دربار میں کسی سے اس کے اچھے تعلقات نہیں تھے اور سندھیا بھی اس سے خوش نہیں تھا' اس لئے اس کی جان کو خطرہ درپیش تھا۔

بوڑھی عورت کے مرنے کے دس دن بعد ہمارے گھر کو ایک دن صبح صبح چار بجے فوجیوں نے گھیرے میں لے لیا جو بندوقوں اور تلواروں سے مسلح تھے۔ انہوں نے ہمارے گھر پر کچھ گولے برسائے جس کی وجہ سے ہم تمام گھر والے سراسیمہ و پریشان ہوگئے۔ خصوصیت سے میرا سوتیلا باپ اس غیرمتوقع خطرہ سے گھبرا گیا' چونکہ گھر کے دروازے انتہائی مضبوط تھے اس لئے ان پر اس حملہ کا کوئی زیادہ نقصان نہیں ہوا' مگر اس سے گھر کے رہنے والے ضرور متاثر ہوئے۔ میرے سوتیلے باپ نے خطرہ کو بھانپتے ہوئے وضو کیا اور نماز ادا کرنے کھڑا ہوگیا۔ میری ماں اور اس کی ملازمائیں جنہوں نے موت کو آتے ہوئے دیکھ لیا تھا' اس صدمہ کو برداشت نہ کرسکیں اور فوراً ہی بے ہوش ہوگئیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو مجھے اس بات کا یقین تھا کہ میں نہیں مارا جاؤں گا کیونکہ میں بالکل معصوم ہوں اور میں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا ہے اور اگر فرض کریں کہ یہ مجھے قتل کردیتے ہیں تو میں شہید ہوں گا اور فوراً جنت میں چلا جاؤں گا' اور اس صورت میں مجھے یقین تھا کہ میں جنت کی زندگی سے کہ جہاں ہیرے و جواہرات کے محلات ہوں گے' لذیذ کھانے اور خوبصورت حوریں ہوں گی' اس دنیاوی زندگی کے مقابلہ میں زیادہ لطف اٹھاؤں گا۔ اس دوران میں گھر کا بڑا دروازہ توڑ دیا گیا' اور بدمعاشوں کا گروہ گھر میں داخل ہوگیا۔

اس وقت صبح کا اجالا پھیل گیا تھا اور سورج کی روشنی سے ہر شے منور ہو چکی تھی۔ میں نے دیکھا کہ جو لوگ گھر میں داخل ہوئے ہیں وہ مسلسل لوٹ مار میں مصروف ہیں۔ انہوں نے گھوڑوں پر زینیں کس کر انہیں بھگا دیا' پالکیوں اور گاڑیوں پر قبضہ کرلیا۔ گھر کے مردانہ حصہ کا انہوں نے لمحوں میں صفایا کردیا۔ وہ زنانہ میں اب تک داخل نہیں ہوئے تھے کیونکہ ان کی راہ میں قانون اور سماجی روایات حائل تھیں۔ ان میں سے ایک نے جب دور سے مجھے دیکھا تو مرہٹی زبان میں اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر چلایا کہ "اس بدمعاش لڑکے کو پکڑ لو جلد کرو۔ اسے پکڑ کر کھمبے سے باندھ دو اور مارو پیٹو تاکہ اس کے شور کو سن کر صوبیدار اس کی مدد کو آئے۔" یہ سن کر میں بغیر کسی خوف اور ڈر کے ان کے افسر کی جانب گیا کہ جو مجھے جانتا تھا اور جس کے ساتھ میں کئی بار مل چکا تھا' بلکہ اکثر اس سے مذاق بھی کیا تھا۔ ساتھ ہی میں نے فوجیوں کو دھمکایا کہ خبردار مجھے ہاتھ نہ لگائیں کیونکہ میں موت سے نہیں ڈرتا ہوں اور اگر ضرورت پڑے تو توپ کے منہ میں بھی جانے کو تیار ہوں۔ جہاں تک مجھے مارنے پیٹنے اور تشدد کرنے کا سوال ہے تو اس سے میں نہیں ڈرتا ہوں' میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر وہ میرے تکا بوٹی کر دیں تب بھی میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلے گا۔ لیکن اگر وہ میرے ساتھ اچھا برتاؤ کریں گے تو میں نہ صرف صوبیدار کو بلا لوں گا بلکہ اس کا مال و اسباب بھی ان کے حوالے کر دوں گا۔ افسر نے میری اس جرات مندی کی گفتگو کو غور سے سنا اور تعریفی لہجہ میں کہنے لگا کہ: "اسے کچھ مت کہو' یہ ایک بہادر لڑکا ہے' اس کو میرے پاس آنے دو' یہ میرا دوست ہے' اس کا اس گندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" اس کی اس گفتگو سے مجھ میں اور زیادہ جرات آگئی۔ میں نے افسر کی مہربانی پر اس کا شکریہ ادا کیا جس کی وجہ سے وہ مجھ سے اور خوش ہوگیا۔ اس نے مجھے اپنے قریب بٹھایا اور کہنے لگا: "کہ وہ ریاست کے وزیر کے کہنے پر اپنی مرضی کے خلاف اس فرض کو ادا کرنے آیا ہے۔ اس سے کہا گیا ہے مردانہ میں جو کچھ مال و اسباب ہو اس پر قبضہ کرلیا جائے۔ صوبیدار کی اس وقت تک کڑی نگرانی کی جائے کہ جب تک گوالیار کا مہاراجہ اس کے بارے میں کوئی حکم دے لیکن اگر صوبیدار نے خود کو حوالے نہیں کیا' اور مزاحمت کا راستہ اختیار کیا تو اس صورت میں وہ ننگی تلواروں کے ساتھ زنانہ میں داخل ہو جائیں گے اور وہاں جو بھی مال و اسباب ہوگا وہ اس پر قبضہ کرلیں گے" میں نے جواب میں کہا کہ میں اپنے سوتیلے باپ کے پاس جاتا ہوں اور اس کو یہ تمام تفصیل بتاتا ہوں اور اس کو آمادہ کرتا ہوں کہ تم سے ملاقات کو آئے۔ اگر مجھے اس مشن میں کامیابی نہیں ہوتی ہے

تو پھر جو چاہے وہ کر سکتا ہے۔ وہ اس پر راضی ہوگیا۔ اس کے بعد میں' چھوٹا سیاستدان' گھر میں گیا اور اپنے سوتیلے باپ کو مشورہ دیا کہ بہتر یہ ہے کہ وہ اپنی اور خاندان کی سلامتی کی خاطر خود کو ان کے حوالے کردے' کیونکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے کہ وہ تن تنہا ان کا مقابلہ کرے یا جیساکہ ہم ایشیائی لوگوں کا کہنا ہے کہ اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے سے کیا فائدہ۔ بوڑھے آدمی نے میری بات کو غور سے سنا' پھر مجھ سے بغل گیر ہوا اور آنسو بھری آنکھوں سے میرے ماتھے کو چوما' لیکن میرا خیال ہے کہ اسے اپنی زندگی بہت زیادہ عزیز تھی اور وہ آسانی سے خود کو ان کے حوالے کرنے پر تیار نہ تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اگر افسر گائے کی دم پر پانی بہا کر قسم کھائے کہ اس کا مقصد مجھے نقصان پہنچانا نہیں ہے' تو وہ خود کو اس کے حوالے کردے گا' ورنہ وہ گھر کی چھت توڑ کر بھاگ جائے گا۔ جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے' تو ہمیں جان بچانے کے لئے خود کوئی ترکیب سوچنی ہوگی۔ اس کے اس بزدلانہ رویہ کو دیکھ کر مجھے صدمہ ہوا' اور مجھے فارسی کے کچھ اسباق یاد آگئے کہ کبھی کبھی مصیبت کے وقت شیر بھی گیدڑ بن جاتا ہے اور گیدڑ شیر۔ درحقیقت جب میں نے اپنے سوتیلے باپ کو مسلح دیکھا تو تو مجھ پر یہ اثر ہوا تھا کہ میں اسے ایک بہادر اور نڈر آدمی سمجھنے لگا تھا لیکن جب امتحان کا وقت آیا تو وہ گیدڑ سے بھی زیادہ بزدل نکلا۔

بہرحال میں اس کے پیغام کو لے کر باہر افسر کے پاس آیا اور اس کو بتایا کہ صوبیدار مسلح ہے اور اس نے اپنی بندوق کو بھر لیا ہے اور اگر اس حملہ کیا گیا یا زنان خانہ میں جانے کی کوشش کی تو وہ اپنا دفاع کرے گا۔ میں نے بھی کہا کہ وہ آخر وقت تک لڑنے کے لئے تیار ہے۔ اس کا ارادہ ہے کہ اپنی عورتوں کو مار ڈالے اور خود فرار ہو جائے لہٰذا اب تم خود اندازہ لگا سکتے ہو کہ اس کے نتیجہ میں کئی لوگ مارے جائیں گے' اور میں نہیں کہہ سکتا کہ خون ناحق اور قتل کا ذمہ دار کون ہوگا؟ اور پھر یہ تمہارے خود کے لئے بھی خطرناک ہے۔ کون جانتا ہے کہ صوبیدار کی بندوق کا شکار کون کون ہوگا۔ لیکن صرف ایک ایسا راستہ ہے کہ جو مسئلہ کا حل ہو سکتا ہے اور وہ یہ راستہ یہ ہے کہ تم گائے کی دم پر ہاتھ رکھ کر عہد کرو کہ تم کوئی دھوکہ بازی نہیں کرو گے کہ جس سے صوبیدار کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔ اگر اسے اس بات کا یقین ہو جائے گا تو پھر وہ باہر آکر خود کو تمہارے حوالے کردے گا۔ اس طرح میں نے اس کے اس بزدلانہ پیغام کو اپنی طرف سے بڑھا چڑھا کر اس افسر تک پہنچا دیا۔

میری اس بات کو افسر نے فوراً تسلیم کرلیا اور فوراً ہی ایک برہمن اور گائے لائی گئی۔

برہمن نے گائے کی دم افسر کے ہاتھ میں دے کر اس پر پانی انڈیلا اور سنسکرت میں کچھ دعا پڑھی جس کے تقدس کی وجہ سے غریب افسر ڈر اور خوف سے کانپنے لگا۔ صوبیدار جو یہ ساری کارروائی دروازہ میں چابی کے سوراخ سے دیکھ رہا تھا' یہ دیکھ کر مطمئن ہوا اور باہر نکل کر خود کو ان کے حوالے کردیا۔ افسر نے اس کے سامنے فرمان پڑھا اور اس سے درخواست کی کہ وہ اپنا اسلحہ اس کے حوالے کردے۔ اسلحہ دیتے ہوئے وہ تھوڑا بہت جھجکا' مگر پھر خود کو اپنی تقدیر کے حوالے کردیا۔ شام کو اس نے افسر کو خفیہ طور پر سو روپیہ کی تھیلی بطور رشوت دی۔ جس کی وجہ سے اس کا رویہ اچانک بدل گیا اور وہ ان روپوں کی وجہ سے ہمارا غلام بن گیا۔ ویسے تو حقیقت میں ہم اس کے قیدی تھے' مگر ان روپوں نے اسے ہمارا قیدی بنا دیا۔

دو مہینے تک یہی صورتحال رہی۔ غریب افسر دن بھر زنان خانہ کے دروازے پر بیٹھا رہتا تھا۔ رات کو صوبیدار کے بستر کی نگرانی دو آدمی کرتے تھے۔ اگر وہ چہل قدمی بھی کرتا تو اس کے ساتھ ساتھ سایہ کی طرح سپاہی ہوتے تھے۔ جہاں تک میرا تعلق تھا تو میں آزاد تھا' مجھے اجازت تھی کہ میں جب چاہوں گھر میں جاؤں اور باہر آؤں۔ آخرکار گوالیار سے احکامات آئے کہ ہمیں چھوڑ دیا جائے۔ اس کے بعد میرے سوتیلے باپ کو دربار میں خلعت دیا گیا۔ اس کی اذیتوں کے ازالہ کے لئے مراہٹی زبان میں ایک لمبی چوڑی تقریر کی گئی جس کی وجہ سے اس بوڑھے اور ذہن کے کمزور شخص کو کچھ تسلی ہوئی۔ اس نے اس تمام کارروائی کو خاموشی سے سنا اور آخر میں اس کا سامان جو لوٹا گیا تھا اس کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ اس پر اس سے کہا گیا کہ اس پر کوئی عمل درآمد نہیں ہو سکتا ہے کیونکہ احکامات میں سامان کے بارے میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ حکومت کے عہدیدار نے اس سے مزید کہا کہ " اگر اس میں سامان کا ذکر ہوتا تو مجھے یہ لوٹاتے ہوئے خوش ہوتی' بلکہ کوشش ہوتی کہ میں اپنی طرف سے اس میں اور شامل کرکے حوالے کروں۔"

تیسرا باب

میرا سوتیلا باپ اپنی قید کے بعد، اپنی قسمت پر بڑا مطمئن نظر آتا تھا، وہ اپنی مشکلات کا ذمہ دار کچھ تو اپنی تقدیر کو ٹھہراتا تھا اور کچھ اس بدقسمت دن کو کہ جس دن اس نے اپنا سرمنڈایا تھا۔

یہاں میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ان چند توہمات کا ذکر کرتا چلوں کہ جو ہندوستان کے تمام لوگوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ اگرچہ ہمارے رسولؐ نے ہر قسم کے توہمات کو رد کر دیا تھا۔ چاہے ان کا تعلق علم نجوم سے ہو، یا ایام جاہلیہ سے، مگر اس کے باوجود مسلمان جھوٹے مذاہب کی باتوں پر عمل کرتے ہیں۔ او رہر قسم کے کام کی ابتداء کرنے سے پہلے علم نجوم کے ذریعہ شگون لیتے ہیں۔ چاہے یہ شادی ہو، سفر پر جانا ہو، بچہ کی پیدائش ہو، گھر کی تعمیر ہو، فصد کا کھلوانا ہو، یا سرمنڈانا ہو۔ ہر عمل کے لئے دن اور وقت کا تعین کیا جاتا ہے۔ چاند کے ہر مہینے میں چھ دن منحوس خیال کئے جاتے ہیں۔ یہ چھ دن 3، 8، 13، 18، 23 اور 28 تاریخوں کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح سات ستاروں کی حرکت کو دیکھتے ہوئے دن اور وقت کا تعین کیا جاتا ہے۔

ہندو اور مسلمان دونوں اس کو مانتے ہیں کہ آٹھ روحیں پوری دنیا کے گرد ہر سمت میں موجود ہیں۔ لہٰذا کسی بھی سفر یا مہم سے پہلے یہ دیکھ لینا چاہیئے کہ کونسی روح کس سمت میں ہے۔ کیونکہ غلط فیصلے کے نتیجہ میں ناکامی ہوگی۔ مسلمانوں میں یہ روحیں "رجال الغائب" کہلاتی ہیں۔ جبکہ ہندو انہیں "جوگنی" کہتے ہیں۔

ہندوستان کے لوگوں میں ہر چیز سے شگون لینے کی بھی عادت ہے۔ مثلاً اگر کسی کے سامنے سے بلی راستہ کاٹ جائے تو وہ وہیں رک جائے گا اور اس وقت آگے نہیں جائے گا۔ اسی طرح سے اگر اس کو سامنے سے چھینک کی آواز آئے گی تو وہ اس سمت میں نہیں جائے گا، لیکن اگر وہ اپنے دائیں جانب چھینک مارے گا تو اس کے لئے نیک شگون ہوگا۔ پرندوں کی پرواز، ہرنوں کو دیکھنا اور اس قسم کی بہت سی چیزوں اور اشاروں سے شگون لیا جاتا ہے۔

میں نہیں چاہتا کہ اپنے قارئین کا زیادہ وقت اس بکواس میں صرف کروں' لہٰذا اب میں دوبارہ سے اپنے سوتیلے باپ کی طرف آتا ہوں۔ اس باب کے ابتداء میں' میں نے اسے مطمئن حالت میں چھوڑا تھا۔ اس مرحلہ پر اس نے مناسب یہ سمجھا کہ وہ گوالیار جائے اور وہاں مہاراجہ دولت راؤ سندھیا کی خدمت میں اپنی درخواست پیش کرے۔ اس مقصد کے لئے اس نے کچھ گھوڑے و اونٹ خریدے اور انہیں اپنے سالے (پہلی بیوی کا بھائی) کے چارج میں چھوڑے۔ ساتھ ہی میں اسے چند بے ہودہ سی ہدایات بھی دیں کہ جن کا ذکر میں وقت آنے پر کروں گا۔

سفر کے لئے اچھے شگون والے دن کو مقرر کیا گیا۔ ہم سندھیا کے خاندان کے ایک امیر کے ساتھ سفر پر روانہ ہوئے' جو اجین میں اپنے خاندان کے لوگوں سے ملنے کے بعد دربار میں واپس جارہا تھا۔ چونکہ میرا باپ کا کردار موقع پرستوں والا تھا اس لئے وہ بہت جلد اس کا وفادار ہوگیا۔ اور سفر کے دوران میں اس سے دوستی کرلی۔ ہم صبح سفر پر روانہ ہوئے ہمارا دستور تھا کہ دن بھر چلنے کے بعد چار بجے قیام کرتے تھے۔ اس وقت تک میں نوجوان پیر سے سپاہی میں تبدیل ہو چکا تھا۔ میں ایک خوبصورت گھوڑی پر سوار تھا اور تلوار' ڈھال اور چھوٹے نیزے سے پوری طرح سے مسلح تھا۔ یہ تمام اسلحہ میرے سائز کا تھا سوائے گھوڑی کے کہ جو میرے سائز کے مقابلہ میں بڑی تھی۔ میں نے اس کا نام "برق" رکھا تھا۔ جب میں اس پر سوار ہوتا تو وہ کسی بھیڑ کی طرح خاموش اور پرسکون ہوتی تھی۔ لیکن اگر میں ذرا بھی باگ کو جھٹکا دیتا' یا غلطی سے اپنے ہاتھ اونچے کرلیتا' تو وہ اس قدر تیز دوڑتی جیسے کہ بجلی۔ فطرتاً" وہ اس قدر نیک اور وفادار تھی کہ اگر کبھی میں گر جاتا تو وہ میرے پاس کھڑے ہوکر انتظار کرتی کہ دوبارہ اس پر سوار ہوں۔

ایک مہینہ کے اندر اندر ہم گوالیار سندھیا کے کیمپ پہنچ گئے۔ درحقیقت اس کو کیمپ کہنا زیادتی ہے کیونکہ وہ باقاعدہ سے شہر تھا' کہ جس میں سرخ پتھر و گارے اور چونے کے بنے ہوئے مکانات تھے اور مہاراجہ کا محل شہر کے بیچ میں تھا۔ اس کی آبادی اس وقت تقریباً تین لاکھ ہوگی' جس میں مسلح سپاہی اس آبادی کا تیسرا حصہ ہوں گے۔ یہاں دو سو ہاتھی اور تین سو توپیں ہر وقت تیار رہتی تھیں۔ ہم نے مہاراجہ کے ایک عہدیدار کی ہدایت پر اپنا خیمہ ایک اچھی جگہ پر لگایا اور دو مہینے تک یہاں بغیر کسی اہم عہدے دار کے رابطہ میں آئے بغیر رہتے رہے۔ اس عرصہ میں میرا سوتیلا باپ کوشش کرتا رہا کہ وہ اہم اور بااثر لوگوں سے قریبی تعلقات قائم کرے۔ آخرکار ایک ہزار روپیہ تقسیم کرنے کے بعد وہ

اس میں کامیاب ہو گیا کہ اس کا دربار سے بلاوہ آگیا۔

مقررہ دن پر ہم حاضری دینے روانہ ہوئے۔ مہاراجہ ہمیں دیکھ کر اپنی گدی سے اٹھے اور بڑی شائستگی سے اپنا ہاتھ ہماری طرف بڑھایا' ہم نے جھک کر عقیدت سے ہاتھ کو چوما۔ مہاراجہ کی گفتگو اس قدر پر اثر' دلکش اور خوبصورت تھی کہ میرا سوتیلا باپ اس کو سن کر مبہوت ہو گیا اور اپنی ساری شکایات بھول گیا' لیکن صاف صاف کہنے کے بجائے اس نے اپنے سامان کے بارے میں اشارے ضرور کردیئے۔ مہاراجہ نے بہانہ یہ کیا کہ جیسے اسے اس کے بارے میں کوئی علم ہی نہیں ہے۔ پھر میرے باپ کو خوش کرنے کے لئے اس نے حکم دیا کہ اس کے تمام بقایا جات مہینہ کے آخر تک ادا کر دیئے جائیں اور وہ خود کو بوڑھی ملکہ کے مرنے کے بعد سے مہاراجہ کا ملازم تصور کرے اور یہ کہ مہاراجہ نے اسے اپنے پسندیدہ درباریوں میں منتخب کرلیا ہے۔ ان جملوں نے بوڑھے شخص کو فخرو غرور کے جذبات سے بھر دیا اور اس کا منہ مزید شکایتوں سے بند ہو گیا اور سوائے شکریہ کے الفاظ کے وہ اور کوئی لفظ ادا نہیں کرسکا۔ شکریہ کے طور پر وہ مسلسل سلام کرتا رہا اور جھکتا رہا۔ اسی دوران ایک عہدیدار کے اشارہ پر عطر' پان' گلاب کا پانی اور خلعت ہمارے لئے لایا گیا۔ جب ہم رخصت ہو رہے تھے تو مہاراجہ نے مسکراتے ہوئے میری طرف اشارہ کرکے پوچھا کہ میں کون ہوں؟

"یہ میرا لڑکا ہے" بوڑھے آدمی نے جواب میں کہا۔ اس پر مہاراجہ نے کہا "یہ خود اپنے بارے میں بتائے تو بہتر ہے۔"

یہ سن کر میں نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا: "صوبیدار نے جو کچھ کہا ہے اس پر جناب عالی یقین فرمائیں' کیونکہ والدین کو اس کا حق ہوتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کے بارے میں بولیں۔
"

میرا جواب اگرچہ سادہ سا تھا' مگر اس سے مہاراجہ کو انتہائی خوشی ہوئی' اور اسی خوشی کے عالم میں اس نے مجھ سے دوسرا سوال کر ڈالا۔ تمہاری اپنی پیدائش کے بارے میں کیا رائے ہے؟

میں نے جواب میں کہا "جناب عالی میں ابھی نوعمر ہوں' اور اس قابل نہیں ہوں کہ اس جیسے اہم موضوع پر اپنی رائے دے سکوں۔"

اس کے بعد مہاراجہ نے میرے سوتیلے باپ سے پوچھا کہ کیا میں لکھ پڑھ سکتا ہوں' اس کے جواب میں اس نے میری ذہانت و لیاقت کی خوب تعریف کی۔ اس پر مہاراجہ نے

محبت کا اظہار کرتے ہوئے میری خلعت میں حافظ اور سعدی کی کتابیں اضافہ کروائیں جو اب تک بطور یادگار میرے پاس ہیں۔

اس کے بعد ہم گوالیار میں آباد ہوگئے کہ جہاں ہمارا وقت بہت اچھا گزرا۔ بوڑھے صوبیدار کے ملازمت کے فرائض بہت کم تھے۔ اسے مہینہ میں تین مرتبہ مہاراجہ کے ساتھ شکار پر جانا ہوتا تھا' اور صرف تین گھنٹہ مسلح ہوکر بطور محافظ کے مہاراجہ کی خوابگاہ پر پہرہ دینا ہوتا تھا۔ یہ ذمہ داری صرف قابل اعتماد اور اور شریف لوگوں کو دی جاتی تھی' اور انہیں "یکہ" کہا جاتا تھا یعنی تنہا آدمی ایک گھوڑے کے ساتھ۔ اسے اپنے عہدے کے مطابق روزانہ نقد ملا کرتا تھا۔ کم سے کم تنخواہ پانچ روپیہ اور زیادہ سے زیادہ تیس روپیہ روزانہ تھی۔ اسکے علاوہ حکومت کی جانب سے کھانا فراہم کیا جاتا تھا' اور سال میں دو مرتبہ قیمتی لباس۔ یکوں کی تعداد ایک سو ستائیس سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ میرے سوتیلے باپ کی تنخواہ سب سے کم' یعنی پانچ روپیہ روز تھی۔ مگر یہ عہدہ قابل عزت تھا اس لئے وہ نہ صرف یہ کہ خوش تھا' بلکہ اسے فخر تھا کہ وہ اس پر فائز ہے۔

اجین سے ہماری غیرحاضری کے دوران گھر سے کئی خطوط آئے۔ ایک خط میں اطلاع دی گئی کہ ہمارے ہاں لڑکا ہوا ہے۔ اس خبر کو سن کر بوڑھے شخص کو بے انتہا خوشی ہوئی اور اس نے کیمپ کے تمام امراء کو ایک شاندار دعوت دی کہ جس پر اس کے دو ہزار روپے خرچ ہوئے لیکن وہ تحفے جو اسے مبارکباد کے طور پر دے گئے ان کی قیمت ان سے اخراجات سے زیادہ تھی' یعنی تین ہزار روپیہ۔ اس کے بعد سے اس کا رویہ میری جانب بدل گیا اور اس نے بات بات پر مجھے جھڑکنا اور لعنت ملامت کرنی شروع کردی' وہ میرے لئے اس قدر گندی زبان استعمال کرنے لگا کہ میرے لئے اس کو برداشت کرنا مشکل ہوگیا۔ اب وہ اپنا وقت ان دوستوں کے درمیان اور ایک نئے دوست کی بیوی کے ساتھ گزارنے لگا۔ اس نے خود اپنی ڈیوٹی پر بھی جانا چھوڑ دیا اور اپنی جگہ مجھے بھیجنے لگا۔ جب میں گھر پر ہوتا تو اس کے دوسرے ملازموں کی طرح مجھے بھی رات کو تین گھنٹہ بطور سنتری فرائض انجام دینے ہوتے۔ اس برے سلوک کی وجہ سے میں اداس رہنے لگا۔ اس لئے میں نے مناسب یہ سمجھا کہ ان تمام حالات سے اپنی ماں کو آگاہ کردوں' اسے میں نے یہ بھی لکھا کہ میں سوچ رہا ہوں کہ یہاں سے بھاگ جاؤں' اور اگر میں بھاگ نہ سکا تو پھر میرے لئے سوائے خودکشی کے اور کوئی راستہ نہیں رہے گا۔ بدقسمتی سے مراہٹہ کیمپ کے پوسٹ ماسٹر کی وجہ سے میرا یہ خط پکڑا گیا۔ ہوا یہ کہ بوڑھے شخص نے پوسٹ آفس سے اپنے ایک

بل کے سلسلہ میں معلومات کیں' اس پر پوسٹ ماسٹر نے جواب دیا کہ اس کے بل کے سلسلہ میں اب تک کوئی خط نہیں آیا ہے' اور اس نے دو دن پہلے اسے جو خط بھیجا ہے اسے وہ فوراً آگے روانہ کرنے والا ہے اور امید کرتا ہے کہ اس کے جواب میں اسے اچھی خبر ملے گی۔ "مگر میں نے تو کوئی خط نہیں بھیجا ہے۔" صوبیدار نے کہا "یہ کسی اور کا ہوگا۔" اس پر میرا خط لایا گیا' اسے کھولا اور پڑھا گیا۔ یہ خط سن کر میرا سوتیلا باپ غصے سے کانپتا ہوا واپس آیا۔

جیسے ہی وہ اپنی پالکی سے اترا' اس نے مجھے آواز دے کر بلایا۔ جب میں اس کے سامنے گیا' تو اس نے حقارت کے ساتھ کھڑے ہوکر' مذاق کے طور پر میرا استقبال کیا۔ اس وقت تک مجھے بالکل اندازہ نہ تھا کہ کیا ہوا ہے' اس لئے اس کے اس رویہ سے میں پریشان ہوکر اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہوکر بڑے استہزائیہ انداز میں کہا "میرے دوست' تمہارے لئے ایک خط ہے' مہربانی کرکے ذرا اسے پڑھو تو سہی۔" میں نے اس کے ہاتھ سے خط لیا' اور اسے دیکھ کر مجھے معلوم ہوگیا کہ یہ میرا ہی خط ہے۔ لہٰذا اس کے حکم پر عمل کرتے ہوئے میں نے اسے کھولا اور اس پر ایک نظر ڈالی۔ اگرچہ میں اپنی موت کے یقینی ہونے پر ڈر اور خوف سے زرد پڑ گیا تھا' لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ میرے لئے اس صورتحال سے بچنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ مجھ میں اچانک ہمت آگئی اور مجھے فارسی کی ایک ضرب المثل یاد آگئی کہ "بہادری کے ساتھ لڑنا بزدلی کی زندگی سے بہتر ہے۔" لہٰذا میں نے اسے بتایا کہ ہاں یہ میرا ہی خط ہے اور میں نے اسے پوسٹ ماسٹر کو دیا تھا کہ وہ اسے میری ماں کو بھجوائے' کسی کو اس بات کی اجازت نہیں تھی کہ وہ اسے کھولے اور اس کے متن سے واقفیت حاصل کرے۔"

میرے اس جواب نے اس کے غصہ کو اور بھڑکا دیا۔ "بدمعاش! تم نے ایک ناقابل تلافی جرم کیا ہے' اور ساتھ ہی میں تم انتہائی بے شرم بھی ہو۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور مجھے دو تین زور دار مکے رسید کئے۔ اس سے بھی اس کا دل نہ بھرا تو اس نے مجھے گرا کر کئی لاتیں ماریں۔ یہاں تک کہ وہ تھک گیا۔ میں ان چوٹوں سے بے ہوش ہوگیا' اس لئے مجھے بعد کی مارپیٹ کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ جب مجھے ہوش آیا میں اصطبل میں اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا' اور سائس خوشحال میرے پاس کھڑا تھا۔ میں نے پینے کو پانی مانگا' اس شریف آدمی نے فوراً گلاب کے عرق کا شربت مجھے پینے کو دیا۔ میں اس شربت کو بہت کم پی سکا کیونکہ چوٹوں سے میرا پورا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ میں دو دن

اور دو رات گہری نیند میں غرق رہا۔ یہاں تک کہ مجھے زبردستی اٹھایا گیا۔ میں نے بمشکل اپنے جسم کو حرکت دی اور ساتھ ہی عہد کیا کہ اس جھنی قصائی کا چہرہ کبھی دوبارہ نہیں دیکھوں گا۔ اس نے بعد میں اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے میرے لئے مٹھائی اور دوسری کھانے و پینے کی اشیاء بھیجیں، مگر میں نے ان کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ اور یہ سب سائس کے حوالے کردیں۔ اس عرصہ میں، میں نے ملازموں سے سادی روٹی لے کر کھائی، اور ٹھنڈے پانی پر گزارا کیا۔ اس طرح سے پندرہ دن گزرے گئے مگر سخت تکلیف کی وجہ سے میرا جسم ابھی تک سن تھا۔ مسلسل سوچنے کی وجہ سے میرے دماغ میں ہزاروں قسم کے منصوبے آرہے تھے۔

اس دوران سنتری کے فرائض ادا کرنے کے لئے اس کی باری آگئی اور اس بدمعاش نے کہ جسے اپنے کئے پر کوئی افسوس نہ تھا، اپنے ملازم سے کہلوایا کہ اس کے بدلہ میں یہ ڈیوٹی ادا کروں۔ میں نے جواب میں کہلوا دیا کہ میں اس قابل نہیں کہ یہ فرض ادا کرسکوں۔ جب اس کو یہ جواب ملا تو وہ خود مسلح ہوکر ڈیوٹی دینے چلا گیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے چند روٹیاں لیں، حافظ و سعدی کی کتاب جو مہاراجہ نے دی تھی اس کو سنبھالا، اور اپنی چھوٹی تلوار لے کر آگرہ کی راہ لی۔

کیمپ کو چھوڑنے کے بعد میں نے گوہاد جانے کے راستے کو اختیار کیا۔ جو کہ گوالیار سے پچیس میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس خیال سے کہ میرا پیچھا نہیں کیا جائے میں نے شاہراہ کی بجائے جنگلوں کا راستہ اختیار کیا۔ میں اس قدر تیز چلا کہ جتنا میری ٹانگیں میرا ساتھ دے سکتی تھیں۔ سفر کے دوران اتفاق ایسا ہوا کہ میرا کسی اور سے واسطہ نہیں پڑا۔ سوائے چرواہوں کے جو درخت کے سائے میں بیٹھے اپنے مویشیوں کو چرتا ہوا دیکھ رہے تھے اور ساتھ میں ان کے وفادار کتے تھے۔ دوپہر کو میں نے ایک سایہ دار نیم کے درخت جو دریا کے کنارے تھا وہاں آرام کیا۔ میں نے وضو کرکے چادر بچھائی اور اس پر اپنا قرآن شریف، کتابیں اور روٹی رکھی۔ ایک چرواہا جو قریبی درخت کے نیچے بیٹھا ہوا دیکھ رہا تھا، وہ معہ اپنے کتے کے وہاں سے اٹھا اور مجھ سے تھوڑی دور کے فاصلہ پر اپنے ڈنڈے کے سہارا کھڑا ہوکر تجسس کے ساتھ مجھے گھورنے لگا۔ اس کا کتا بھی اسی کی طرح مجھے دیکھ رہا تھا اور ساتھ ہی میں اپنی دم ہلا رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ روٹی کی خوشبو کی وجہ سے اس کی بھوک بڑھ گئی ہوگی اور وہ میرے ساتھ اس روٹی میں سے اپنا حصہ بٹانا چاہتا ہوگا۔ اس وقت مجھے شدید بھوک لگی ہوئی تھی، مگر پھر بھی میں نے روٹی کا ایک ٹکڑا کتے کو دیا اور باقی خود کھانا

شروع کردیا۔ یہ دیکھ کر نیک دل چرواہے نے مجھ سے کہا کہ اگر وہ مجھے روٹی کھانے کے لئے دودھ دے تو کیا مجھے اعتراض تو نہ ہوگا؟ میں نے جواب دیا کہ بالکل نہیں' بلکہ اگر وہ مجھے تھوڑا سا دودھ دے دے تو مجھے خوشی ہوگی۔ اور میں اس کی فیاضی کا دل و جان سے شکریہ ادا کروں گا کہ جو اس نے ایک اجنبی اور غیرذات کے شخص کے ساتھ کی۔ وہ سخی چرواہا فوراً دودھ کا برتن لے آیا' لیکن اب یہاں جو ایک مسئلہ آیا وہ یہ کہ دودھ کو کیسے لیا جائے۔ چرواہا چونکہ ہندو تھا' اس لئے وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ میں اس کے برتن کو ہاتھ لگاؤں' لہٰذا اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے میں نے درخت کے پتوں سے ایک دونا بنایا اور اس میں تازہ دودھ لے کر پیا۔ مجھے یاد ہے کہ اس سے زیادہ ذائقہ والا اور مزیدار دودھ میں نے اب تک کبھی نہیں پیا تھا' اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس کے بعد بھی ایسا دودھ میں نے پھر کبھی نہیں پیا۔

اس کے بعد چرواہا اور اس کا کتا چلے گئے' دونوں اپنی جگہ مطمئن تھے' چرواہا اس لئے کہ اس نے ایک اجنبی کی مدد کی' اور کتا اس لئے کہ اسے ایک اجنبی سے کھانے کو روٹی ملی۔ جب سورج ڈھلنا شروع ہوا' تو میں نے ظہر کی نماز پڑھی اور گوہاد کی طرف اپنا سفر شروع کردیا کہ جس کا راستہ میں نے نیک دل چرواہے سے معلوم کرلیا تھا۔

چار بجے تک میں چلتا رہا' اس کے بعد میں نے سخت تھکن محسوس کی اور آرام کرنے کی غرض سے ایسی تنہائی کی جگہ ڈھونڈنا شروع کی جہاں کوئی خطرہ نہ ہو۔ میں کسی گاؤں میں جانا نہیں چاہتا تھا' کیونکہ مجھے خوف تھا کہ کہیں میں پکڑا نہ جاؤں۔ میں اسی تلاش میں تھا کہ گاؤں کے قریب مجھے کنواں نظر آیا۔ میں اس کے قریب اس غرض سے گیا کہ پانی بھی پی لوں گا اور اس کے قریب ہی آرام کی کوئی جگہ بھی ڈھونڈ لوں گا۔ جب میں کنویں کے قریب گیا تو دیکھا کہ ایک راجپوت دوشیزہ کنویں سے پانی نکالنے میں مصروف ہے' میں نے اس سے درخواست کی کہ پیاس بجھانے کے لئے تھوڑا سا پانی مجھے دے دے۔ اس کے جواب میں اس نے انداز دلربائی سے مجھ سے الٹا یہ سوال کر ڈالا کہ "کیا میرے علاوہ تمہیں اور کوئی نہیں ملا کہ جو تمہاری پیاس کو بجھائے؟"

میں نے جواب میں کہا کہ "خاتون! مجھے اور کوئی نہیں ملا' لیکن اگر کوئی مل بھی جاتا تو تمہارے مقابلہ میں میرے نزدیک اس کی ایسی حیثیت ہوتی جیسی کہ سورج کی روشنی کے مقابلہ میں لیمپ کی۔" میرے ان خوشامدانہ جملوں سے اس کے خوبصورت چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آئی اور اس نے اپنے برتن سے میرے ہاتھوں پر پانی انڈیلتے ہوئے کہا کہ

"اس وقت تک پیو کہ جب تک تمہاری پیاس نہ بجھ جائے۔" میں اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے کپ میں پانی پیتا رہا اور اس کے دلکش اور خوشبو بھرے ہاتھوں کو دیکھتا رہا۔ جب میں پیٹ بھر کے پانی پی چکا تو میں نے جھک کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے پانی کے برتن اٹھائے اور اپنے گھر روانہ ہوگئی۔

اسی دوران میں' ایک صحت مند مسلمان' جس کی عمر تقریباً چالیس سال ہوگی' میری طرف آیا۔ وہ شکل و صورت سے میری طرح مسافر معلوم ہوتا تھا کیونکہ اس کا لباس گردوغبار سے اٹا ہوا تھا۔ اس نے بڑے مہذب طریقے سے مجھے سلام کیا اور پوچھا کہ میں کہاں سے آرہا ہوں؟ اور کہاں جانے کا قصد ہے؟ میں نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اسے بتایا کہ میں ایک مسافر ہوں' اور کام کی غرض سے گوہاد جا رہا ہوں۔ یہ سن کہ وہ کہنے لگا کہ وہ بھی اسی طرف جارہا ہے' لیکن اس نے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ شاید ہم سورج غروب ہوتے ہوتے وہاں پہنچیں' کیونکہ یہ تقریباً چار میل کا فاصلہ ہے۔

مجھے اس آدمی کی شکل و صورت کچھ زیادہ اچھی نہیں لگی۔ اس کی خالی خالی احمقانہ سی نظریں اوربلاوجہ دخل دینے کے انداز نے اسے ناپسندیدہ شخص بنا دیا' لیکن اس شخص نے سفر کے دوران جلد ہی مجھ سے دوستی کرلی' اور اپنی باتوں کے ذریعے میرے شک و شبہات ختم کردیے۔ ہم دو میل کے قریب چلے ہوں گے کہ سورج سر پر آپہنچا۔ اس وقت تک ہم ایک دریا کے قریب جا پہنچے تھے کہ جس کے کنارے پر ایک مسجد کھڑی تھی' مگر ویرانی سے اندازہ ہوتا تھا کہ قرب و جوار میں کوئی آبادی نہیں ہے۔ میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ میں بہت زیادہ تھک چکا ہوں اور اس قابل نہیں ہوں کہ زیادہ چل سکوں' اس لئے میرا ارادہ ہے کہ میں رات اسی مسجد میں گزاروں۔ میں نے اس سے یہ بھی کہا کہ اگر اس کی مرضی ہو تو وہ سفر جاری رکھے اور اگلے دن انشاء اللہ میں اس سے گوہاد میں ملاقات کر لوں گا۔

اس پر اس نے کہا کہ یہ جگہ ڈاکوؤں اور جنگلی جانوروں کا ٹھکانہ ہے' اس لئے یہاں ٹھہرنے سے بہتر ہے کہ ہم اپنا سفر جاری رکھیں۔ میں نے جواب میں کہا کہ مجھے ڈاکوؤں کی اس لئے کوئی فکر نہیں کہ میرے پاس کوئی قیمتی چیز نہیں ہے' رہے جنگلی جانور تو میں مسجد کے دروازے پر آگ جلائے رکھوں گا تاکہ وہ داخل نہ ہو سکیں۔

میرے ساتھی نے میری ان باتوں کو بڑے غور سے سنا اور پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں میرے پورے جسم کی تلاشی لی اور پھر کہنے لگا "جیسی آپ کی مرضی۔" اس کے بعد میں نے

وضو اور غسل کرنے کی خاطر کپڑے اتارے اور جمعہ سے (یہ اس کا نام تھا) کہا کہ ذرا وہ میری روٹی کا خیال رکھے کہ اسے کوئی کتا نہ لے جائے۔ اس دوران میں' میں دریا سے نہا کر آتا ہوں۔ میرے جانے کے بعد' میرا خیال ہے کہ اس نے میرے سامان کی تلاشی لی ہوگی' اور میرا اندازہ تھا کہ جب اسے کوئی قیمتی چیز نہیں ملی تو وہ مایوس سا ہوگیا۔ جبکہ میں نہانے میں مصروف تھا' وہ خاموشی سے بیٹھا میرا جائزہ لے رہا تھا کہ میں نے کوئی زیور وغیرہ تو نہیں پہن رکھا۔ یہ دیکھ کر بھی اسے مایوسی ہوئی۔ نہانے کے بعد میں نے مغرب کی نماز پڑھی' جبکہ جمعہ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔ کبھی کبھی اس کے چہرے پر مسکراہٹ آجاتی تھی' جس سے مجھے تھوڑی بہت تشویش ہو جاتی تھی۔

جب رات ہوئی تو ہم مسجد میں چلے گئے۔ میں نے اور جمعہ نے مل کر لکڑیاں اکٹھی کیں اور مسجد کے دروازے پر آگ جلا دی تاکہ جنگلی جانور نہ آسکیں۔ اس کے بعد ہم دونوں نے مل کر اپنے حصہ کی روٹی نکالی اور شام کا کھانا کھایا۔ جمعہ نے اپنے حصے کی روٹی میں سے مجھے کچھ دینا چاہا مگر میں نے اسے لینے سے انکار کردیا' اور اس سے کہا کہ اگر اسے بھوک لگی ہو تو وہ میری روٹی میں سے کچھ لے لے۔

اگرچہ میں بہت زیادہ تھک گیا تھا اور نیند سے میری آنکھیں بند ہونے لگی تھیں' لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس نے میری جان بچا لی کیونکہ جمعہ نے مجھ سے گفتگو شروع کردی اور کہنے لگا کہ اس نے میرے بارے میں اندازہ لگا لیا ہے کہ میں کرایہ کے فوجی کی طرح ہوں کہ جو ملازمت کی تلاش میں آوارہ پھر رہا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس کی حالت بھی میری طرح کی ہی ہے کہ جس کا کوئی دوست اور جاننے والا نہیں۔ اس کے بعد وہ کہنے لگا کہ اگر میں قرآن شریف کے نام پر قسم کھاؤں کہ میں اس کا راز کبھی بھی فاش نہیں کروں گا تو وہ مجھے اپنا شاگرد بنانے پر تیار ہے۔ اس کے کہنے کے مطابق اس کا پیشہ اتنا شاندار ہے کہ وہ لمحوں میں آدمی کو مالدار بنا دیتا ہے۔

میں جمعہ کی گفتگو سے بڑا متاثر ہوا اور میں نے بغیر سوچے سمجھے' فوراً قسم کھالی' اگرچہ اس کا بعد میں مجھے افسوس بھی ہوا۔ اس کے بعد جمعہ کہنے لگا کہ ملک بھر میں اس کے سات شاگرد ہیں' جو اس کے وفادار ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اب وہ راز بتاؤ کہ کیا ہے؟ اس نے ایک بار پھر مجھ سے قسم لی کہ میں راز کو اپنے ہی تک رکھوں گا اور کسی سے اس کا ذکر نہیں کروں گا۔ پھر کہنے لگا کہ دراصل میں ٹھگ ہوں اور مسافروں کو قتل کرکے' ان کے مال کو ہتھیا لیتا ہوں۔ اس کے بعد اس نے اپنا تھیلا ہاتھ میں لیا اور اس میں سے

سونے کی اشرفیاں نکال کر میرے سامنے رکھ دیں، جس نے تھوڑی دیر کے لئے میری آنکھوں کو چکاچوند اور میرے ذہن کو ماؤف کردیا۔ یہ سب اشرفیاں 112 تھیں۔ میں نے جب اس کے اعتراف کو سنا تو میں اندر سے لرز کر رہ گیا اور میرے دل میں جمعہ کے لئے انتہائی سخت نفرت کے جذبات پیدا ہوئے، لیکن میں نے مناسب یہی سمجھا کہ اپنے جذبات کو قابو میں رکھوں اور اس پر کچھ ظاہر نہ ہونے دوں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کس طرح آسانی سے لوگوں کو قتل کر دیتا ہے۔

جواب میں وہ کہنے لگا کہ "وہ مجھے تھوڑے ہی عرصے میں قتل کرنے میں ماہر کر دے گا، مگر یہ خیال رہے کہ میں اس کا نام کسی شہر یا گاؤں میں کسی شخص سے بھی نہ لوں۔" اس نے کہا کہ "اس کا نام بڑا مشہور ہے، اس لئے اس کو راز ہی رکھنا۔ اس بات کا خیال رکھو کہ کل تم بھی اسی قدر امیر ہو سکتے ہو جتنا کہ آج میں ہوں، لیکن ایک بات یاد رکھنا کہ تمہیں مال کا چوتھائی حصہ مجھے اور چوتھائی ایک خوبصورت عورت کو دینا ہوگا، جس سے ہم کل گوہاد ملنے والے ہیں۔"

اس کی اس گفتگو کے بعد میں نے خود کو ایک بڑے خطرے میں پایا۔ اسی لئے میں نے تھکن کے باوجود خود کو بیدار رکھا اور نیند کو بھگانے کے لئے یہ کیا کہ بیڑی سلگانے کے بہانے آگ کے پاس گیا اور جان بوجھ کر اپنی انگلی جلا لی تاکہ میں بیدار رہ سکوں۔ اس دوران میں جمعہ میری وفاداری اور اطاعت گزاری سے مطمئن ہو چکا تھا اور مسلسل مجھے اپنی شیطانی ہدایات دینے میں مصروف تھا، اور کہہ رہا تھا کہ کسی کو جان سے مار ڈالنا کوئی مشکل کام نہیں ہے، لیکن مشکل کام یہ ہے کہ کسی کو پھانس کر اور بہلا پھسلا کر اس جگہ تک لایا جائے کہ جہاں پر اس کا کام تمام کرنا ہے۔

"اس سلسلہ میں مختلف طریقوں پر عمل کرتے ہیں" اس نے کہا۔ "مسافروں میں اعتماد پیدا کرنے کی غرض سے کبھی ہم فقیروں کے روپ میں ان کے پاس جاتے ہیں، کبھی ان کے لئے رہنمائی کا کام کرتے ہیں اور کبھی دلال کا کہ جو عورتیں مہیا کرے۔ جس عورت کا میں نے تم سے ذکر کیا ہے، وہ اس آخری مقصد کے لئے ہوتی ہے۔ وہ مسافر کی توجہ فوراً اپنی طرف کر لیتی ہے اور پھر اپنے ناز و نخروں سے اس پر قابو پا کر اسے راستہ سے علیحدہ لے جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ یہ بہانہ کرتی ہے کہ وہ تھک گئی ہے اور ستانا چاہتی ہے، اس لئے وہ کسی درخت کے سائے میں بیٹھ کر ماچس جلا کر بیڑی یا چلم پینے لگتی ہے۔ اسی دوران ہم سے کوئی اس کے پاس پہنچ جاتا ہے، جو مسافر کو بڑا ناگوار گزرتا ہے مگر عورت یہ کہہ کر

اس کی تشفی کرا دیتی ہے کہ یہ میرا شوہر یا بھائی ہے اور یہ آگ لے کر فوراً ہی چلا جائے گا۔ اس کے بعد ہم مل کر بیٹھیں گے اور بات چیت کریں گے۔"

باتوں کے دوران، وہ عورت، یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ حادثاتی طور پر ہوا ہے، اپنے جسم کے کسی حصہ کو اس طرح سے بتاتی ہے کہ مسافر کی ساری توجہ اس طرف ہو جاتی ہے اور اس موقع پر ہم میں سے کوئی رومال کو اس کی گردن میں ڈال کر اس کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی تلاشی لی جاتی ہے اور اسے فوراً ہی دفنا دیا جاتا ہے۔ ہم لوگ علیحدہ علیحدہ ہو کر اپنا سفر جاری رکھتے ہیں اور یہ طے کر لیتے ہیں کہ ہمیں کہاں اور کب ملنا ہے۔

اس سے یہ باتیں سن سن کر میرے کان پک گئے، میری آنکھیں جم کر رہ گئیں اور میری رگوں میں خون زور زور سے گردش کرنے لگا، لیکن میں نے اپنی اندرونی حالت کو اس پر ظاہر نہیں ہونے دیا اور بڑی بے اعتنائی کے ساتھ میں نے اس سے ایک سوال اور کیا "کیا تم کسی کو مارتے وقت ذرا بھی رحم دلی کا مظاہرہ نہیں کرتے ہو۔"

"نہیں" اس نے جواب دیا "ہم اس کے عادی ہو چکے ہیں۔ اسی طرح جیسے ایک قصائی گائے یا بکری کو ذبح کرتے ہوئے ذرا بھی نہیں گھبراتا۔ ابتداء میں ہر شخص کے دل میں رحم دلی کے جذبات ہوتے ہیں، لیکن جب برابر یہ کام کیا جائے تو پھر ہر چیز آسان ہو جاتی ہے۔ ایسے موقع پر ہمیں لوگوں کی خودغرضی، بے رحمی اور ظلم و ستم کے بارے میں سوچنا چاہئے۔ مثلاً اگر ہم بھوک سے مر رہے ہوں تو یہ ہمیں ایک روپیہ بھی دینے پر تیار نہیں ہوں گے اور نہ ہی یہ اس وقت ہم پر رحم کریں گے کہ جب ہم کو سزائے موت دی جا چکی ہوگی، اس لئے ہمیں بھی ان کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہئے۔ اپنے پیشہ کو اختیار کرنے کے ابتدائی دور میں، میں نے ایک مرتبہ اس سے سخت نفرت کی۔"

"ہوا یوں کہ ایک مرتبہ میں نے ایک مولوی کا کوٹہ سے اودے پور کے راستہ میں پیچھا کیا۔ سفر کے پہلے دن مجھے اس کا کوئی موقع نہیں ملا کہ میں اس کا کام تمام کر سکتا۔ شام کو وہ اپنے کچھ دوستوں کے ہاں چلا گیا کہ جہاں میں نہیں جا سکتا تھا۔ دوسرے دن علی الصبح ہم دونوں نے سفر شروع کیا، کبھی وہ مجھ سے آگے ہو جاتا تھا اور کبھی میں۔ کچھ دور چل کر وہ ناشتہ کرنے کے لئے ایک جگہ ٹھہرا اور جب اس نے میری حالت زار دیکھی تو مجھے اپنی روٹی میں سے ایک ٹکڑا کھانے کو دیا۔ میں نے اسے دکھانے کے لئے روٹی کے ٹکڑے کو بڑے شوق سے لیا مگر کھایا اس لئے نہیں کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ جس کا نمک کھاؤں اسے قتل

بھی کروں، کیونکہ یہ نمک حرامی ہوتی۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اودے پور جا رہا ہوں تاکہ وہاں ملازمت تلاش کر سکوں۔" اس پر اس نے جواب دیا کہ "خدا تمہاری کوشش کو کامیاب کرے۔"

ناشتہ کے بعد وہ چلا تو میں اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ جب ظہر کی نماز کا وقت آیا تو اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا یہاں کوئی ایسی جگہ ہے کہ جہاں پانی مل سکتا ہو تاکہ وہ وضو کر لے ورنہ وہ تیمم سے کام چلا لے گا۔ میں نے اس سے کہا کہ یہاں تھوڑی دور کے فاصلے پر ایک چشمہ ہے،'اس نے مجھے راستہ بتانے کو کہا۔ میں نے جواب میں کہا کہ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ چشمہ پر پہنچ کر اس نے وضو کیا اور جب وہ نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہوا اور رکوع کی حالت میں تھا تو اس وقت میں نے، اس کا گلا گھونٹ دیا۔ جب میں نے اس کی تلاش لی تو میری مایوسی کی انتہا نہیں رہی کہ مجھے اس کے پاس سے صرف ایک پیسہ ملا' اس کے علاوہ تسبیح اور چند روٹی کے ٹکڑے تھے۔ میں نے اس کو وہیں پر دفنایا اور واپس اس گاؤں آیا جہاں میں نے اپنی بوڑھی ماں سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔"

میں نے اسے یہ پورا واقعہ سنایا اور کہا کہ میں سوچ رہا ہوں کہ یہ پیشہ چھوڑ دوں کیونکہ اس طرح بے گناہ لوگوں کے خون میں ہاتھ رنگنے سے بہتر ہے کہ میں بھوکوں مر جاؤں۔

اسے میری یہ باتیں پسند نہیں آئیں۔ میرے ہاتھ سے وہ ایک پیسہ لے کر بازار گئی اور وہاں سے آدھ سیر جھینگوں کو لے کر واپس آئی اور میرے سامنے وہ بنڈل رکھ کر مجھ سے کہنے لگی "کیا تم ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کو گن سکتے ہو۔"

میں نے کہا' "ہاں' مگر انہیں گننے کے لئے کافی وقت چاہئے اور پھر اس کا فائدہ کیا؟" اس پر اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "بیوقوف لڑکے' دیکھو ایک پیسے کے لئے کتنی جانیں ضائع ہوئی ہیں اور تم احمق' بزدل اور کمزور دل والے ایک مولوی کے قتل سے پریشان ہو' جس کا کہ ایک پیر پہلے ہی سے قبر میں تھا۔"

اس نے پھر زور دے کر کہا "اگر ایک شیر اپنے شکار پر رحم کرے' تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسے بھوک سے مر جانا چاہئے۔"

"اس عورت کی اس نصیحت نے میرے کھوئے ہوئے اعتماد کو بحال کردیا" جمعہ نے کہا "اور اس کے بعد سے میں نے پھر کبھی اپنے پیشہ سے نفرت نہیں کی۔"

انہی باتوں میں آدھی رات گزر گئی۔ جمعہ مجھ سے کہنے لگا کہ "تمہیں نیند آ رہی ہو گی

لہٰذا تم تین چار گھنٹے کے لئے سو جاؤ' اس وقت تک میں چوکیداری کروں گا' پھر تمہیں اٹھا کر میں سو جاؤں گا۔"

میں نے جواب میں کہا "بھائی' اتفاقاً" میری انگلی جل گئی ہے جس کی وجہ سے مجھے اس قدر تکلیف ہے کہ میں سو نہیں سکتا' لہٰذا پہلے تم سو جاؤ' میں چوکیداری کرتا ہوں۔ جب مجھے نیند آئے گی تو تمہیں اٹھا دوں گا۔"

اس پر وہ ہنسا' میری پیشکش قبول کرتے ہوئے فوراً سو گیا اور اس قدر زور زور سے خراٹے لینے لگا کہ جیسے کوئی جانور غرا رہا ہو۔ میں اس وقت کی اپنی اذیت کو بیان نہیں کرسکتا جو اس کی باتیں سن کر میرے دل پر بیتی۔ میری انگلی کی جو تکلیف تھی' اس سے زیادہ میرے دماغ کو صدمہ تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ جب میں نہانے گیا تو میرے ننگے جسم کو دیکھ کر اسے یقین آگیا کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے اور اس لئے میری جان بچ گئی' ورنہ یہ کبھی کا مجھے گلا گھونٹ کر مار ڈالتا۔ میرا دل تو یہ چاہتا تھا کہ میں اپنی تلوار سے اس خبیث کا گلا کاٹ کر اسے جہنم رسید کر دوں کہ جہاں عذاب دینے والے فرشتے اس کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہوں گے' لیکن میں نے ایسا اس لئے نہیں کیا کہ اس صورت میں' میں قتل کے جرم میں پکڑا جا سکتا تھا کہ جس نے روپیہ کے لالچ میں اسے مار ڈالا۔ میں اس ادھیڑبن میں تھا کہ خدا خدا کرکے رات ختم ہونے پر آئی اور میں نے صبح صبح چڑیوں کی چہچہاہٹ سنی۔ میں خاموشی سے اٹھا' مسجد سے باہر آیا اور وضو کرکے نماز پڑھنے کے بجائے میں نے گوہاد کی طرف تیزی سے بھاگنا شروع کر دیا' اور تقریباً بیس منٹ میں دو میل کا فاصلہ طے کرلیا۔ میں کبھی کبھی پیچھے مڑ کر دیکھ لیتا تھا کہ کہیں جمعہ تو میرا تعاقب نہیں کررہا ہے۔ میں جس وقت شہر پہنچا ہوں تو دروازہ کھلنے ہی والا تھا۔ دروازے کے چوکیدار اور سپاہیوں نے جب مجھے بھاگتے آتے دیکھا تو مجھ سے اس طرح سے آنے کی وجہ دریافت کرنے لگے۔

میں پریشانی اور گھبراہٹ کے عالم میں صرف یہ کہہ سکا کہ "جمعہ ٹھگ۔" اگرچہ میں نے اس سے آگے کچھ نہیں کہا مگر اس کا نام سن کر ہی سپاہی چوکنے ہوگئے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟ اس پر میں نے انہیں جگہ کا پتہ بتایا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں ان کے ساتھ چل کر وہ جگہ بتاؤں۔ اس پر میں نے اپنی مجبوری ظاہری کی۔ انہوں نے مزید پوچھ گچھ کرنے کے بجائے اس جگہ کا راستہ لیا کہ جہاں جمعہ سو رہا تھا۔

اس دوران میں مجھے ریاست کے وزیر نے بلا بھیجا' اور مجھ سے پوچھ گچھ کی اور جب

میری تفتیش ختم ہوگئی تو میں نے دیکھا کہ جمعہ کو گرفتار کرکے اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس کو مارا پیٹا گیا اور یہاں تک کہ اس کے پورے جسم کو تلوار سے چھید ڈالا گیا۔ اس کے بعد حاضرین نے اس کے چہرے پر تھوکا۔ جب اس کی تلاشی لی گئی تو اسکے پاس سے جو رقم برآمد ہوئی' وہ فوراً ضبط کرلی گئی۔ پھر اسے فوراً ہی ایک بڑی توپ کے منہ سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔ اس طرح اس کا ناپاک وجود اس دنیا سے ختم ہوگیا۔

وہاں سے میں ایک کنویں تک گیا اور وضو کرنے کے بعد خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجے ایک بڑی آفت سے بچا لیا' اور خلوص کے ساتھ خدا تعالیٰ سے معافی مانگی کہ میں نے عہد کو توڑنے کا جو جرم کیا ہے اس کی مجھے سزا نہ ملے۔

خدا کے حضور میں اپنی یہ التجائیں پیش کرنے کے بعد' میں نے آگ جلائی تاکہ میں اپنے ناشتہ کے لئے تھوڑے سے گیہوں بھون سکوں۔ انہیں بھون کر میں نے اطمینان کے ساتھ انہین کھانا شروع کردیا۔ میرا اردہ تھا کہ اس دن میں زیادہ سفر کروں۔ اس وقت تک میں اجنبی لوگوں سے بدظن ہو چکا تھا اور میرا ارادہ تھا کہ اکیلا ہی تیزی کے ساتھ سفر کروں۔ میں جیسے ہی جانے کا ارادہ کررہا تھا کہ میں نے دیکھا ایک سپاہی میری طرف آرہا ہے۔ اس کو آتے دیکھ کر میں ڈر گیا اور میرے دل میں کئی وسوسے جنم لینے لگے۔ میرے ذہن میں پہلا خیال تو یہی آیا کہ شاید کوئی گوالیار سے مجھے لینے آیا ہے۔ یا انہیں شبہ ہوگیا کہ میں جمعہ کے ساتھیوں میں سے ہوں' اس صورت میں شاید مجھے بھی وہی سزا ملے یا مجھے قید کردیا جائے۔ لیکن میرے یہ تمام خدشات اس وقت دور ہوگئے کہ جب سپاہی نے میرے قریب آکر مجھے ادب سے سلام کیا اور کہا کہ وزیر صاحب مجھ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ میں اس کے ساتھ دربار میں گیا اور اس جگہ بیٹھ گیا کہ جہاں اس نے اشارہ کیا تھا۔ وزیر نے بھرے دربار میں میرا شکریہ ادا کیا کہ میں نے اس بدمعاش لٹیرے کے خاتمہ میں ان کی مدد کی جس نے کئی لوگوں کی جان لی تھی اور اگر وہ زندہ رہتا اور بھی کئی اس کی بربریت کا شکار ہوتے۔ اس نے اپنے خزانچی کو حکم دیا کہ وہ ان ایک سو بارہ اشرفیوں میں سے کہ جو اس ٹھگ سے ملیں تھیں' مجھے بارہ اشرفیاں دے دے۔ شکریہ کے طور پر میں جھک کر آداب بجا لایا۔ خزانچی نے جب اشرفیاں دیں اور میں نے انہیں گنا تو یہ بارہ کے بجائے دس تھیں' جب میں سوالیہ طور پر اس کی طرف دیکھا تو اس نے کہا کہ دو اس نے اپنی فیس کے طور پر لے لی ہیں۔ اس کے بعد میں مزید کوئی سوال نہیں پوچھا اور وہاں سے چلا آیا۔

پہلی مرتبہ جب میرے پاس دس اشرفیاں آئیں تو میں نے خود میں اعتماد' غرور' اور فخر کے جذبات کو محسوس کیا اور یہ خیال کہ انسان کو خدائے مطلق پر بھروسہ کرنا چاہئے اور اس کے سہارے زندہ رہنا چاہئے۔' مجھے فضول سا معلوم ہونے لگا اور جیسا کہ شیکسپئر نے کہا ہے اس "سنہری شیطان" نے اپنے مالک پر مضر اثرات ڈالنا شروع کردیئے لیکن ان کے آتے ہی میرا ڈر اور خوف اور زیادہ بڑھ گیا۔ اس سے پہلے مجھے صرف اپنی جان کا خطرہ تھا اب پیسہ اور جان دونوں کا خطرہ ہوگیا۔ یہ ذلیل دھات کہ جس کی محبت میں ہر ایک گرفتار ہے' اس کے حصول کے لئے وہ ہزاروں جتن کرتے ہیں او رخدا نے جس مخلوق کو اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے' اس کو حاصل کرنے میں اسے تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے۔ اب میں اس بات پر مجبور ہوا کہ عام شاہراہ پر سفر کروں اور اکیلے کے بجائے کسی قافلہ کے ساتھ رہوں کیونکہ یہ میری اس دولت کی حفاظت کے لئے ضروری تھا جو مجھے نئی نئی ملی تھی اور جسے میں نے خفیہ طور پر چھپا رکھا تھا۔

مختصر یہ کہ سات دن میں سخت محنت اور پیچیدہ سفر کے بعد میں قدیم آگرہ کے قرب و جوار میں پہنچ گیا۔ میرے پاس جو روٹی تھی' اس پر حضرت عیسیٰ کی برکت تھی کہ جس کی وجہ سے میرے ایک ہفتہ کے سفر میں میں اس کے تین حصہ کھائے جبکہ چوتھا حصہ اس کا اب بھی باقی تھا۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ راستہ بھر میں کھیتوں سے گیہوں کی بالیاں توڑ کر انہیں بھون کر کھاتا رہا۔ اس پورے سفر میں یہ میرا سب سے عمدہ و لذیذ ناشتہ تھا۔ اپنی غلامی سے آزاد ہونے کے بعد اس مختصرا سے سفر میں مجھے پہلی بار اپنی آزادی کا احساس ہوا' اور اس سے جو خوشی ہوئی اس کو سوچ کر آج بھی میں لذت محسوس کرتا ہوں۔

صبح کی چہل قدمی کی یادیں' صاف شفاف پانی سے وضو کرنا' جنگل کی خاموشی میں کسی اچھے سے درخت کے سایہ میں کہ جس کا انتخاب میں کرتا' وہاں ظہر کی نماز پڑھنا' اور ہر نماز کے بعد سرسبز مخملی فرش پر جو فطرت نے ہر طرف بچھایا ہوا تھا' اس پر آرام کرنا' یہ تمام یادیں آج بھی خوشی و مسرت کا باعث ہیں۔

شہر کے قریب پہنچ کر میں ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ گیا اور درختوں کے درمیان سے بلند ہوتی ہوئی قدیم عمارتوں کو دیکھ کر ان کی شان و شوکت سے بے انتہا متاثر ہوا۔ دوپہر کے وقت میں شہر میں داخل ہوا اور اپنے مرحوم باپ کے رشتہ دار کو تلاش کرنے لگا۔ جب میں اس گھر پہنچا تو دروازے پر ایک کنیز نے آکر پوچھا کہ میں کون ہوں۔ میں نے اسے جواب دیا کہ میں مولوی محمد اکرم کا بیٹا ہوں کہ جس کی پہلی شادی اسی گھر میں

ہوئی تھی۔ میرے اس پیغام کا فوری طور پر اثر ہوا' اور دروازے پر ایک شخص آیا کہ جس کے چہرے پر دانشمندی ظاہر ہوتی تھی۔ اس نے بڑی تفصیل کے ساتھ میری سوتیلی بہنوں کے بارے میں پوچھا' میرے آباؤاجداد کے نام معلوم کئے اور ان کو اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے ایک پرچہ سے مقابلہ کیا' جب اسے یقین ہوگیا کہ میں واقعی اس خاندان سے تعلق رکھتا ہوں تو وہ مجھ سے بغل گیر ہوا اور مجھے گھر کے اندر لے گیا جہاں عورتوں نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اس کے بعد مجھے ایک بوڑھی خاتون سے ملایا گیا جو میری سوتیلی دادی تھیں جس نے فورا میرا چارج لے لیا۔ مجھے ہر اس شخص سے کہ جو مجھ سے ملتا تھا اسے اپنی کہانی سنانی ہوتی تھی۔ لہذا میں نے اس مقصد کے لئے اپنی کہانی کو انتہائی مختصر کرکے چند جملوں میں محدود کردیا۔

میں یہاں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ اس شریف خاندان نے مجھ پر لاتعداد احسانات کئے۔ میں ان کا اس مہمان نوازی پر دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جو انہوں نے مجھ اجنبی کے ساتھ کی۔ میں یقیناً ان کے لئے اجنبی ہی تھا' کیونکہ میری سوتیلی ماں کے مرنے کے بعد میرے اور ان کے درمیان رشتہ کی وجہ ختم ہوگئی تھی۔ وہ بوڑھا شخص ایک سکول میں استاد تھا۔ لہذا میری تعلیم و تربیت کی ذمہ داری اس نے اٹھا لی۔ تعلیم کی لگن' وقت کی پابندی اور محنت کی وجہ سے میں اس کا پسندیدہ شاگرد ہوگیا۔ جمعہ کے دن وہ مجھے آزاد چھوڑ دیتے تھے کہ میں جس طرح سے چاہوں تفریح کروں۔ لیکن کھیلنے کے بجائے میں اپنے دوستوں کے ساتھ شہر کی قدیم عمارتیں اور باغات کی سیر کو چلا جایا کرتا تھا۔

آگرہ کا تاریخی اور قدیم شہر جمنا دریا کے شمال مغرب میں واقع ہے' دریائے جمنا' گنگا اور سرسوتی تینوں ہندوؤں کے مقدس دریا ہیں۔ الہ آباد کے قریب ان کا سنگم تری بنی یا بالوں کی تین چوٹیاں کہلاتا ہے۔ یہ ان کے نزدیک انتہائی پاک مقام ہے کہ جہاں غسل کرنے سے ان کے تمام گناہ دھل جاتے ہیں۔ جمنا میں نہانے سے صرف تین گنا گناہ ختم ہو جاتے ہیں۔ اکبر بادشاہ کے دور حکومت سے آگرہ کا نام اکبر آباد ہوگیا ہے۔ اس نے شہر کو خوبصورت بنانے اور آباد کرنے میں بڑی دلچسپی لی تھی اور پھر اسے اپنا دارالحکومت بنا لیا تھا۔ اس شہر کے گھر اکثر بلند و بالا اور دو منزلہ ہیں۔ لیکن گلیاں بڑی تنگ او رپیچیدہ ہیں۔ ان کا مقابلہ قاہرہ کی گلیوں سے نہیں کیا جا سکتا ہے۔ سوائے ایک کہ جو قلعہ سے متھرا دروازے تک جاتی ہے۔ شہر کا ایک بڑا حصہ ان دنوں میں ویران پڑا ہوا تھا۔ یہاں سے پندرہ میل کے فاصلہ پر سکندرہ میں شہنشاہ اکبر کا مقبرہ ہے۔ اگر قارئین کو اس عظیم بادشاہ

کے بارے میں جاننے کی خواہش ہو تو میں سفارش کرتا ہوں کہ وہ ابوالفضل کا لکھا ہوا اکبر نامہ پڑھیں، جس میں اس کی دانشمندی، فیاضی اور سیاسی سوجھ بوجھ کی تفصیلات ہیں۔ اس میں اس کی نوجوانی سے لے کر جبکہ وہ تیرہ سال کا تھا۔ اور حکومت کی ذمہ داریوں کا بوجھ اسے سنبھالنا پڑا تھا، اس کی 63 سال کی عمر تک کا ذکر ہے کہ کس طرح اس نے مستقل مزاجی کے ساتھ حکومت کی اور بالآخر اس دنیا کو چھوڑ کر دوسری دنیا میں چلا گیا کہ جو یقیناً اس سے بہتر ہے۔ اور وہ وہاں یقیناً محلات و حوروں کے درمیان ابدی مسرت میں ڈوبا ہوا ہوگا۔

آگرہ اس لئے بھی مشہور ہے کہ یہاں نابغہ روزگار ابوالفضل اور اس کا بھائی فیضی پیدا ہوئے۔ فیضی کے علم و ذہانت کی وجہ سے دنیا اس کی احسان مند ہے کہ اس نے گیتا، مہابھارت اور رامائین جیسی کتابوں کا سنسکرت سے ترجمہ کیا اور ابوالفضل کا کارنامہ ہے کہ اس نے ہندوستانی امور و معاملات و قوانین اور انتظام سلطنت پر آئین اکبری جیسی کتاب لکھی۔

میں یہاں اپنے قارئین کی توجہ اکبر بادشاہ کے دور حکومت کی طرف دلانا چاہتا ہوں کہ جس کا اکاون سالہ عہد حکومت ہندوستان کے لئے باعث رحمت تھا۔ اگر اس کے جانشینوں میں اس جیسی آدھی سمجھ بھی ہوتی تو آج یہ ملک غیرملکیوں کے قبضہ میں نہیں ہوتا۔ سلطنت کا بوجھ اس کے کندھوں پر اس وقت آ پڑا تھا جب کہ وہ تیرہ سال کا تھا۔ اس کو ذہن میں رکھنا ہوگا کہ ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک پر حکومت کرنا اس عمر کے بچے کے لئے کوئی آسان کام نہ تھا، کیونکہ اس امن کے زمانہ میں، انگلستان کے تین قابل اور روشن خیال سیاستدانوں کے لئے، بھی جن کی مدد کے لئے مشیروں کی کونسل ہے۔ ہندوستان پر حکومت کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ جب اس نے حکومت کی ذمہ داریاں سنبھالی ہیں تو پورے ملک میں انتشار و بے چینی تھی لیکن نوجوان حکمران کہ جس میں مورخوں کے مطابق تین خصوصیات تھیں، یعنی ہمت، سخاوت اور دوررسی۔ اس نے خود کو بہترین جنرل، اور قابل احترام بادشاہ اور قابل قدر سیاستدان ثابت کردیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے حکومت کے نظام کو اس خوبی سے چلایا کہ اس کی رعایا اور دوست سبھی اس کی محبت میں گرفتار ہوگئے۔ اس کی شخصیت کی تعریف نہ صرف ایشیا کے مورخ کرتے ہیں بلکہ یورپی مورخ بھی اس کی شان میں رطب اللسان نظر آتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خداوند تعالیٰ نے اسے ابدی نیک نامی عطا کردی ہے۔

شہر کا قلعہ مضبوط قسم کے سرخ پتھر کا بنا ہوا ہے۔ یہ پتھر گوالیار پتھروں کی کان سے حاصل کیا گیا تھا۔ اس کی خندق کی گہرائی کافی ہے۔ اس کی دھری فصلیں ہیں اور تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر برج بنے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کی مشہور عمارتوں میں سے ایک ممتاز محل ہے جسے مقبول عام زبان میں تاج محل کہا جاتا ہے۔ یہ ہندوستانی معماروں کا ممتاز کارنامہ ہے۔ اسے خالص سفید سنگ مرمر سے بنایا گیا ہے اور اس پر نازک نقش و نگار ہیں۔ اس میں استعمال ہونے والا مواد انتہائی قیمتی ہے' اس کا ڈیزائن سادہ ہے' مگر اس کا اثر دیکھنے والے پر رعب ڈالتا ہے۔ خوبصورتی میں تمام ہندوستان میں اس جیسی کوئی عمارت نہیں ہے اور متانت و سنجیدگی میں اس کا مقابلہ ایشیا کی کوئی عمارت نہیں کر سکتی ہے۔

اس کو تعمیر کرانے والا شاہ جہاں تھا' جس نے اسے اپنی بیوی ممتاز محل کی یاد میں بنوایا۔ ممتاز محل ایک قابل خاتون تھی اور اپنے وقت کی سب سے خوبصورت عورت تھی۔ یہ اس کا مقبرہ ہے۔

اس وقت آگرہ کی آبادی' جیساکہ مجھے بتایا گیا ہے' اسی ہزار تھی' 1803ء میں دولت راؤ سندھیا نے اسے لارڈ لیک کے حوالے کردیا تھا۔

میں اس شریف خاندان کے ساتھ پانچ سال تک رہا' یعنی 1817ء تک۔ اس عرصہ میں' میں نے سکول میں اپنی تعلیم مکمل کرلی۔ اس زمانہ میں اس بوڑھے آدمی نے کسی دوست کے ذریعہ مجھے یہ پیغام بھجوایا کہ میں نے اس قدر تعلیم حاصل کرلی ہے کہ اب میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکتا ہوں۔ اگر میں چاہوں تو وہ میرے لئے انگریزی ملازمت کا کچھ بندوبست کر سکتا ہے کہ جن کی حکومت حال ہی میں اس علاقہ میں قائم ہوئی ہے اور اس کو خوشی ہوگی۔ اگر میں تیار ہوں تو میری شادی اپنے رشتہ داروں میں کسی سے کرا دے گا۔

اس پیغام کے جواب میں' میں نے اپنے محسن کا شکریہ ادا کیا' اور کہا کہ میں زندگی بھر اس کے احسان کا بدلہ نہیں اتار سکوں گا۔ اگرچہ اس وقت میں اس قابل نہیں کہ اس کی کوئی خدمت کرسکوں۔ لیکن اگر مجھے وقت ملا تو یقیناً میں اس کے کام آؤں گا۔ جہاں تک ملازمت اور شادی کا تعلق ہے تو میں اس وقت ان دونوں باتوں کو پورا کرنے سے معذور ہوں کیونکہ میری خواہش ہے کہ میں سب سے پہلے اجین جاکر اپنی ماں سے ملاقات کروں۔

چوتھا باب

فروری 1817ء میں دولت راؤ سندھیا کے بھائی ہندوراؤ کا حکیم رحمت اللہ بیگ خان دہلی جاتے ہوئے آگرہ میں آیا۔ چونکہ وہ اس بوڑھے شخص سے گوالیار سے واقف تھا اس لئے اس سے ملنے آیا' اس موقع پر میں نے بھی اس سے ملاقات کی۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ اگر میں کسی بھی حیثیت میں اس کے کام آسکتا ہوں تو اس کے ساتھ سفر کرنے پر تیار ہوں۔ اس نے مہربانی کرتے ہوئے مجھے کم تنخواہ پر اپنی ملازمت لے لیا۔ میرے ذمہ اس کی دواؤں اور گھریلو امور کی دیکھ بھال تھی۔

اپنی اس غیر معمولی کامیابی پر میں خوشی خوشی گھر واپس آیا اور یہ خوش خبری اپنے مہربان کو سنائی۔ اسے سن کر وہ اور گھر کے تمام افراد کہ جن کے ساتھ میں پانچ سال تک رہا۔ میرے جدا ہونے کے خیال سے افسردہ ہوگئے۔ جس دن میں رخصت ہو رہا تھا' اس دن میں نے دس اشرفیاں اور چند روپیہ جو اس وقت میرے پاس تھے وہ اپنے محسن کے قدموں میں رکھ دیئے اور اس سے درخواست کی کہ اس معمولی تحفہ کو قبول کرکے مجھ پر احسان کرے۔ اس نے تھوڑی بہت ہچکچاہٹ کے بعد اسے قبول کرلیا' جس کی وجہ سے مجھے تسلی ہوگئی۔ اس کے بعد اس نے حکیم سے ملاقات کی اور میری تعریف و توصیف کرتے ہوئے میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھمایا اور مجھے خدا حافظ کہا۔

جمعرات کی صبح کو ہم نے اپنے دوستوں کو الوداع کہا اور آگرہ شہر چھوڑ دیا۔ جن لوگوں نے اس علاقے کو دیکھا ہے انہیں معلوم ہے کہ آگرہ سے دہلی کا سفر ایسا ہی ہے جیسے کہ باغ میں چہل قدمی کرنا۔ ہم نے یہ پرمسرت سفر ایک ہفتہ میں طے کیا۔ آٹھویں دن صبح ہی صبح ہمیں دہلی کا شاندار نظارہ نظر آیا۔ راجاؤں اور بادشاہوں کا شاندار شہر ہماری آنکھوں کے سامنے تھا۔ شہر کو ایک نظر دیکھنے کے بعد مسافر کے ذہن میں اس کی پرانی تاریخ آجاتی ہے کہ کسی وقت یہ شہر سلطنت کا مرکز تھا کہ جہاں سے ہر قسم کے فرامین جاری ہوتے تھے اور انہیں پوری سلطنت میں نافذ کیا جاتا تھا۔ یہ وہ جگہ تھی کہ جہاں آکر شہزادے اور اعلیٰ منصب دار ڈر اور خوف سے کانپ جاتے تھے۔ اس کے دروازوں پر ان امراء اور شہزادوں

کے سر بطور عبرت لٹکے ہوتے تھے کہ جنھوں نے بغاوت کی ہوتی تھی یا شاہی احکامات کی خلاف ورزی کی ہوتی تھی' جبکہ جو وفادار تھے وہ یہاں سے فاتحانہ طریقے سے گزرتے تھے۔

شہر میں داخل ہوتے وقت انگریزی حکومت کے کچھ کلرکوں اور چپڑاسیوں نے ہماری ناراضگی کے باوجود ہمارے سامان کی تلاشی لی اور ہم سے تفصیل کے ساتھ شہر آنے کی وجوہات معلوم کیں۔ جب ان کو سوالات کا جواب مل گیا تو انہوں نے ہمیں جانے کی اجازت دی۔ حکیم نے وقتی طور پر اپنی رہائش کا انتظام ایک امیر کی حویلی میں کیا' یہ امیر نوازش خاں کے خاندان سے تھا' اور ایک بڑی حویلی میں چاندنی چوک میں رہتا تھا۔ یہ مکان ہر قسم کے فرنیچر اور آسائش کی چیزوں سے آراستہ تھا۔ یہاں پر ہم سفر کی تھکن کے بعد ستر دن تک آرام کے ساتھ رہے۔ اس عرصہ میں میرے پاس کرنے کو بہت کم تھا۔ صرف صبح کے وقت حکیم کے دیئے ہوئے نسخوں کو مجھے ایک رجسٹر میں نقل کرنا ہوتا تھا۔ کبھی کبھی ہدایت کے مطابق مریضوں کے صندوق سے جو میرے چارج میں تھا دوائیں دینا ہوتی تھیں۔ پھر ناشتہ کے بعد سے پورا دن میرا اپنا ہوتا تھا۔ یہ وقت میں شہر کے گردونواح میں گھومنے میں گزارتا تھا۔

دہلی کا قدیم شہر جس کو قدیم ہندو دیومالائی قصوں میں اندرپرست کہا گیا ہے اب جدید شہر کے شمال میں ویران ٹیلوں پر واقع ہے۔ یہاں پر اب تک قدیم محلات و عمارتوں کے کھنڈرات باقی ہیں۔ اس کے علاوہ شہر کے قدیم دروازے' مسجدیں' ہمایوں کا مقبرہ' شیر شاہ کا قلعہ اور دوسری چھوٹی عمارتیں اب تک زمانہ کے ہاتھوں سے محفوظ ہیں۔ اب تک ان کی تعمیر اور ان کی شکل اسی مضبوطی کے ساتھ قائم ہے۔ پہلا مسلمان حملہ آور سلطان محمود غزنوی تھا جس نے اس شہر کو 1110ء میں فتح کیا تھا۔ لیکن اس نے اس کو دوبارہ سے راجہ کے حوالہ کر دیا اور اسے اس وعدہ پر کہ وہ پابندی سے خراج ادا کرے گا' اس کا تخت اس کے حوالہ کر دیا۔

موجودہ شہر کو شاہ جہاں نے 1631ء میں آباد کیا تھا۔ یہ شہر دریائے جمنا کے مغربی کنارے پر واقع ہے اور اس کا نام شاہ جہاں آباد ہے۔ جب میں اس شہر میں آیا ہوں تو اس کی آبادی تقریباً دو لاکھ ہو گی۔ شہر پر ویرانی کی حالت طاری ہے اور خستہ عمارتیں جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔ یہ تباہی مرہٹوں کے ساتھ جنگوں کے نتیجہ میں آئی۔ شہر کی فصیل' برج اور سات دروازے سرخ پتھر سے تعمیر کئے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ یہاں پر بہت سی عمارتیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ ان میں سے کچھ اب تک اچھی حالت میں ہیں' اور کچھ شکستہ ہو گئی

ہیں۔ مثلاً غازی الدین کا مدرسہ' جواجمری دروازے کے قریب ہے۔ علی مردان خاں' قمرالدین خان اور محمد شاہ کی ماں قدسیہ بیگم کی حویلیاں اور بہت سی مسجدیں اب تک اپنی اصل شکل میں ہیں۔ ان سب عمارتوں میں' شاندار دہلی کی جامع مسجد ہے جو سرخ پتھر سے تعمیر ہوئی ہے اور شہر کے بیچوں بیچ واقع ہے۔ اس قابل احترام عمارت کو شاہ جہاں نے اپنی تخت نشینی کے چار سال بعد تعمیر کرایا تھا اور اس کی تکمیل گیارہویں سال جلوس میں ہوئی تھی۔

یہاں کے لوگ مہذب اور شائستہ ہیں۔ اس کی آب و ہوا بھی صحت کے لئے بہترین ہے۔ دہلی میں تین ہفتہ قیام کرنے کے بعد میرے آقا نے حکم دیا کہ ہمیں گوالیار جانے کی تیاری کرنی چاہئے۔ یہ تیاری جلد ہی ہوگئی۔ اور ہم نے ہندوستان کے تاریخی شہر کو چھوڑ کر ایک ہفتہ کے اندر اندر اپنی منزل مقصود تک بغیر کی رکاوٹ کے سوائے ایک معمولی حادثہ کے جوکہ ہمارے ایک نوکر کو پیش آیا تھا' پہنچ گئے۔ ہوا یہ کہ ہمارے سفر کے چار روز بعد ایک گاڑی کے قریب درخت کے سایہ میں ہم نے ناشتہ کے لئے قیام کیا۔ اس ہندو لڑکے کو پیاس لگی اور وہ اپنا برتن لے کر کنویں میں پانی لینے کے لئے اتر گیا۔ ابھی وہ چند سیڑھیاں اتر کر گیا ہی تھا کہ اسے ایک سانپ نے ڈس لیا۔ اس نے جیسے ہی سانپ کو دیکھا' اور اس کے ڈسے جانے سے تکلیف محسوس کی تو پہلا کام جو اس نے کیا وہ یہ کہ اپنا پستول نکالا اور سانپ کو وہیں مار ڈالا۔ فائر کی اچانک آواز سن کر ہم سب کنویں کی طرف دوڑے۔ وہاں ہم نے دیکھا کہ وہ تلوار کے ذریعہ اپنی ایڑھی کے گوشت کو تلوار سے کاٹ کر علیحدہ کررہا ہے اور اس سے تھوڑے فاصلہ پر وہ زہر زدہ سانپ مرا پڑا ہے۔ ہم اس کو اٹھا کر باہر لائے' اب تک وہ زیادہ خون کے بہنے سے بے ہوش پڑا تھا۔ ہمارے رحمدل آقا' یعنی حکیم نے جب یہ صورتحال دیکھی تو اس نے فور ایک بڑے چاقو کو آگ پر گرم کرایا۔ اور اس کے ٹخنے کے نیچے حصہ کو اس سے داغا۔ اس کے بعد زخم کو صاف کیا اور اس پر کافی تعداد میں نمک چھڑک دیا۔ میرا خیال ہے کہ نمک کے ملنے کی وجہ وہ ہوش میں آیا اور پینے کے لئے پانی مانگا۔ ڈاکٹر نے اسے پانی کے بجائے انگلش برانڈی پینے کو دی جس کی وجہ سے وہ فوراً سو گیا۔

اسی دوران قریبی گاؤں سے کافی لوگوں کی تعداد کنویں کے قریب جمع ہوگئی۔ انہوں نے اس وحشی جانور کی موت پر ہمارا شکریہ ادا کیا کیونکہ وہ اب تک دو مرد اور ایک عورت کو ڈس کر مار چکا تھا۔ سانپ کو باہر لایا گیا اور جب اس کو ماپا گیا تو وہ دو گز سے زیادہ ہی کا

نکلا۔ جب اس کا پیٹ چاک کیا گیا تو اس میں سے ایک مینڈک اور چڑیا نکلی۔ اس غریب نوکر کو ایک اونٹ پر باندھ کر لایا گیا' وہ تقریباً چھ ہفتہ بعد اپنی اس بیماری سے صحت یاب ہوا۔ جب ہندو راؤ' مہاراجہ کے سالے نے کہ جن کی ملازمت میں حکیم تھا' اس واقعہ کے بارے میں سنا تو انہوں نے اس شخص کی بہادری کا اعتراف کرتے ہوئے اسے چپڑاسی سے گھڑسواروں میں داخل کرلیا کہ جہاں ایک روپیہ روز اس کی تنخواہ مقرر ہوئی۔

کیمپ میں آنے کے بعد' صوبیدار جو کہ میرا پرانا سرپرست یا کہ مجھ پر ظلم کرنے والا تھا' وہ حکیم کے پاس آیا اور مجھ سے درخواست کی کہ میں اسے معاف کردوں اور پچھلا سب کچھ بھول جاؤں۔ اس نے حکیم سے بھی اپیل کی کہ وہ مجھے اس کے ساتھ جانے کی اجازت دیدے۔ حکیم نے کہا کہ اگر میں اس کے ساتھ جانا چاہوں تو اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اس کے بعد وہ میری بات سننے کے لئے میری طرف مڑا۔ میں نے اس سے مخاطب ہوکر کہا کہ "ماضی میں جو کچھ ہوا تھا' اس کے لئے میں نے تمہیں معاف کیا' میں کوشش کروں گا کہ اسے بھول ہی جاؤں۔ میرے پاس جب بھی وقت ہوگا تو میں تمہارے پاس آجایا کروں گا مگر میں تمہاری خاطر حکیم کی ملازمت نہیں چھوڑ سکتا۔ اس ملازمت میں اس وقت تک ہوں کہ جب تک اجین جانے کے لئے مجھے کوئی قافلہ مل جائے تاکہ میں اپنی ماں سے ملاقات کرسکوں۔" میری اس گفتگو نے صوبیدار کو خاموش کردیا اور وہ کچھ کہے بغیر وہاں سے چلا گیا۔

میں حکیم کے ساتھ چھ مہینے تک رہا اور اس دوران میں چونکہ مسلسل حکمت کے پیشہ سے منسلک رہا' لہٰذا میں نے اس میں گہری دلچسپی لینی شروع کردی اور بہت سی مفید باتوں کا مجھے اس ملازمت کے دوران علم ہوا۔ حکیم کی پریکٹس بہت سادہ اور آسان تھی۔ وہ بہت کم دوائیں دیتا تھا بلکہ غذا کے ذریعے مریضوں کا علاج کرتا تھا۔ ہندو راؤ جس کا وہ ملازم تھا' اس پر بہت اعتماد کرتا تھا۔ اگرچہ اس کی تنخواہ صرف پانچ سو روپیہ ماہوار تھی۔ لیکن اسے جو تحفے تحائف ملتے تھے وہ اس تنخواہ سے دگنے ہو جاتے تھے۔ مجھے اسکے طریقہ علاج کا ایک واقعہ یاد ہے۔ مہاراجہ ہندو راؤ ایک مرتبہ دو یا تین دن کے لئے شکار پر گئے۔ یہ جگہ کیمپ سے کوئی تیس میل کے فاصلہ پر ہوگی۔ یہاں اسے ہچکیوں کی بیماری لگ گئی۔ اس کے ساتھ دو حکیم تھے کہ جنہوں نے کوشش کی کہ اس تکلیف دہ بیماری سے اسے نجات مل جائے۔ مگر انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ ان میں سے ایک اس کے بازو سے خون لینا چاہتا تھا' مگر خود مریض نے اس کی ممانعت کی۔ اس تکلیف کو زیادہ عرصہ برداشت نہ کرتے ہوئے'

مہاراجہ واپس کیمپ میں آگئے اور میرے آقا کو حکم دیا کہ وہ اس کا علاج کرے۔ حکیم نے اس کے علاج کے لئے آسان سا نسخہ بتایا کہ وہ گنے کو جس پر عرق گلاب چھڑکا ہوا ہو، اسے چوسے۔ اس نے جیسے ہی یہ کیا وہ فوراً ٹھیک ہوگیا اور حکیم کو محل چھوڑنے سے پہلے پہلے انعام و اکرام سے نوازا گیا۔ مہاراجہ نے اپنے گلے سے بڑے موتیوں کا ہار اتار کر اس کو معہ دو خوبصورت شالوں کے دیا۔

مجھے جب کبھی فرصت ملتی تھی تو میں صوبیدار کے پاس چلا جایا کرتا تھا اور کبھی کبھی اس کے ساتھ کھانا بھی کھا لیتا تھا۔ اس بار میں نے اسے بڑا شائستہ پایا۔ اگست کے مہینہ میں کھانڈے راؤ، جس امیر کے ساتھ ہم گوالیار رہے تھے، اسے اجین جانے کی اجازت مل گئی۔ صوبیدار نے بھی کوشش کرکے اپنی خدمات اسکے سپرد کردیں۔ میں نے بھی ان کے ساتھ جانے کے لئے حکیم سے درخواست کی کہ مجھے ملازمت سے فارغ کردیا جائے۔ وہ مجھے اجازت دینے میں پس و پیش کررہا تھا کیونکہ اس کو یقین تھا کہ اگر میں اس کے ساتھ چار پانچ سال کام کرلوں تو وہ مجھے بہترین حکیم بنا سکتا ہے اور اس صورت میں، میں اپنی پریکٹس خود کرسکتا ہوں۔ لیکن ماں کو دیکھنے کی خواہش اس قدر زیادہ تھی کہ میں نے اس کے آگے اس کی دلیل کو نہیں سنا۔ اس نے میرے بقایا جات ادا کئے اور فیاضی کے ساتھ مجھے مزید اور روپیہ اور لباس عطاء کیا۔ جب میں نے اسے چھوڑا ہے تو میرے پاس سو روپیہ کی خطیر رقم تھی۔

اگست کے دوسرے ہفتہ میں ہم نے کیمپ چھوڑا اور تیزی کے ساتھ اپنا سفر شروع کیا۔ ہم صبح سات بجے روانہ ہوتے دن بھر سفر کے بعد ہم چار بجے قیام کرتے۔ کیونکہ یہ بارشوں کا موسم تھا اس لئے ہمارا سفر کوئی زیادہ خوشگوار نہیں تھا۔ دریا اور چشمہ عبور کرنے میں ہمیں کئی گھنٹے لگ جاتے تھے اور کبھی کبھی تو ایک دن اور رات اس کے لئے قربان کرنی پڑتی تھی۔ جب ہم نے بوندی میں قیام کیا تو موسلادھار بارش شروع ہوگئی جو تمام رات جاری رہی اور دوسرے دن بھی ایک سیکنڈ کے لئے نہ رکی۔ رات کو بارش کا پانی اس قدر جمع ہوگیا کہ ہمارے بستر اور تکیے تیرنے لگے۔ ہمارے گھوڑے اور اونٹ کھڑے کانپ رہے تھے اور ہماری حالت بھی ان کے مقابلہ میں کوئی اچھی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ بھوک کی شدت سے ہم سب نحیف و کمزور ہوگئے تھے۔ اس جگہ پر مجبوراً ہمیں پانچ دن ٹھہرنا پڑا۔

ستمبر کے پہلے ہفتہ میں آخرکار ہم اپنی منزل پر بحفاظت پہنچ گئے۔ چھ سال بعد دوبارہ سے اجین کو دیکھ کر مجھے بے انتہا خوشی ہوئی۔ کھانڈو راؤ اور صوبیدار ایک ہفتہ تک اور شہر

میں نہیں آئے کیونکہ یہ وقت ستاروں کی گردش کی وجہ سے منحوس تھا۔ جہاں تک میرا تعلق تھا میں اپنی ماں سے ملنے کے لئے اس قدر بے چین تھا کہ ستاروں کی گردش بھی مجھے اب زیادہ عرصہ نہیں روک سکتی تھی اور اس سے پہلے کہ یہ حکم ہو کہ کوئی شخص کیمپ کو نہ چھوڑے میں اس حالت میں اپنی ماں کے پاس تھا کہ میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ میری ماں بالکل صحت مند تھی' اور اس کا لڑکا بھی تندرست تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ اس کا گھر ہر قسم کے فرنیچر' پردوں' قیمتی مسالہ جات اور تانبے کے برتنوں سے بھرا ہوا تھا۔ کیونکہ ان سب چیزوں کا حصول صوبیدار کی تنخواہ میں ممکن نہیں تھا اس لئے میں نے اپنی ماں سے پوچھا کہ یہ سامان کہاں سے آیا۔ اس کا جواب اس نے ایسا دیا کہ جس سے میں قطعی مطمئن نہیں ہوا۔ جب میں نے مزید معلومات کیں تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ سارا سامان لوٹا ہوا مال ہے جسے صوبیدار کی پہلی بیوی کے بھائی نے غیرقانونی طور پر حاصل کر کے جمع کیا ہے۔ ہماری غیرحاضری میں اس نے ڈاکو کا پیشہ اختیار کرلیا ہے اور لوٹ مار کی خاطر وہ اکثر شیطانی مہمات پر جاتا ہے اور واپسی پر یہ سامان لے کر آتا ہے۔

میں اپنی ماں کے ساتھ تین ہفتوں تک بڑے آرام اور خاموشی سے رہا۔ دسمبر کے درمیان میں دس ہزار فوجیوں پر مشتمل انگریز فوج سرٹامس ہس لوپ کی سربراہی میں یہاں آئی اور دریائے سپرا کے کنارے قیام کیا۔ میرا وقت ان دنوں سپاہیوں کی بہترین یونیفارم' ان کی توپوں کی قطاریں' اور ان کی جنگی سازوسامان کو دیکھنے میں صرف ہوتا تھا۔ صبح کی نماز کے بعد میں ان کے کیمپ میں چلا جاتا تھا اور وہاں ان کی ورزش' قواعد' ڈرل اور پیریڈ دیکھا کرتا تھا۔ وہاں میں نے ایک انگریز سپاہی سے دوستی کرلی تھی جو کہ بڑا شریف النفس تھا' مگر افسوس کہ میری زبان نہیں بول سکتا تھا۔ ہماری گفتگو اشاروں میں ہوتی یا ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں۔ ایک دن وہ مجھے اپنے خیمہ میں لے گیا جہاں اس کے اور دوستوں نے بڑی خوش اخلاقی سے میرا خیرمقدم کیا اور مجھے شراب کی پیش کش کی۔ اس کے لئے تو میں نے معذرت کرلی' مگر اس کو خوش کرنے کے لئے روٹی اور دودھ کو قبول کرلیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے کسی کو انگریزی بولتے ہوئے سنا اور مجھے شدید خواہش ہوئی کہ اسے سیکھوں۔ ان تین یا چار دنوں کی صحبت میں میں نے تیس انگریزی کے الفاظ سیکھے اور انہیں فارسی میں اپنی کاپی میں لکھ لیا۔ الفاظ کی یہ لسٹ اب تک میرے نوٹس کے بنڈل میں موجود ہے۔

ایک صبح کو جب میں واپس کیمپ گیا تو یہ دیکھ کر میری حیرانی کی انتہا نہیں رہی کہ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس جگہ پر کووں اور گدھوں کا جمگھٹا تھا اور سارا منظر بڑا ہی ہولناک

نظر آرہا تھا۔ کیمپ میں مجھے دور کچھ لوگ نظر آئے جو گھبراہٹ میں اپنے خیمے گرا رہے تھے اور اپنا سامان اونٹوں پر لاد رہے تھے۔ سامان زیادہ ہی تھا کیونکہ تکلیف سے اونٹ زور زور سے بلبلا رہے تھے۔ ان لوگوں سے معلوم ہوا کہ فوج مہدی پور کی طرف چلی گئی ہے جہاں انہیں ہلکر کی فوجوں سے مقابلہ متوقع ہے۔ یہ سن کر میں افسردہ واپس آیا اور خود کو بدقسمت تصور کیا جو ان جیسی مہمات میں حصہ لینے سے محروم ہے۔

اجین کا گورنر پیرا خاں اور دوسرے تمام سردار انگریزی سامان کو لوٹنے کے لئے بے چین تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس جنگ میں انگریزوں کو مار پڑے گی اور وہ شکست سے دوچار ہوں گے۔ ان کے علاوہ کرائے کے بدمعاشوں کی ٹولیاں کہ جنہیں اس لوٹ مار میں کچھ کھونے کا نہیں بلکہ کچھ حاصل کرنے کی امید تھی' وہ بھی شہر میں جمع ہوکر موقع کا انتظار کررہے تھے۔ صوبیدار اور اسکی پہلی بیوی کا بھائی جوکہ ایک بدمعاش لٹیرا تھا' وہ بھی انگریزوں کی شکست کا انتظار کررہے تھے۔ اس طرح تقریباً دس ہزار لوگوں کا مجمع تھا کہ جو شکست خوردہ انگریز فوج کو تباہ کرنے کے لئے تیار تھے۔ لیکن ان کی امیدیں اس وقت غارت ہوگئیں کہ جب توقعات کے برخلاف خبریں ملیں۔ ابتدا میں تو انہوں نے ان پر یقین کرنے سے انکار کردیا کیونکہ انہیں ہلکر کی فوج اور اس کی طاقت پر پورا پورا اعتماد تھا۔ ان کو معلوم نہ تھا کہ عین وقت پر نواب عبدالغفور خاں نے غداری کی اور اپنی فوج کو لے کر چلا گیا اور یہ اس وقت ہوا کہ جب بہادر اور وفادار روشن برگ جو ہلکر کی فوج میں کیپٹن جنرل تھا' وہ انگریزوں کو شکست دے رہا تھا۔ اس غداری اور بدنامی کا ٹیکہ عبدالغفور کے ماتھے پر اس وقت تک رہا کہ جب تک وہ زندہ رہا۔ اگرچہ اس نے غریبوں کی فیاضی سے مدد کرکے کوشش کی کہ اس بدنامی کے داغ کو مٹا دے۔ اس کے لڑکے غازی محمد خاں کو بھی لوگوں نے معاف نہیں کیا۔ اسے انگریزوں نے اپنی خدمات کے عوض جاورہ کا علاقہ دے دیا تھا۔

میں دسمبر 1817ء تک اپنی ماں کے ساتھ رہا۔ اس کے بعد میں نے خود کو تنہا اور بیکار محسوس کرنا شروع کردیا۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ صوبیدار کی اس روٹی کو کھاؤں کہ جو حرام کی کمائی سے ہوتی ہے۔ اسی زمانہ میں جب میں نے سنا کہ باجی راؤ کی حکومت ختم ہوگئی ہے۔ اور دکن میں جنگیں ہورہی ہیں۔ تو میں ان خبروں کو سن کر جنگوں میں حصہ لینے کے لئے بے چین ہوگیا۔ یہاں میں مناسب سمجھتا ہوں کہ کچھ باجی راؤ کے بارے میں بتاتا چلوں۔ یہ پیشوا کے خاندان کا آخری نمائندہ تھا۔ اس کی احمقانہ اور تنگ

نظر پالیسی کی وجہ سے اس نے اپنے انگریز اور مسلمان محسنوں کو اپنے خلاف کرلیا تھا۔ وہ یہ بالکل بھول گیا کہ انگریزوں کی وجہ سے وہ گدی نشین ہوا تھا اور مسلمانوں کی وجہ سے طاقت میں رہا تھا۔ اس نے مسلمانوں کو منع کردیا تھا کہ وہ صبح دس بجے تک اس کے سامنے نہیں آئیں تاکہ صبح صبح وہ ان کو دیکھ کر کسی نحوست کا شکار نہ ہو۔ اس کے علاوہ اس نے احکامات جاری کئے کہ کوئی مسلمان چاہے اس کا کوئی رتبہ یا عہدہ ہو' ان گلیوں سے نہ گزرے کہ جو اس کے محل سے نظر آتی ہیں۔ عقل مند اور طاقتور عیسائیوں کے ساتھ بھی اگرچہ یہ سلوک کیا گیا' مگر اس معاملہ میں انہوں نے اس کی حماقتوں پر زیادہ توجہ نہ دی' لیکن انہیں اس بات پر غصہ آیا کہ جب اس نے ان کی ہدایات پر عمل نہیں کیا اور ان کی مرضی کے مطابق فیصلے کرتے وقت ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

یہ جنوری 1818ء کی بات ہے کہ میں نے سنا کہ جنگ شروع ہونے والی ہے اس لئے مجھ میں یہ آروز پیدا ہوئی کہ میں کوئی ایسا موقع تلاش کروں کہ جس کی وجہ سے مجھے عزت و شہرت دونوں نصیب ہوسکیں۔ اس خواہش کو پورا کرنے کی غرض سے میں نے شہر میں ایسے قافلوں اور لوگوں کی تلاش شروع کردی کہ جن کے ذریعہ میں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرسکوں۔ ایک دن جبکہ میں ادھر ادھر آوارہ گردی کررہا تھا میں نے بیس اجنبی افغانوں اور ان کے جمعدار کو دیکھا کہ جو بظاہر بڑے مہذب اور اچھی طبیعت کے نظر آئے۔ یہ لوگ ایک بنئے کی دکان پر ٹھہرے ہوئے تھے جب میں ان کے قریب سے گزرا تو میں نے مسلمانوں کی عادت کے مطابق انہیں سلام کیا۔ ان کے جمعدار موسیٰ خان نے میرے سلام کا جواب بڑی گرمجوشی سے دیا اور مجھ سے درخواست کی کہ ان کے پاس بیٹھ کر حقہ وغیرہ سے شوق کروں۔ چونکہ میں بیکار تھا اس لئے میں نے اس کی دعوت خوشی سے قبول کرلی۔ اس کی گفتگو سے پتہ چلا کہ وہ پونا سے واپس چھٹیوں پر اپنے وطن جارہا ہے۔ اس پر میں نے اس سے پوچھا کہ وہ سفر پر کب روانہ ہورہے ہیں کیونکہ میں نے اس سے کہا کہ "میں بھی دکن جانے کی سوچ رہا ہوں تاکہ وہاں مجھے کوئی ملازمت مل سکے۔"

جمعدار نے کہا کہ وہ یہ جگہ کل فجر کی نماز کے بعد چھوڑ رہا ہے اور اگر میں تیار رہوں تو وہ مجھے دس روپیہ ماہانہ پر ملازم رکھنے پر تیار ہے۔ تنخواہ کے علاوہ میرا کھانا اور پینا ان کے ذمہ ہوگا بلکہ وہ میرے کپڑوں کا بھی خیال رکھے گا۔ میری ڈیوٹی ہوگی کہ اس کے بیس پٹھانوں کا حساب کتاب رکھوں اور اگر اس دوران میں مجھے اور کوئی اچھی ملازمت مل جائے تو میں جا سکتا ہوں۔ اس نے اصرار کیا کہ اس سلسلہ میں جلدی کوئی فیصلہ کروں۔

اس پر میں فوراً راضی ہوگیا اور اس کی تمام شرائط منظور کرلی اور اس سے وعدہ کیا کہ میں اگلی صبح جلدی معہ اسباب کے اس کے پاس آجاؤں گا۔

"سامان وغیرہ کچھ لانے کی ضرورت نہیں" اس نے کہا "کیونکہ ہمارے پاس بھی سوائے جانمازوں اور ہتھیاروں کے کچھ نہیں ہے لیکن اگر تم کچھ لانا پسند ہی کرتے ہو تو اسے اٹھانے کی ذمہ داری تمہاری ہوگی۔"

لہٰذا میں نے بھی یہ سوچا کہ اس مختصر سے سفر کے لئے کوئی ضروری نہیں کہ میں سامان اٹھا کر لاؤں اس لئے میں نے اسے کہہ دیا کہ میں سامان کے معاملہ میں اس قدر مختصر ہوں گا کہ جتنے اس کے آدمی بھی نہیں ہوں گے۔

میں خوشی خوشی گھر واپس آگیا۔ اپنی ساری چیزیں ایک بکس میں بند کرکے اس کی چابی خود رکھی اور اسے اپنی والدہ کے حوالے کیا کہ وہ اس کی حفاظت کریں۔ میں نے اپنے ارادہ کو کسی پر ظاہر نہیں کیا۔ کیونکہ مجھے خطرہ تھا کہ اگر اس کے بارے میں کسی کو بھی پتہ چل گیا تو وہ مجھے جانے سے روکیں گے۔ اس ساری رات میں بالکل بھی نہیں سوسکا اور میرے دماغ میں مستقبل کے سہانے منصوبے بنتے رہے۔ اس دوران میں مجھے تھوڑی دیر کے لئے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ میں اپنے آپ ایک ایسے خطرے میں ڈال رہا ہوں اور اس بدقسمتی سے دوچار ہونے والا ہوں کہ جس سے موت بدرجہا اچھی ہوتی ہے لیکن انسان کی قسمت میں جو لکھ دیا گیا ہوتا ہے وہ اس کے آگے بالکل بے بس ہوتا ہے۔ یہ کس کو پتہ ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ کل کیا پیش آنے والا ہے۔

سویرے سویرے جیسے ہی میں نے مرغ کی پہلی آواز سنی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وضو کرکے نماز پڑھی۔ اس کے بعد چادر، کندھے پر ڈالی۔ قلم، دوات اور کاغذات ساتھ لئے اور اپنے نئے دوست کے پاس پہنچ گیا۔ یہ لوگ تیار ہوکر چلنے ہی والے تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی خوشی کے نعرہ کے ساتھ میرا استقبال کیا اور موسیٰ کہنے لگا کہ "یہ تمہاری ملازمت کا پہلا دن ہے جو تم ہم بہادر لوگوں کے ساتھ گزارو گے۔ خدا سے دعا ہے تمہارے آنیوالے دن خوشگوار ہوں۔ ہم تمہیں تہہ دل سے خوش آمدید کہتے ہیں۔"

اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں نے نماز پڑھ لی ہے۔ اس کا اثبات میں جواب پا کر اس نے کہا کہ میں آگ کے قریب بیٹھ کر ان کے ہتھیاروں کی نگرانی کروں جب تک وہ نماز پڑھ کر واپس نہ آجائیں۔ میں نے جیسے ہی ان کی چیزوں کا چارج سنبھالا وہ نماز کے لئے قریبی مسجد میں چلے گئے۔ نماز پڑھ کر جب وہ واپس آئے تو انہوں نے ایک بار پھر سلام

کیا۔ اس کے بعد چند لمحوں میں سفر کے لئے تیار ہوگئے۔ سفر پر روانہ ہونے سے پہلے انہوں نے دعا پڑھی جس میں کامیابی اور نصرت کے لئے خدا سے دعا مانگی۔ اس کے بعد ہم سب روانہ ہوئے اور سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے شہر کے دروازے سے نکل گئے۔

ہم شہر سے جنوب مغرب کی سمت چلے اور اپنے بائیں طرف ہم نے اندور کے شہر کو راستہ میں چھوڑا اور اس کے بعد سے دن رات سفر کے ذریعہ برابر آگے بڑھتے رہے۔ ایک بات جو میں نہیں سمجھ سکا وہ یہ کہ انہوں نے راستہ میں کسی بھی بڑے شہر میں قیام نہیں کیا بلکہ رات میں ہم ہمیشہ چھوٹے گاؤں میں قیام کرتے اور وہاں سے کھانے پینے کا سامان خریدتے۔ رات کا کھانا ہم ہمیشہ تقریباً آٹھ بجے کھاتے تھے۔ کھانے میں روٹی' پیاز یا گڑ ہوتا تھا۔ جہاں تک ناشتہ کا سوال تھا تو یہ ہر ایک کی ذمہ داری تھی کہ وہ خود اس کا بندوبست کرے۔ دیکھا جائے تو میرا وقت ان لوگوں کی صحبت میں بڑا خوشگوار گزر رہا تھا۔ موسیٰ خان خصوصیت سے میرے آرام کا بڑا خیال رکھتا تھا۔

سفر کے چھٹے دن شام کو جب ہم اجین سے چلے تو ہم نے بھیلوں کے ایک گاؤں میں قیام کیا جوکہ پہاڑیوں کے دامن میں نربدا دریا کے کنارے واقع تھا۔ اس کے دونوں جانب مالوہ اور خاندیش کے صوبوں کی سرحدیں تھیں۔ جب میں نے سوال کیا کہ ہم سیدھا اور آسان راستہ چھوڑ کر آخر کیوں اس مشکل' دشوار اور پہاڑی راستہ سے جارہے ہیں تو میرے ساتھیوں نے جواب دیا کہ جامنیا کا درہ اگر مشکل ترین راستہ ہے اور تنگ بھی بہت ہے مگر موسیٰ خان اس کو اس لئے پسند کرتا ہے کہ یہ مانڈیشوار پہنچنے کا قریب ترین راستہ ہے جہاں سے نربدا دریا کو آسانی سے پار کیا جا سکتا ہے۔

دوسرے دن رات دو بجے کے قریب ہم پہاڑی علاقے میں داخل ہوگئے۔ ہم آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ ہمارے سامنے اندھیرا تھا اور عقب میں خطرناک آوازیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ موسیٰ خان اور اس کے آدمی اس راستہ سے بخوبی واقف ہیں۔ کیونکہ وہ پیچیدہ چڑھائیوں' خطرناک ڈھلوانوں اور ڈراؤنے آبشاروں سے آگاہ تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی شہری اپنے شہر کی پیچیدہ گلیوں اور راستوں سے۔

صبح کے وقت ہم ایک چشمے کے پاس ٹھہرے اور یہاں وضو کرکے نماز پڑھی۔ اس صبح اس قدر سردی تھی کہ ہمارے دانت بج رہے تھے مگر افغان شاید اس سردی کے عادی تھے مگر میرا یہ حال تھا کہ میرا پورا جسم سن ہوگیا تھا اور مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میرے پورے جسم میں برف بھر دی گئی ہو۔ نماز کے بعد موسیٰ خان نے آگ جلانے کا حکم دیا اور

ساتھ میں حقہ پینے کی بھی اجازت دی۔ ہم نے فوراً اس کے حکم کی تعمیل کی اور فوراً سوکھی لکڑیوں کو جن کی اس علاقے میں کمی نہ تھی جمع کرلیا۔ ایک افغان نے چقماق کے ذریعہ آگ سلگائی جس نے فوراً شعلوں کی شکل اختیار کرلی۔ آگ کی وجہ سے ہمیں یکدم آرام محسوس ہونے لگا۔

جب سورج ابھرنے لگا تو اس کی شعاعوں نے ہمیں آگ سے بے نیاز کردیا۔ ناشتہ کے بعد ایک مرتبہ اور حقہ پیا گیا اور اس کے بعد تازہ دم ہوکر ہم نے اپنا سفر تیزی کے ساتھ شروع کردیا۔ اگرچہ راستہ بڑا مشکل تھا مگر ہم درختوں کے تنوں میں سے ہوتے ہوئے ابھری ہوئی چٹانوں کی نوکوں کو پکڑتے ہوئے تنگ راستے سے آگے بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ شام کے پانچ بجے ہم ایک جگہ پہنچے تو تمام افغانوں نے خوشی کے نعرے لگاتے ہوئے کہا "خدا کا شکر ہے کہ ہم اپنے سفر کو ختم کرکے منزل مقصود پر پہنچ گئے۔"

میرے لئے یہ اچھنبے کی بات تھی کیونکہ نہ تو وہاں آبادی کا کوئی نام و نشان تھا اور نہ ہی دریا اور کشتی کے کوئی آثار تھے۔ اس لئے میں نے حیرانی سے موسیٰ خان سے پوچھا کہ ہم کہاں آگئے ہیں؟ میرے اس سوال پر اس نے تھوڑی دور وادی میں واقع جنگل کی طرف اشارہ کیا کہ جہاں چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں نظر آرہی تھیں۔

"یہ وہ جگہ ہے کہ جہاں میں ایک سال تک رہوں گا اور اس کے بعد اپنے وطن واپس لوٹوں گا" موسیٰ خان نے کہا۔

اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اسی وادی میں اس کا آقا جو بھیلوں کا سردار ہے وہ رہتا ہے۔ اس کا نام نادر ہے اور اس کے حکم پر عمل کرنے کے لئے پانچ سو کے قریب لوگ ہر وقت تیار رہتے ہیں اور میں اپنے افغان دوستوں کے ساتھ اس کی مدد کرتا ہوں۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم قافلوں اور کارروانوں کو لوٹتے ہیں۔ مال غنیمت جو حاصل ہوتا ہے اس کو تین حصوں میں تقسیم کردیا جاتا ہے۔ اس میں سے دو نادر لے لیتا ہے اور باقی ہم افغانوں کے حصہ میں آتا ہے۔ موسیٰ نے یہ بیان کرکے مجھ سے کہا کہ میں خاطر جمع رکھوں کیونکہ لوٹ مار کی مہمات میں وہ مجھے ساتھ نہیں لے کر جائیں گے۔ میرا کام یہ ہوگا کہ میں گھر پر رہوں اور ان کے سامان کی حفاظت کروں اور جہاں تک حساب کتاب رکھنے کا تعلق ہے تو اس کے لئے مجھے زیادہ وقت دینے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ شاید ایک مہینہ میں آدھ گھنٹہ۔

میں یہ سن کر تھوڑی دیر کے لئے خوف زدہ ہوکر رہ گیا اور میرا غصہ اچانک اس قدر بڑھا کہ میرا دل چاہا کہ اسے گالیاں دینا شروع کردوں جس کا مطلب تھا کہ میں اس کے بعد

مرنے کے لئے تیار رہوں لیکن میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے سوچا کہ جذباتی ہونے کے بجائے مجھے ٹھنڈے دل سے حالات پر غور کرنا ہوگا۔ اس لئے میں نے بناوٹی مسکراہٹ سے اس سے سوال کیا کہ "کیا ہم پونا بالکل نہیں جائیں گے؟"

"نہیں، کبھی نہیں" اس نے جواب دیا "وہاں جانے کا کیا فائدہ جبکہ ہم اپنا مقصد یہاں پر حاصل کرلیں گے۔"

"کوئی بات نہیں" میں نے جواب دیا "چونکہ میں نے تمہاری ملازمت اختیار کرلی ہے تو میں ایک سال تمہارے ساتھ رہ کر خود کو تمہارے لئے مفید بنانے کی کوشش کروں گا۔ اس کے بعد میں دیکھوں گا کہ قسمت میرے لئے کیا فیصلہ کرتی ہے۔"

اس کے بعد ہم اپنے میزبان کی رہائش گاہ کے قریب پہنچے اور اطلاع دینے کی غرض سے بندوق سے تین بار فائر کیا گیا جس کی آواز وادی میں گونجتی رہی۔ اس کے جواب میں ہمیں بھیلوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں آئیں اور تھوڑی دیر بعد ہی ہم نیم برہنہ بھیلوں کے درمیان میں تھے جو کہ تیرکمان سے مسلح تھے۔ ان کی کمانیں بانسوں کے درخت کی لکڑی سے بنی ہوئی تھیں جبکہ تیر عام تیروں کی طرح ہی تھے۔

ان میں سے ایک آدمی آگے بڑھا کہ جس کی آنکھیں غصہ سے سرخ ہورہی تھیں۔ اس نے دھمکانے والے انداز میں ہم سے مخاطب ہوکر پوچھا "تم کون لوگ ہو کہ جو رضاکارانہ طور پر موت کے منہ میں چلے آئے ہو۔"

"کیوں کالیا! تم نے مجھے نہیں پہچانا" موسیٰ خان نے کہا۔

بھیل نے موسیٰ خان کی آواز کو پہچان لیا اور اس کے بعد وہ اور دوسرے بھیل یہ کہتے ہوئے ہماری طرف بڑھے کہ "اے موسیٰ رے اپنو رپ نہیں" یعنی یہ ہمارا موسیٰ ہے کوئی دشمن نہیں ہے۔ اس کے بعد ہم سب ان مقامی ڈاکوؤں کے ساتھ گھل مل گئے اور میں نے اندازہ لگا لیا کہ موسیٰ اور کالیا جس دوستانہ انداز میں بات چیت کررہے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے پرانے تعلقات ہیں۔

رات ہوتے ہوتے ہم غار کے دہانے کے قریب پہنچ گئے۔ وہاں پر ہم نے دیکھا کہ ایک کالا بھجنگ آدمی آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوا ہے۔ وہ بھی اسی طرح سے نیم برہنہ تھا جیسے کے دوسرے بھیل لیکن اس کے ہاتھوں میں موٹا سونے کا کنگن تھا۔ اس کے سامنے تلوار پڑی ہوئی تھی اور ساتھ میں تیر و کمان تھے۔ وہ بھیلوں کے درمیان بیٹھا ہوا تھا اور اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان بھیل ڈاکوؤں کا سردار ہے۔

موسیٰ نے اسے دیکھ کر سلام کیا اور کہنے لگا "یہ نادر بھائی ہیں، جنگل کے شہزادے۔ ان کو آداب کر کے تم لوگ گھر جاؤ۔ میں تھوڑی دیر بعد تمہارے پاس آتا ہوں۔"

ہمیں دیکھ کر سردار کھڑا ہوگیا۔ ہمارے سلام کا جواب دے کر وہ موسیٰ کی طرف متوجہ ہوا اور پھر دونوں مل کر بیٹھ گئے۔ اسکے بعد ہماری جماعت اپنے ان گھروں کی جانب روانہ ہوئی کہ جن میں انہیں اب رہنا تھا۔ وہ اس جگہ سے بخوبی واقف تھے اسی لئے انہیں کسی رہنمائی کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اس عرصہ میں میں جس صورتحال سے دوچار تھا اس میں مایوسی، نفرت، غصہ سب ہی شامل تھے اور میری خواہشات اور امنگیں ان حالات میں کبھی کی ختم ہو چکی تھیں۔ ہمارے گھروں کی جگہ اگرچہ آدھے میل کے قریب ہوگی مگر مجھے ایسی تھکاوٹ ہوئی جیسی کہ میں سو میل کے قریب چل کر آیا ہوں۔ ہمارے گھر پہاڑی کی ابھری ہوئی چٹانوں کی پشت میں بنے ہوئے تھے۔ یہ درختوں کے تنوں سے بنائے ہوئے تھے۔ اس کے تین جانب بانسوں کی مضبوط دیوار تھی اور سامنے کا حصہ کھلا ہوا تھا۔ دو بڑے برآمدے تھے اور ہر ایک کے ساتھ تین تین کمرے تھے جوکہ بانسوں کی بنی چکوں سے علیحدہ کئے ہوئے تھے۔

یہاں تک پہنچتے پہنچتے افغان بھی تھک کر چور ہوگئے، اس لئے انہوں نے اپنی بندوقوں کو برآمدوں میں لٹکایا اور ہر ایک علیحدہ علیحدہ کمروں میں جاکر چارپائیوں پر سو گیا۔ میں نے بھی اپنے ساتھیوں کی مانند اس بات کی کوشش کی کہ فوراً سو جاؤں تاکہ جو جسمانی اور ذہنی تھکن ہے اس سے مجھے افاقہ ہو جائے لیکن سونے کے بجائے میرا ذہن پریشانی کے عالم میں سوچنے لگا کہ "آخر میں نے کیوں بلاتحقیق ان قاتل لوگوں کی جماعت کے ساتھ آنا پسند کیا؟ میں ایک مہینہ اور اپنے مہربان والدین کے ساتھ رہ کر کسی اور قافلہ کا انتظار کر سکتا تھا۔ یہ میرے تجربے کی کمی ہے، یا میری حماقت کہ میں ہمیشہ بدقسمتی کا شکار ہوتا ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ موسیٰ نے میرے ساتھ دھوکا کیا مگر ڈاکو کے لئے دھوکہ کرنا تو ایک مذاق ہوتا ہی ہے لیکن دیکھا جائے تو قصور میرا ہے کہ میں اس کے فریب میں آیا۔ میری عمر اب اٹھارہ سال کی ہے اور مجھ میں اچھے و برے کی پہچان ہونی چاہیے۔"

میں نے خود کو انتہائی مجبور اور لاچار پایا اور جیساکہ ان حالات میں ہوتا ہے، میں نے آنکھیں اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا اور دعا کے طور پر ہاتھ اٹھا کر خدا سے یہ دعا مانگی "اے رحیم و کریم تو کب تک مجھے اس عذاب میں مبتلا رکھے گا؟ کیا یہ میری قسمت میں لکھ دیا گیا ہے کہ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان ڈاکوؤں، قاتلوں اور لٹیروں کے ساتھ رہوں۔ اے

مالک ارض و سماء کیا میں اپنے خاندان کے نام کو بے عزت کرنے کے لئے پیدا ہوا ہوں؟ اگر ایسا ہی ہے تو میرے خدا مجھ پر رحم کر اور اسی وقت میری زندگی کا خاتمہ کر دے۔ آمین" جب میں یہ دعا مانگ رہا تھا میرے آنسو خودبخود آنکھوں سے نکلتے میرے گالوں سے ٹپک رہے تھے۔ اس کے ساتھ ایک دوسرا خیال میرے ذہن میں آیا اور اس نے مجھے میرے جرائم و گناہوں سے چھٹکارا دلانا چاہا۔ میں سوچنے لگا کہ "اس میں میرا کیا قصور ہے کہ میں نے ان لوگوں پر اعتبار کیا۔ میرے نزدیک تو یہ انسان تھے اور اگر یہ انسان کے بجائے ڈاکو اور قاتل تھے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر تو نہیں آتی۔"

رات کو آٹھ بجے کے قریب موسیٰ واپس گھر آیا۔ اس نے آتے ہی ہمیں آواز دی اور ہم سب لوگ بھاگے ہوئے اس کے پاس پہنچے۔ ہم نے بڑی حیرت اور مسرت سے دیکھا کہ اس کے ساتھ کچھ بھیل بڑی مقدار میں ہمارے کھانے کے لئے دودھ، شکر، پانی اور روٹیاں لے کر آرہے ہیں۔ بھوک اور تھکن کی حالت میں ان اشیاء کو بڑی نعمت سمجھا گیا اور سب نے مل کر موسیٰ کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد ہم نے وضو کیا اور مغرب و عشاء کی نمازیں ایک ساتھ پڑھیں۔ کھانے کے بعد سب سونے چلے گئے، سوائے دو سنتریوں کے، جنہیں حفاظت کی غرض سے چھوڑ دیا گیا۔ ان میں سے ایک برآمدے میں ٹھہرا جبکہ دوسرا ایک اونچے درخت پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ چونکہ تمام لوگ تھکے ہوئے تھے، اس لئے مجھ سمیت سب ہی سو گئے۔ میرا خیال ہے کہ میں ان سب میں زیادہ گہری نیند سویا، کیونکہ صبح کے وقت میں خود سے نہیں اٹھا، بلکہ میرے شانوں کو ہلا کر مجھے بیدار کیا گیا۔

اٹھنے کے بعد میں نے سوچا کہ بہتر یہ ہے کہ میں اپنی ساری پریشانیوں کو بھول جاؤں اور اپنے ماحول اور وہاں کے رہنے والوں سے واقفیت پیدا کروں۔ لٰہذا میں کبھی کبھی تنہا درخت کے نیچے بیٹھ جاتا اور سوچ و فکر میں ڈوب جاتا۔ کبھی کبھی میں اپنے افغان دوستوں، (جوکہ عوام کے دشمن تھے) سے بات چیت میں مصروف ہو جاتا۔ اسی دوران لوٹ مار اور مسافروں کی قتل و غارت گری کا سلسلہ نادر اور اس کے بھیلوں کے تعاون سے جاری رہا۔ یہ لوگ نہ صرف قافلوں اور کاروانوں کو لوٹتے تھے، بلکہ موقع ملتا تو قریبی گاؤں اور قصبوں میں بھی جاکر تباہی پھیلاتے تھے۔ ان کا دستور تھا کہ لڑائی یا لوٹ مار کے دوران اگر ان کا کوئی ساتھی زخمی ہو جاتا اور اس قابل نہ ہوتا کہ ان کے ساتھ بھاگ سکے تو یہ خود اس کا سر کاٹ کر یا تو اسے جلا دیتے تھے یا دفن کر دیتے تھے تاکہ وہ گرفتار ہوکر کہیں ان کے راز نہ اگل دے۔

ہمارے آنے کے بعد ان کی ڈاکہ زنی کی وارداتوں میں اضافہ ہوگیا۔ مہینہ میں دو یا تین مرتبہ 15 افغانوں کو حکم دیا جاتا کہ وہ مقامی ڈاکوؤں کے ہمراہ مہم پر جائیں۔ اگر وہ دروں کے آس پاس کوئی ایسا مسافر' کہ جس کے پاس مال و دولت ہو' نہ ملتا تو اس صورت میں افغان قریبی قصبوں اور گاؤں کا رخ کرتے تھے' جبکہ بھیل دروں میں یا جنگلوں میں چھپ کر ان کے آنے کا انتظار کرتے تھے۔ اکثر یہ افغان قافلوں کو بہکا کر اپنے ساتھ لاتے تھے اور جب خفیہ مقام پر' کہ جہاں بھیل چھپے ہوتے تھے' پہنچتے تو انہیں خفیہ اشارہ کرتے۔ اس پر بھیلوں اور افغانوں میں ایک جھوٹی اور دکھاوے کی لڑائی ہوتی' جس میں افغان شکست کھا کر بھاگ جاتے۔ اس کے بعد بھیل مسافروں کا سامان چھین کر' ان کے کپڑے تک اتروا لیتے تھے۔ ان کے پاس صرف اتنا کپڑا بچتا کہ جس سے وہ اپنی برہنگی چھپا سکیں۔ اس کے بعد انہیں وہاں سے جانے کی اجازت ملتی۔ اگر یہ مسافر ذرا بھی مزاحمت کرتے تو اس کے نتیجے میں یا تو یہ زخمی ہو جاتے یا جان سے ہاتھ دھونے پڑتے۔ یہ وہ کرتوت تھے کہ جن کا تذکرہ میرے افغان ساتھی مجھ سے فخریہ بیان کرتے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے خود کبھی اپنی آنکھوں سے یہ دہشت ناک مناظر نہیں دیکھے لیکن یہ ضرور ہوا کہ بار بار ان واقعات کو سن کر میرے دل پر کچوکے لگتے رہے۔

جب وہ چوتھے حملے کے بعد واپس آئے' تو اس مرتبہ لوٹ کے مال کے ساتھ ان کے چار ساتھیوں کے سر بھی تھے۔ ان میں سے تین بھیلوں کے تھے اور ایک نوجوان افغان کا' جس کا نام دارا تھا۔ یہ تینوں قافلے کے حفاظتی دستے کے ہاتھوں اس بری طرح زخمی ہوگئے تھے کہ ان کے لئے اپنے ساتھیوں کے ساتھ چلنا ناممکن ہوگیا تھا' اس لئے ان کے دوستوں کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ ان کے سر جسموں سے جدا کردیے جائیں۔ ہم نے دارا کے سر کو اپنی رسم کے مطابق دفن کردیا اور افسوس یہ ہے کہ اس غریب کو پھر کبھی کسی نے یاد نہیں کیا۔

میرا غصہ' ناراضگی اور نفرت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ میں اسے الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا' لیکن میری اپنی بچت اسی میں تھی کہ میں اپنے خیالات کو چھپائے رکھوں اور منافقت کے ساتھ اپنے ساتھیوں کے سامنے مسکراتا رہوں۔

میرا دستور تھا کہ میں صبح چار بجے سو کر اٹھ جایا کرتا تھا اور ایک خاموش جگہ پر واقع چشمے پر جاکر وضو کرتا اور نماز پڑھتا۔ اس کے بعد واپس آکر میں موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ ناشتہ کرتا۔ اس کے ایک گھنٹہ بعد میں اپنی غلیل کے ساتھ' جو ایک

بھیل نے مجھے تحفے کے طور پر دی تھی، جنگل میں چلا جاتا۔ وہاں میں اپنا وقت یا تو چڑیوں اور چھوٹے پرندوں کو مارنے میں گزارتا یا کسی درخت کے سائے میں خاموشی سے بیٹھ جاتا اور اپنی پریشان کن صورتحال پر غور کرتا۔ اسی طرح سے چار مہینے گزر گئے، جو کہ حقیقت میں مجھے چار سال معلوم ہوئے۔ میں نے سوچا کہ آٹھ مہینے اور مجھے اسی طرح گزارنا ہوں گے، تب جاکر میں اس قید سے رہا ہوں گا۔

ہمارے ساتھیوں کی آٹھویں مہم بہت ہی کامیاب رہی اور ہر افغان سونے، چاندی، زیورات اور سکوں سے لدا ہوا واپس آیا اور رات کو اس مال کی سب میں تقسیم ہوئی، جس کی وجہ سے جمعدار اور اس کی جماعت کو بڑا مال مل گیا۔ چاندی کی دو پازیب، ایک سونے کی چوڑی اور تیس روپے نقد، جو سب ملا کر چار سو روپے کے برابر ہوں گے، میرے حصے میں آئے۔ میں نے جمعدار کا اس پر شکریہ ادا کیا اور اپنا یہ مال کمرے میں دفن کردیا۔ میرے حصے میں جو مال آیا، اس نے اگرچہ میرے دل میں لالچ کو پیدا کیا، لیکن فوراً ہی یہ خوشی دور ہوگئی کیونکہ اس لوٹے ہوئے مال سے مجھے وہ مسرت نہیں ہوئی جو کہ انسان محنت کرکے قانونی طور پر حاصل کرتا ہے۔

جب افغانوں کو یہ مال مل گیا تو اب ان کی خواہش ہوئی کہ وہ بھیل سردار سے رخصت لے کر چند مہینوں کے لئے اپنے گھر ہو آئیں۔ موسیٰ نے یہ درخواست ساتھیوں کی طرف سے کی اور بھیل سردار نے اسے فوراً منظور کرلیا۔ بھیل سردار نے کہا کہ چونکہ موسیٰ اور اس کے ساتھی چھ مہینے کے لئے جارہے ہیں، اس لئے وہ چاہتا ہے کہ ان کے جانے سے پہلے انہیں تین دن تک دعوت دے۔ فوراً ہی اس نے اپنے بھیل پیروکاروں سے کہا کہ وہ دعوت کی تیاری کریں۔

موسیٰ نے واپس آکر جب یہ خبر اپنے ساتھیوں کو سنائی تو انہوں نے اس پر خوشی کا اظہار کیا اور میں سچ بتاؤں کہ اس خبر سے میں بھی بڑا خوش ہوا کیونکہ ایک لحاظ سے یہ میری آزادی کی خبر تھی۔ تین دن تک دعوت کے طور پر افیم، بھنگ سادہ اور مٹھاس کے ساتھ، مٹھائیاں اور ایک موٹا دنبہ بھیلوں کی طرف سے بھیجا گیا۔ افغان، جو مہمات کے بعد خود کو آزاد اور بے فکر محسوس کرتے تھے، انہوں نے کھانے اور نشہ آور چیزوں کا خوب استعمال کیا۔ وہ ہر رات کچھ دیر تک کھانے کے بعد بھیلوں کا ناچ دیکھتے رہے اور ان کے گانے سنتے رہے۔

ہمارے ساتھی تین دن تک دعوت کے کھانوں میں مصروف رہے اور اب انہیں امید

تھی کہ چوتھی رات کی دعوت' جو آخری تھی' اس کے بعد انہیں جانے کی اجازت مل جائے گی۔ دعوت کی صبح کو میں جلدی بیدار ہوگیا اور اس چشمے کی جانب چلا گیا کہ جہاں میں وضو کرتا تھا۔ نماز سے فارغ ہو کر میں بیٹھ کر آنے والے دنوں کے بارے میں سوچنے لگا کہ جب میں آزاد ہو جاؤں گا اور مہذب دنیا میں واپس چلا جاؤں گا' اور ان ڈاکوؤں اور لٹیروں سے چھٹکارا پا لوں گا' لیکن میں نے ایک عجیب چیز محسوس کی کہ ان خیالات نے خوش کرنے کے بجائے مجھے اداس کردیا۔ مجھے پتہ نہیں ایسا کیوں ہوا؟ صبح کے سہانے وقت میں بجائے اس کے کہ میں خوش ہوتا' میرا دل بیٹھنے لگا۔ لیکن میں نے ان باتوں پر زیادہ دھیان نہیں دیا اور آہستہ آہستہ اپنی رہائش گاہ کی جانب چلا۔ جب میں اس جگہ کے قریب پہنچا تو میں نے اچانک چیخنے' چلانے اور ایسی آوازیں سنیں کہ جیسے قصائی جانوروں کو ذبح کررہے ہوں۔ اس کے بعد دردناک آوازیں آئیں جو دب کر سسکیاں بن گئیں۔ یہ سن کر میں تھوڑی دیر کے لئے رک گیا اور سوچنے لگا کہ شاید یہ بھیڑوں کی آواز ہو کہ جنہیں ہماری دعوت کے لئے ذبح کیا جارہا ہو' لیکن پھر میں مںے سوچا کہ ان دہشت ناک چیخوں کا کیا مطلب ہے؟ اس صورتحال میں ہوا یہ کہ میں جو آگے جارہا تھا' اس کے بجائے پیچھے کی جانب بھاگنے لگا۔ تھوڑی دیر میں' میں نے حیرانی اور خوف کے عالم میں دیکھا کہ ایک افغان' کہ جسکے سر سے خون بہہ رہا تھا اور جس کا لباس اس سے سرخ ہوگیا تھا' وہ بھاگا ہوا آرہا ہے۔

اسے دیکھ کر میں اس کی جانب بھاگا اور اس سے پوچھا "ابراہیم خاں کیا بات ہے؟" اس پر اس نے جواب دیا "ہم سب ختم ہوگئے' بھیلوں نے تمام افغانوں کو قتل کردیا ہے۔ میں نے اپنے سر کو بچاتے ہوئے' دیکھو' تین انگلیاں کٹوا دی ہیں۔ میرے زخم اس قدر گہرے نہیں ہیں' لیکن موت سے بچنے کی خاطر میں بھاگا جارہا ہوں۔ تم میرے پیچھے مت آنا' وہ شاید میرا پیچھا کریں اور پکڑ لیں۔ تم خود بھاگ جاؤ اور اپنی جان بچاؤ۔"

"خدا حافظ ابراہیم" میں نے کہا "خدا تمہاری حفاظت کرے۔"

یہ کہتے ہوئے میں ایک گھوڑے کی سی تیز رفتاری سے شمال کی جانب دو گھنٹے تک دوڑتا رہا۔ اس عرصہ میں میں نے بالکل' پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور نوکیلی چٹانوں' کھڈوں اور اونچے و نیچے راستوں و ڈھلوانوں پر سے ہوتا ہوا بھاگتا چلا گیا۔ کبھی کبھی میں اس قدر بلندی پر چلا جاتا تھا کہ بادل میرے نیچے ہوتے تھے اور کبھی بالکل پستی کی جانب گہرائی میں۔ اس قدر دوڑنے کی وجہ سے میں بالکل تھک کر چور ہوگیا اور جب میں ہلنے کے قابل ہی نہیں

رہا تو تازہ دم ہونے کے لئے ایک درخت کے سایہ میں لیٹ گیا۔ بھوک اور پیاس نے مجھے مزید نڈھال کردیا۔ اس وقت تک مجھے پتہ نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں؟ اس وقت میری یہ حالت تھی کہ اگر ہوا یا کسی جانور کے چلنے سے اگر پتے ذرا بھی کھڑکھڑاتے تھے تو میں سہم کر رہ جاتا تھا۔ میں اس خیال سے لرز کر رہ جاتا تھا کہ وہ قاتل مجھے پکڑ کر مار ڈالیں گے۔

آدھ گھنٹے آرام کرنے کے بعد میں نے اپنا سفر دوبارہ سے شروع کردیا۔ اگرچہ اس بار میں اپنی پہلی والی رفتار تو برقرار نہیں رکھ سکا۔ میں پہاڑوں کی خاموشی اور گھنے جنگلوں کے درمیان سورج غروب ہونے تک چلتا رہا اور جب کبھی میں تھک جاتا اور چلنے کے قابل نہیں ہوتا تو اس صورت میں رک کر تھوڑا سا آرام کرلیتا تھا۔ اس دوران میں' میں نے نیچے گرے ہوئے بیروں سے اپنی بھوک کی شدت کو مٹایا۔ اگرچہ وہ میری بھوک کا پوری طرح تو ازالہ نہیں کرسکے۔ میرا خیال ہے کہ دہشت کی وجہ سے میرا معدہ خراب ہوگیا تھا اور میں کچھ ہضم نہیں کرپا رہا تھا۔ خوش قسمتی سے میرے پاس غلیل رہ گئی تھی' جس سے میں نے کوشش کرکے چھوٹے پرندوں کو مارنا چاہا مگر مجھے اس میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔

اندھیرا ہونے پر مجھے اطمینان ہوا۔ میں نے سوچا کہ "رات کی تاریکی' مادرانہ شفقت کے ساتھ مجھے اپنی حفاظت میں لے لے گی۔" لیکن ساتھ میں یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں کوئی وحشی جانور میرے ٹکڑے ٹکڑے نہ کردے۔ مجھے دور نزدیک تک کسی آبادی کا کوئی نام و نشان بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ پورے دن کے سفر کے دوران مجھے کسی انسانی قدم کے نشانات تک نظر نہیں آئے۔ میں نے سوچا کہ میرا بستر کہاں ہے کہ جس پر میں آرام کرسکوں؟ میرے دوست کہاں ہیں؟ کیا کوئی نہیں کہ جو اس اکیلے پن میں میری مدد کرے؟ کیا میں اس قابل ہوسکوں گا کہ دوبارہ سے مہذب دنیا کو دیکھ سکوں؟ ان خیالات میں غرق میں ایک چشمہ میں بہتے پانی کو دیکھ رہا تھا۔ اگرچہ امید نے ان حالات میں بھی میرا ساتھ نہیں چھوڑا تھا مگر میرا ڈر اپنی جگہ موجود تھا۔ یہ ڈر کہ یا تو میں قتل کردیا جاؤں گا یا کسی جانور کے منہ کا نوالہ بنوں گا۔ میرے دل میں پوری طرح سے موجود تھا۔ ان برے خیالوں سے بچنے کے لئے میں ایک اونچے درخت پر چڑھا اور اس کی ایک شاخ پر بیٹھ کر سوچ میں غرق ہوگیا۔ چاروں طرف گہری خاموشی تھی۔ جو کبھی کبھی جانوروں کے بولنے سے ٹوٹ جاتی تھی۔ جب میں نے نظریں اٹھا کر آسمان کو دیکھا تو وہاں صاف و شفاف نیلے آسمان پر چمکتے ستاروں کو دیکھ کر میں خدا کی قدرت کا قائل ہوگیا۔ اس دوران مشرق سے چاند اس طرح سے ابھرنا شروع ہوا جیسے کہ سونے کا پہاڑ آہستہ آہستہ ابھر رہا ہو۔ اس کی روشنی سے قریب کے تمام

پہاڑ چمک اٹھے۔ اس کے ساتھ ہی میرے قرب و جوار کا منظر ہی بدل گیا۔ پہاڑ سرسبز درختوں میں گھرے ہوئے ایسے معلوم ہورہے تھے کہ وہ محلات و ایوانات ہوں کہ جن کے سامنے ہرے بھرے باغات ہوں۔ میرے تخیلات کے بنائے ہوئے یہ محلات' چاند کی شفاف روشنی' تازہ ہوا جوکہ پھولوں کی خوشبو سے بھری ہوئی تھی' ان سب نے مل کر مجھ پر ایسا نشہ طاری کردیا کہ میں فوراً وہیں پر سو گیا۔ خواب میں نے دیکھا کہ میں شاندار باغ میں حوروں اور غلمان کے ساتھ چہل قدمی کررہا ہوں۔ میں خواب سے اچانک اس وقت بیدار ہوگیا کہ جب میں نے اپنی پیٹھ اور سر پر ایک دھچکہ محسوس کیا جس کی وجہ سے میں دوبارہ سے ہوش و حواس میں آگیا۔ میں نے دیکھا کہ میں درخت کے نیچے پڑا ہوا ہوں تھوڑی دیر کے لئے تو میں حرکت کرنے کے بھی قابل نہ تھا' مگر پھر میری حالت بہتر ہوئی۔ خوش قسمتی سے جس درخت سے میں گرا تھا وہ ریتلی زمین پر تھا۔ اس لئے اگرچہ میرے چوٹ تو لگی' مگر اس قدر نہیں کہ میں چل پھر نہ سکوں۔ میں دوبارہ سے درخت پر چڑھا اور اس بار خود کو اپنی پگڑی سے ایک شاخ سے کس کر باندھ لیا' اور پھر گھوڑے بیچ کر سو گیا۔

یہاں میں قارئین کی توجہ اس بات کی طرف دلاؤں کہ ہم ایشیائی لوگوں کا لباس یورپیوں کے تنگ اور کئی حصوں میں بٹے سے لباس سے کس قدر بہتر ہوتا ہے۔ یورپی لباس صرف جسم کو ڈھانپنے کے کام آتا ہے' لیکن ہمارا چغہ یا قبا لباس کے علاوہ اگر ضرورت پڑے تو بستر کا کام بھی دیتی ہے۔ ہماری چادر رات کو اوڑھنے کے بھی کام کرتی ہے' اور اسے دن میں سورج کی روشنی سے بچنے کے لئے بطور خیمہ بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ہماری پگڑی لباس کا سب سے اہم حصہ ہے اور ہر صورت میں یورپی ٹوپی سے لاکھ درجہ بہتر ہے۔ یہ انسانی سر کا سب سے خوبصورت لباس ہے اور اسے سورج کی تمازت بچاتا ہے۔ یورپی ہیٹ اس کے مقابلہ میں سورج کی روشنی کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ پگڑی پیاسے مسافروں کو پانی فراہم کرنے کا بہترین ذریعہ ہے جبکہ وہ صحرا یا جنگل میں سفر کررہا ہوں اور پانی کے لئے گہرے کنویں کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہ ہو' ایسے موقع کو پگڑی کو کنویں میں ڈال کر آسانی سے پانی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اگر پگڑی سلک کی ہو تو یہ سر کو تلوار کی کاٹ سے بچاتی ہے۔ اگر کوئی زخمی ہو جائے تو اس کے زخموں کے لئے پٹی کا کام کرتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کے اور بھی بہت سے فائدہ ہیں کہ جن کو اگر بیان کیا جائے تو اس میں وقت اور جگہ دونوں کا بے جا استعمال ہوگا۔

صبح کے وقت چڑیوں کی خوبصورت چہچہاہٹ نے مجھے بیدار کیا۔ اٹھنے کے بعد میں نے

خود کو انتہائی تروتازہ محسوس کیا۔ لیکن میرے جوڑ درد کررہے تھے اور حرکت کرتے ہوئے مجھے تکلیف ہوتی تھی۔ میں نے اس بلندوبالا جگہ سے اتر کر ایک اچھے مسلمان کی طرح ایک چشمہ کے پانی سے وضو کیا اور نماز پڑھ کر شمال کی سمت ہی میں اپنا سفر جاری رکھا۔ ابتداء میں تو کل والی چستی و چالاکی تو نہیں تھی' لیکن جب میں آدھے میل کے قریب چلا ہوں گا تو میرے جسم کی سختی ختم ہوگئی اور میری رگوں میں دوبارہ سے نئی قوت آگئی۔ قارئین! یقین کیجئے کہ اس سفر میں مجھے جو مشکلات درپیش آئیں وہ ناقابل یقین ہیں کیونکہ بغیر کسی شاہراہ یا راستہ کے' یا کسی انسانی قدموں کے نشانات کے میں چلتا رہا۔ لیکن بہرحال یہ حقیقت ہے کہ میرے آگے جانے کا راستہ اس سے زیادہ مشکل تھا جتنا کے میں چل کر آیا تھا۔

میں اپنی پریشان حالی کو مختصر کرتے ہوئے یہ بتاتا ہوں کہ میں نے چار دن سورج کی راہبری میں راستہ طے کیا اور چار راتوں میں درخت کے اوپر سویا' سوتے وقت میں پہلے کی طرح خود کو اپنی پگڑی کے ذریعہ شاخ سے باندھ لیتا تھا تاکہ گروں نہیں۔ میرے کھانے میں بیریا گولر تھے۔ اس عرصہ میں' میں نے تین چڑیاں اور ایک طوطا مارا اور ان کا گوشت کھایا جو مجھے لذیذ لگا۔ اگرچہ طوطے کا گوشت کھانا ہمارے مذہب میں حرام ہے مگر بھوک کی شدت نے مجھے اس کے کھانے پر مجبور کردیا۔ پانچویں دن صبح وقت' پہاڑی کی ایک چوٹی سے میں نے ایک میل کے فاصلہ پر کچھ بھیل عورتوں اور مردوں کو دیکھا کہ جن کے سروں پر آگ جلانے کے لئے لکڑی کے بنڈل رکھے ہوئے تھے۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ کسی آبادی میں اس لکڑی کو فروخت کرنے جارہے ہیں۔ میں ان کی طرف اس قدر تیزی سے کہ جس قدر ممکن تھا بھاگا اور ان غریب لوگوں کی جماعت کو نو بجے کے قریب جاکر جا لیا۔ اس وقت وہ ایک کنویں کے پاس بیٹھے ہوئے خود کو تازہ دم کررہے تھے۔ انسان کو انسان کے لئے محبت اس وقت معلوم ہوتی ہے کہ جب وہ ویرانوں میں تنہا ہو۔ اس لئے جیسے ہی میں نے انہیں دیکھا میں ان کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ اس وقت میں یہ بھی بھول گیا کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جو مہذب دنیا کے لئے خطرہ ہیں۔ اگرچہ وہ انتہائی بری حالت میں تھے۔ لیکن ان کی تعداد اتنی تھی کہ اگر وہ چاہتے تھے تو اس دنیا سے میرے وجود کا خاتمہ کر سکتے تھے۔ جس طرح سے سانپ چاہے کسی قدر پتلا کیوں نہ ہو' زہریلا ہوتا ہے۔ لیکن میں ان کے بے انتہا قریب آچکا تھا اس لئے اب وہاں واپس جانا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس لئے ان کے قریب پہنچتے ہوئے میں سوچا کہ ان سے سوال پوچھا جائے کہ یہاں سے گاؤں کتنی

پہاڑ چمک اٹھے۔ اس کے ساتھ ہی میرے قرب و جوار کا منظر ہی بدل گیا۔ پہاڑ سرسبز درختوں میں گھرے ہوئے ایسے معلوم ہو رہے تھے کہ وہ محلات و ایوانات ہوں کہ جن کے سامنے ہرے بھرے باغات ہوں۔ میرے تخیلات کے بنائے ہوئے یہ محلات' چاند کی شفاف روشنی' تازہ ہوا جو کہ پھولوں کی خوشبو سے بھری ہوئی تھی' ان سب نے مل کر مجھ پر ایسا نشہ طاری کردیا کہ میں فوراً وہیں پر سو گیا۔ خواب میں نے دیکھا کہ میں شاندار باغ میں حوروں اور غلمان کے ساتھ چہل قدمی کررہا ہوں۔ میں خواب سے اچانک اس وقت بیدار ہوگیا کہ جب میں نے اپنی پیٹھ اور سر پر ایک دھچکہ محسوس کیا جس کی وجہ سے میں دوبارہ سے ہوش و حواس میں آگیا۔ میں نے دیکھا کہ میں درخت کے نیچے پڑا ہوا ہوں تھوڑی دیر کے لئے تو میں حرکت کرنے کے بھی قابل نہ تھا' مگر پھر میری حالت بہتر ہوئی۔ خوش قسمتی سے جس درخت سے میں گرا تھا وہ ریتلی زمین پر تھا۔ اس لئے اگرچہ میرے چوٹ تو لگی' مگر اس قدر نہیں کہ میں چل پھر نہ سکوں۔ میں دوبارہ سے درخت پر چڑھا اور اس بار خود کو اپنی پگڑی سے ایک شاخ سے کس کر باندھ لیا' اور پھر گھوڑے بیچ کر سو گیا۔

یہاں میں قارئین کی توجہ اس بات کی طرف دلاؤں کہ ہم ایشیائی لوگوں کا لباس یورپیوں کے تنگ اور کئی حصوں میں بٹے سے لباس سے کس قدر بہتر ہوتا ہے۔ یورپی لباس صرف جسم کو ڈھانکنے کے کام آتا ہے' لیکن ہمارا چغہ یا قبا لباس کے علاوہ اگر ضرورت پڑے تو بستر کا کام بھی دیتی ہے۔ ہماری چادر رات کو اوڑھنے کے بھی کام کرتی ہے' اور اسے دن میں سورج کی روشنی سے بچنے کے لئے بطور خیمہ بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ہماری پگڑی لباس کا سب سے اہم حصہ ہے اور ہر صورت میں یورپی ٹوپی سے لاکھ درجہ بہتر ہے۔ یہ انسانی سر کا سب سے خوبصورت لباس ہے اور اسے سورج کی تمازت بچاتا ہے۔ یورپی ہیٹ اس کے مقابلہ میں سورج کی روشنی کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ پگڑی پیاسے مسافروں کو پانی فراہم کرنے کا بہترین ذریعہ ہے جبکہ وہ صحرا یا جنگل میں سفر کررہا ہوں اور پانی کے لئے گہرے کنویں کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہ ہو' ایسے موقع کو پگڑی کو کنویں میں ڈال کر آسانی سے پانی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اگر پگڑی سلک کی ہو تو یہ سر کو تلوار کی کاٹ سے بچاتی ہے۔ اگر کوئی زخمی ہو جائے تو اس کے زخموں کے لئے پٹی کا کام کرتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کے اور بھی بہت سے فائدہ ہیں کہ جن کو اگر بیان کیا جائے تو اس میں وقت اور جگہ دونوں کا بے جا استعمال ہو گا۔

صبح کے وقت چڑیوں کی خوبصورت چہچہاہٹ نے مجھے بیدار کیا۔ اٹھنے کے بعد میں نے

خود کو انتہائی تروتازہ محسوس کیا۔ لیکن میرے جوڑ درد کر رہے تھے اور حرکت کرتے ہوئے مجھے تکلیف ہوتی تھی۔ میں نے اس بلندوبالا جگہ سے اتر کر ایک اچھے مسلمان کی طرح ایک چشمہ کے پانی سے وضو کیا اور نماز پڑھ کر شمال کی سمت ہی میں اپنا سفر جاری رکھا۔ ابتداء میں تو کل والی چستی و چالاکی تو نہیں تھی' لیکن جب میں آدھے میل کے قریب چلا ہوں گا تو میرے جسم کی سختی ختم ہوگئی اور میری رگوں میں دوبارہ سے نئی قوت آگئی۔ قارئین! یقین کیجئے کہ اس سفر میں مجھے جو مشکلات درپیش آئیں وہ ناقابل یقین ہیں کیونکہ بغیر کسی شاہراہ یا راستہ کے' یا کسی انسانی قدموں کے نشانات کے میں چلتا رہا۔ لیکن بہرحال یہ حقیقت ہے کہ میرے آگے جانے کا راستہ اس سے زیادہ مشکل تھا جتنا کے میں چل کر آیا تھا۔

میں اپنی پریشان حالی کو مختصر کرتے ہوئے یہ بتاتا ہوں کہ میں نے چار دن سورج کی راہبری میں راستہ طے کیا اور چار راتوں میں درخت کے اوپر سویا' سوتے وقت میں پہلے کی طرح خود کو اپنی پگڑی کے ذریعہ شاخ سے باندھ لیتا تھا تاکہ گروں نہیں۔ میرے کھانے میں پیریا گولر تھے۔ اس عرصہ میں' میں نے تین چڑیاں اور ایک طوطا مارا اور ان کا گوشت کھایا جو مجھے لذیذ لگا۔ اگرچہ طوطے کا گوشت کھانا ہمارے مذہب میں حرام ہے مگر بھوک کی شدت نے مجھے اس کے کھانے پر مجبور کردیا۔ پانچویں دن صبح وقت' پہاڑی کی ایک چوٹی سے میں نے ایک میل کے فاصلہ پر کچھ بھیل عورتوں اور مردوں کو دیکھا کہ جن کے سروں پر آگ جلانے کے لئے لکڑی کے بنڈل رکھے ہوئے تھے۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ کسی آبادی میں اس لکڑی کو فروخت کرنے جارہے ہیں۔ میں ان کی طرف اس قدر تیزی سے کہ جس قدر ممکن تھا بھاگا اور ان غریب لوگوں کی جماعت کو نو بجے کے قریب جاکر جا لیا۔ اس وقت وہ ایک کنویں کے پاس بیٹھے ہوئے خود کو تازہ دم کر رہے تھے۔ انسان کو انسان کے لئے محبت اس وقت معلوم ہوتی ہے کہ جب وہ ویرانوں میں تنہا ہو۔ اس لئے جیسے ہی میں نے انہیں دیکھا میں ان کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ اس وقت میں یہ بھی بھول گیا کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جو مہذب دنیا کے لئے خطرہ ہیں۔ اگرچہ وہ انتہائی بری حالت میں تھے۔ لیکن ان کی تعداد اتنی تھی کہ اگر وہ چاہتے تھے تو اس دنیا سے میرے وجود کا خاتمہ کر سکتے تھے۔ جس طرح سے سانپ چاہے کسی قدر پتلا کیوں نہ ہو' زہریلا ہوتا ہے۔ لیکن میں ان کے بے انتہا قریب آچکا تھا اس لئے اب وہاں واپس جانا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس لئے ان کے قریب پہنچتے ہوئے میں سوچا کہ ان سے سوال پوچھا جائے کہ یہاں سے گاؤں کتنی

دور کے فاصلہ پر ہے؟ یہ سوال سن کر شاید وہ مجھے بھٹکا ہوا مسافر سمجھیں' اور اس طرح میں خود کو ان کے حوالے کر کے ان کے رحم و کرم کا محتاج ہو جاؤں کہ وہ جس طرح سے چاہیں میرے ساتھ سلوک کریں۔

لہٰذا میں نے اپنا ڈر اور خوف دور کرتے ہوئے اپنے اوپر سنجیدگی طاری کی اور بڑے رعب سے ان سے لکڑی کے بنڈلوں کی قیمت معلوم کرنی شروع کردی۔ ان میں سے ہر ایک نے بڑی معمولی قیمت بتائی اور پوچھنے لگے کہ میں یہ اسی جگہ خریدوں گا یا حاصل پور میں۔ یہ وہ نام تھا کہ جس کا ذکر شیخ نصراللہ نے کیا تھا۔ یہ سن کر میں ایک لحاظ سے مر کر دوبارہ سے زندہ ہوگیا۔ میں نے پر رعب' لہجہ اختیار کرتے ہوئے ان سے کہا کہ میرے دوستوں کی جماعت میرے پیچھے آرہی ہے۔ ہمیں جلانے کے لئے لکڑیوں کی ضرورت ہے لیکن میں انہیں گاؤں پہنچ کر خریدوں گا اگر وہ یہ بنڈل لے کر میرے ساتھ چلنے پر تیار ہو گئی۔ یہ سن کر ان لی پوری جماعت میرے ساتھ چلی۔ تین میل چلنے کے بعد کہ جس میں ہم پہاڑیوں کے اوپر چڑھے اور اترے آخرکار ہم گاؤں کے اطراف میں پہنچ گئے۔ میں اس خوشی و مسرت کو بیان نہیں کرسکتا کہ جو مجھے اس وقت ہوئی۔ میں اپنے حفاظتی دستہ کو جو میرے ساتھ تھا پیچھے چھوڑ کر بھاگتا ہوا گاؤں میں داخل ہوا۔ اس وقت گیارہ بجے ہوں گے کہ جب میں بوڑھے شیخ کے گھر پہنچا۔ وہ اس وقت اپنے گھر والوں کے ساتھ بیٹھا ناشتہ کررہا تھا۔ ایک بڑے کونڈے میں ابالے ہوئے گیہوں تھے اور لسی کا ایک ایک پیالہ گھر کے ہر فرد کے سامنے تھا۔ بوڑھے شیخ نے مجھے دور ہی سے پہچان لیا اور دوڑتا ہوا آکر مجھ سے بغل گیر ہوا اور اس طرح اچانک دیکھ کر اسے بے انتہا خوشی بھی ہوئی۔ میں نے کوشش کی میں اس کا شکریہ ادا کروں' اس کی اور اس کے خاندان کی صحت کے بارے میں پوچھوں مگر کمزوری کی وجہ سے پوری طرح سے اپنی بات واضح نہیں کرسکا۔ بوڑھے آدمی نے کہا کہ اس نے میرے متعلق سنا تھا کہ میں گوالیار سے واپس آگیا ہوں اور پھر اچانک غائب ہوگیا ہوں۔ "مجھے ذرا بتاؤ تو نوجوان کہ تم کہاں رہے؟" اس نے سوال کیا۔ لیکن اس کا جواب اس نے میرے منہ سے سننے کے بجائے میری آنکھوں میں دیکھ لیا۔ وہ اس وقت حیران ہوگیا کہ اس کے جواب میں میری آنکھوں سے آنسوں نکل پڑے۔ اس نے مجھے تسلی دینے کی کوشش کی اور مجھ سے پوچھا کہ کیا کسی نے میرے ساتھ برا سلوک کیا ہے۔ "میرے دوست' مجھے بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے؟" وہ مجھ سے سوال کرتا رہا اور میں اس کے جواب میں آنسو بہاتا رہا۔ شیخ نے فوراً ٹھنڈے پانی کا برتن منگایا اور میرے ہاتھ' منہ اور پیروں کو اس

سے دھویا۔ اس سادہ سے علاج سے میری حالت سنبھل گئی اور مجھ پر جو ہذیانی کیفیت طاری ہوگئی تھی وہ دور ہوگئی۔

اس کے بعد ہم نے ایک دوسرے کی خیریت پوچھی۔ اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہوؤں۔ اس وقت بھوک کی شدت نے دلیہ اور لسی کو میرے لئے نعمت بنا دیا اور میں نے خوب پیٹ بھر کے کھانا کھایا۔ میں نے شیخ کو اپنے تکلیف دہ حالات سے باخبر کیا جس کی وجہ سے اس کی ہمدردی میری جانب سے اور بڑھ گئی اور میری بدقسمتی پر اس نے افسوس کا اظہار کیا۔ پیٹ بھر کر کھانے' تحفظ کا احساس ہونے اور بھاگ کر آنے کی بے انتہا خوشی نے فوراً ہی مجھ پر غنودگی طاری کردی۔ میری حالت کو دیکھتے ہوئے شیخ مجھے کمرہ میں لے گیا جہاں میں اٹھارہ گھنٹے تک گہری نیند سویا' یعنی دن کے بقیہ چھ گھنٹے اور پوری رات۔ دوسرے دن صبح صبح شیخ نے مجھے بیدار کیا اور نماز پڑھنے کے بعد ہم دونوں باتوں میں مصروف ہوگئے۔ اس نے مجھے ایک خبر سنائی جسے سن کر میں پریشان ہوگیا۔ خبر یہ تھی کہ میرے سوتیلا باپ' یعنی صوبیدار نے سندھیا کی ملازمت چھوڑ دی ہے اور اپنے سالے کے ساتھ مل کر چند گھڑسواروں کو لے کر اندور میں ہلکر کے ہاں ملازمت کرلی ہے اور وہیں پر وہ اپنے گھر والوں کو لے گیا ہے۔ اندور میں جانے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد اس میں اور اس کے سالے میں جھگڑا ہوگیا جو بڑھتا رہا یہاں تک کہ گالم گلوچ و مار پیٹ تک نوبت پہنچ گئی پھر دونوں میں تلوار بازی ہوئی' چونکہ اس کا سالہ نوجوان اور ماہر شمشیر زن تھا' لہذا اس نے صوبیدار کو زخمی کرکے ادھ موا کردیا۔ یہ سوچتے ہوئے کہ اس کا کام تمام ہو چکا ہے' اس نے وہاں سے بھاگنے کا ارادہ کیا' اس کوشش میں جو بھی اس کے قریب آیا اسے زخمی کردیا۔ لیکن اس جھگڑے کا شور سن کر لوگوں کی ایک بڑی تعداد گھر کے باہر جمع ہوگئی اور جب اس نے بھاگنے کی کوشش کی تو کسی نے گولی مار کر اسے ختم کردیا۔ صوبیدار بھی دوسرے دن زخموں کی تاب نہ لاکر مر گیا۔ حکومت نے فوراً ان کی تمام جائیداد اس بہانہ سے ضبط کرلی کہ دونوں مجرم تھے کیونکہ انہوں نے امن و امان کو خراب کیا اور قانون کو اپنے ہاتھوں میں لیا۔

اس صدمہ کی خبر نے مجھے افسردہ کردیا۔ مجھے صوبیدار کی موت کا افسوس تھا مگر میں اپنی ماں کی طرف سے فکر مند ہوگیا۔ اس کے اوپر کیا بیتی' اس کے بارے میں مجھے کچھ پتہ نہیں تھا۔ میں نصراللہ کے گھر تین دن تک ٹھہرا۔ چوتھے دن میں اس کی مرضی کے خلاف وہاں سے چل کھڑا ہوا اور اندور کی جانب روانہ ہوا۔ وہاں میں دو دن کے اندر پہنچ گیا اور خوش

قسمتی سے جلد ہی اپنی ماں کے گھر کو تلاش کرلیا۔ ہمیں دونوں کو ایک دوسرے سے مل کر جوش خوشی ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔ اس نے مجھے اس جاں لیوا جھگڑے کے بارے میں تفصیل سے بتایا اور پھر کس طرح حکومت نے قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے تمام سازوسامان کو لوٹا۔ میرا اپنا صندوق کہ جو میں اس کے پاس چھوڑ گیا تھا اور جس میں میری اور چیزوں کے ساتھ میرے پیسے بھی تھے وہ لٹیروں سے اس لئے بچ گیا کہ وہ ٹوٹا پھوٹا اور بھدا تھا۔ جب میں نے اپنی ماں کی صحت کے بارے میں پوچھا جو مجھے کوئی زیادہ اچھی نظر نہیں آئی تو اس نے جو جواب دیا اس سے میرا دل افسردہ ہوگیا۔ اس نے کہا کہ اسے مسلسل معمولی سا بخار رہنے لگا ہے اور ساتھ میں کھانسی بھی ہے لیکن اس نے اپنی اس بیماری کی طرف زیادہ خیال نہیں کیا۔ لیکن اسے یہ احساس ضرور ہوگیا کہ اس کی توانائی کم ہورہی ہے۔ اس کی بظاہر معمولی نظر آنے والی بیماری' جو درحقیقت انتہائی خطرناک تھی' اس کے بارے میں معلوم ہوکر میں پریشان ہوگیا۔ لیکن اس کی موجودگی میں' میں نے اپنی پریشانی کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اور بے پروائی کے ساتھ اس سے کہا کہ فکر کی کوئی بات نہیں وہ جلد ہی ٹھیک ہو جائے گی۔ ساتھ ہی میں میں نے اسے مشورہ دیا کہ اس کی صحت کے لئے تبدیلی آب و ہوا ضروری ہے' لہٰذا کیوں نہ وہ اپنے آبائی شہر جاکر اپنی ماں' بھائی اور دوسرے رشتہ داروں سے مل لے۔ اس پر وہ خوشی سے تیار ہوگئی اور اپنے کپڑے اتار کر مجھے دیتے ہوئے کہا کہ ان کو بیچ کر میں سفر کے اخراجات کا بندوبست کرلوں۔ میں نے اس پر انکار کرتے ہوئے کہا کہ میرے صندوق میں میرے پیسے ہیں۔ جو ان اخراجات کے لئے کافی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہماری نوبت اس حد تک نہیں پہنچی ہے کہ ان چند زیورات کو بھی کہ جو لٹیروں کے ہاتھ سے بچ گئے ہیں انہیں فروخت کرکے گزارا کریں۔ لوٹنے والوں نے اگرچہ حکومت کے احکامات کے مطابق گھر کا سارا سامان لوٹ لیا مگر انہیں اس بات کی جراءت نہیں ہوئی کہ وہ ایک باعزت خاتون کے زیورات کو ہاتھ لگائیں۔

میں فوراً بازار گیا اور سفر کی تمام تیاریاں جلدی میں مکمل کرلیں۔ دوسرے دن ہی ہم نے صبح صبح اندور چھوڑ دیا اور خدا کی مہربانی سے بغیر کسی رکاوٹ کے تیسرے دن اپنے شہر پہنچ گئے۔ جب ہم اپنے غریب خانے میں داخل ہوئے تو تمام گھر والوں نے بڑی محبت کے ساتھ ہمارا خیر مقدم کیا۔ ہمارے اس طرح اچانک آنے پر تمام جاننے والوں میں خوشی کے ساتھ ساتھ حیرت و تعجب بھی تھا۔ یہ دن' میرے علاوہ' سب کے لئے انتہائی خوشی کا تھا۔ میں آنے والے منحوس دن کے خیال سے خوشی کے ان لمحات میں پوری طرح سے ان کا

شریک نہ ہو سکا۔ میں نے خفیہ طور سے اپنے ماموں کو' ان کی بہن کی موذی بیماری کے بارے میں بتا دیا۔ وہ خود اس کے چہرے کی زردی' کھانسی اور ناامیدی کے جذبات کو دیکھ کر اس بیماری کا اندازہ لگا چکے تھے' وہ اپنی بہن کی حالت سے کافی متفکر اور پریشان تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے مجھے تسلی دی اور کہا کہ میں مریض کے سامنے کسی قسم کے افسوس کا اظہار نہ کروں۔ بلکہ اس سے گفتگو کرتے ہوئے خود کو خوش و مسرور ظاہر کروں۔ کیونکہ اس قسم کی بیماریوں کا یہ سب سے بہترین علاج ہے اور یہ کہ اس صدمہ سے میں خود کو نڈھال نہ کروں کیونکہ زندگی اور موت مکمل طور پر خدائے برتر کے ہاتھ میں ہے۔ اور یہ کہ دو دن ایسے ہیں کہ جن پر موت کا خوف کرنا عقل مندی نہیں' یعنی ایک وہ دن کہ جب مرنا ہے اور دوسرا وہ کہ جس دن نہیں مرنا ہے۔ ان دونوں دنوں میں ڈرنا محض حماقت ہے۔

ہم نے ان ہدایات پر سختی سے عمل کیا اور وہ تمام علاج کئے کہ جو ہمارے اختیار میں تھے' لیکن بدقسمتی سے ان کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ بیماری روز بروز بڑھتی رہی اور مریض اسی طرح سے کمزور ہوتا گیا۔ بیس دن کے اندر اندر وہ محض ڈھانچہ بن کر رہ گئی۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ اس کا آخری وقت قریب آگیا ہے۔ اس نے اپنی آخری وصیت اس طرح سے کی: "میرے بچے! میری نصیحت ہے کہ تم نیکی کی زندگی گزارو اور اس دنیا میں رہتے ہوئے عقل اور اپنے ضمیر کے بتائے ہوئے راستہ پر چلو۔ میرے بعد اس یتیم بچے کا خیال کرنا جو صرف چھ سال کا ہے اور جس کی خبرگیری کرنے والا اب کوئی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ بھائیوں جیسا سلوک کرنا۔ میری دعا ہے کہ تم جہاں کہیں بھی رہو' خدا تمہاری حفاظت کرے' مجھے اب یقین ہے کہ میں اب اسی دنیا میں واپس جانے والی ہوں کہ جہاں سے میں آئی تھی۔" یہ کہتے ہوئے وہ گہری بے ہوشی میں ڈوب گئی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میرے وہ آنسو کہ جو اب تک رکے ہوئے تھے' کسی بند کے پھٹنے کی طرح سے پھوٹ پڑے۔ اس کے بستر کے قریب جتنے لوگ کھڑے تھے' میری نانی' ماموں اور دوسرے رشتہ دار سب ہی مجھے روتے دیکھ کر میرے رونے میں شریک ہوگئے۔ یہ سلسلہ کوئی آدھ گھنٹے تک رہا۔ پھر اس وقت ہماری خوشی کی انتہا نہیں رہی کہ جب اسے ہوش آیا اور اس نے پینے کے لئے پانی مانگا۔ اس کے بعد سے وہ بڑی پرسکون ہوگئی اور ہمیں تسلی دینے لگی اور نصیحت کرنے لگی کہ ہمیں افسوس کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ دوسرے دن ایسا محسوس ہوا کہ وہ بالکل ٹھیک ہوگئی ہے اور ہمیں دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ عصا کے سہارے

تھوڑی دیر تک چلی بھی۔ لیکن افسوس کہ یہ وقتی صحت یابی ایسی ہی تھی کہ جیسے چراغ کے بجھتے وقت شعلہ بھڑکتا ہے۔ 24 اپریل کو جمعہ کے دن دوپہر کو' اس وقت کہ جب اس کا سر میرے سینہ پر رکھا ہوا تھا' اس کی روح خالق حقیقی سے جا ملی۔ میری دعا ہے کہ خدائے رحیم و کریم ہمیشہ اس پر انوار کی بارش کرتا رہے۔ آمین۔

چونکہ میں ہی وہ شخص تھا کہ جس سے تجہیز و تکفین کے بارے میں پوچھا گیا۔ اس لئے میں نے ہدایات دیں کہ اس کی تیاری جس قدر بہتر ہو اس طرح سے کی جائے۔ ان تمام اخراجات کو میں نے برداشت کیا جس کی وجہ سے میری تمام رقم ختم ہوگئی۔ تجہیز و تکفین کے علاوہ غریبوں کو خیرات دینا' اور ان دوستوں و رشتہ داروں کے کھانے و پینے کا انتظام کرنا کہ جو دور و نزدیک سے تعزیت کے لئے آئے تھے' ان سب میں میرا کافی پیسہ خرچ ہوگیا۔ اگرچہ میں نے اپنی ماں کے چند زیورات بھی فروخت کردیئے مگر اس کے باوجود خرچہ کے لئے رقم کی ضرورت رہی۔ اس لئے میں نے سوچا کہ بہتر یہ ہے کہ میں خاموشی سے یہاں سے چلا جاؤں کیونکہ اس شہر میں اب مزید رکنے سے میری شہرت خراب ہورہی ہے کیونکہ جن لوگوں سے میں نے تھوڑا بہت قرض لیا تھا اب' وہ اس کی واپسی کے لئے شدید اصرار کررہے تھے۔

میرا ایک دوست نجف علی خاں جوکہ ایک قابل عزت اور شریف شخص تھا وہ اس وقت برطانوی حکومت کے ایجنٹ کے طور پر دھارا پور میں تھا۔ میں اکثر اس کے پاس جاتا رہتا تھا اور وہ ہمیشہ مجھ سے عزت و احترام سے ملا کرتا تھا کیونکہ میں اسے اہم خبریں پہنچا کر اس کی مدد کیا کرتا تھا۔ ایک دن موقع پا کر میں نے اسے اپنی حالت زار سے آگاہ کیا جسے سن کر اسے بے انتہا افسوس ہوا۔ اس نے فوری طور پر مجھے رقم دے کر قرض خواہوں سے میری جان چھڑائی۔ ساتھ ہی میں اس نے اپنی ذاتی کوششوں سے آنریبل کمپنی میں کلرک کا ایک عہدہ دلوا دیا' جس کی تنخواہ پندرہ روپیہ ماہوار تھی۔ 18 مئی کو مجھے اس عہدے کے تقرری کے کاغذات مل گئے جس پر مھوہ کے ہیڈ کوارٹر سے سر جان مالکم کے دستخط تھے۔ اس میں کہا گیا تھا کہ مجھے آنریبل کمپنی کی ملازمت میں لے لیا گیا ہے۔ اگر میں کمپنی سے وفادار رہا تو مستقبل میں میری ترقی کے امکانات ہیں۔ اس کے ساتھ مجھے ہدایت کی گئی کہ میں فوراً بارہ ہرکاروں کے ساتھ دھرم پوری کے لئے روانہ ہو جاؤں اور پوسٹ ماسٹر کا چارج سنبھالوں جس کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ سندوا والے سے منڈیلشور تک جو بھی ڈاک ہو۔ اس کو سنبھالے۔ اس کے علاوہ میری یہ ذمہ داری تھی کہ منڈیلشور میں رہتے

ہوئے وہاں کی تمام خبریں روز ایک خط میں لکھوں اور اسے مہوہ میں مسٹر بیل کو روانہ کیا کروں۔ جیسے ہی مجھے یہ ہدایات ملیں، میں نے سفر کی تیاریاں شروع کر دیں اور ہرکاروں کو لے کر اپنی مقررشدہ جگہ پر چلا گیا۔ یہاں تک پہنچنے میں مجھے تین دن لگے یہاں پہنچ کر میں نے مع اپنی جماعت کے ایک ہندو مندر میں قیام کیا۔ یہاں آنے والا میں پہلا انگریزی عہدیدار تھا۔ یہاں کے رہنے والوں نے سب ہی نے میری بڑی عزت کی۔ اس جگہ کا گورنر اس وقت دھار ریاست کی طرف سے ایک برہمن تھا۔ جس کا نام ناتھو بھائی تھا۔ اس کی عمر پچاس کے قریب ہوگی۔ دبلا پتلا اور کالی رنگت کا افیم چی۔ اس کا رویہ لوگوں کے ساتھ بڑا خراب تھا جس کی وجہ سے اس کے بارے میں رعیت میں خراب رائے تھی۔ اس کے کرتوتوں کی پوری پوری عکاسی اس کی شخصیت میں ہوتی تھی، جو اتنی ہی گھناؤنی تھی جیسے کہ اس کے کام۔

ظاہری طور پر تو وہ مجھ سے بڑے اخلاق سے ملا اور مجھے جس چیز کی بھی ضرورت تھی وہ اس نے مجھے مفت میں فراہم کردی۔ لیکن دلی طور پر وہ شہر میں میری موجودگی کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ وہ اس پر بھی سخت ناراض تھا میں اپنے اختیارات کو کیوں استعمال کرتا ہوں اور وہاں کے لوگ اس کے بجائے میری کیوں زیادہ عزت کرتے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت چاہے کسی قدر تلخ کیوں نہ ہو، ناتھو بھائی کو یہ سب برداشت کرنا پڑا۔ اس کو یہ بات پوری طرح معلوم تھی کہ اس کے راجہ کی طاقت انگریزوں کے سامنے ایسی ہی ہے جیسے کہ ایک چونٹی ہاتھی کے سامنے۔ چونکہ میرا تعلق بڑی طاقت سے تھا، اور اس کے مقابلہ میں، میں جوان، صحت مند، اور توانا بھی تھا۔ لہٰذا مجبوراً اس نے حالات کو اپنے دھارے پر چلنے کے لئے چھوڑ دیا۔

بیس سال پہلے دھرم پوری ایک بڑا شہر تھا، مگر اس وقت یہ چھوٹا ہو کر محض ایک گاؤں رہ گیا تھا اور باقی تمام کھنڈرات ہی کھنڈرات تھے۔ اب اس میں صرف ایک سو کے قریب مکانات تھے۔ جن میں انتہائی غریب لوگ آباد تھے۔ اس طرح یہ جگہ اب میری حکومت کے ماتحت تھی۔ یہاں کے لوگ ناتھو بھائی جیسے گورنروں کے ظلم و ستم کا شکار رہے تھے، اور ساتھ میں ڈاکوؤں اور لٹیروں کے ہاتھوں ستائے ہوئے تھے۔ اس لئے ان کی شدید خواہش تھی کہ ان پر کوئی انصاف کے ساتھ حکومت کرے۔ چونکہ انہوں نے سن رکھا تھا کہ انگریزی حکومت اپنے انصاف اور رعایا پروری میں دنیا میں واحد ہے، لہٰذا وہ اس پر تیار تھے کہ پہلا موقع ملتے ہی وہ خود کو اس حکومت کے حوالے کردیں۔

دھرم پوری اگرچہ کھنڈرات ہو چکا تھا' مگر جغرافیائی طور پر یہ دریائے نربدا کے کنارے بہترین جگہ پر واقع تھا۔ یہاں صاف و شفاف پانی دریا کی ریتیلی سطح پر بہتا ہوا بڑا خوبصورت لگتا تھا۔ اس کے دونوں کناروں پر کئی شاندار مندر تھے جو مشہور زمانہ ایلیا بائی نے تعمیر کرائے تھے' جس نے 1769ء سے 1795ء تک ہلکر کی ریاست پر حکومت کی تھی۔ اس کا انصاف' مردوں والی ہمت' اعتدال' اور فیاضی و سخاوت وہ خوبیاں تھیں کہ جن کی وجہ سے اس کا نام کئی نسلوں تک زندہ رہے گا۔

یہاں دریا میں کئی اقسام کے پرندے تھے۔ اس کے جنگل اگرچہ بہت زیادہ گھنے نہیں تھے مگر اس میں شکار کے لئے ہر قسم کے جانور و پرندے مل جاتے تھے۔ یہ جنگلی وحشی جانوروں سے بھی بھرا پڑا تھا۔ یہ جانور ہمارے گاؤں کے لوگوں کے لئے مسلسل خطرہ تھے اور ہر مہینے میں ایک یا دو مرتبہ یہ ان کی بکریاں اور بچھڑے اٹھا کر لے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے گھروں کے باہر لگی ہوئی باڑھ میں سے بھی۔ میری رہائش جس مندر میں تھی چونکہ اس کا کوئی دروازہ نہیں تھا' اس لیے یہ رات کو خطرناک ہو جاتی تھی۔ اس لئے میں نے اپنے ہرکاروں کو ہدایت کرر کھی تھی کہ وہ رات بھر آگ جلائے رکھیں تاکہ اس کے ڈر سے یہ وحشی جانور دور رہیں۔

میری آمد کے تھوڑے ہی عرصہ بعد مدراس سے مقامی فوجیوں پر مشتمل ایک دستہ ایک بہت ہی خوبصورت انگریز کی کمانڈ میں آیا اور میرے گاؤں میں قیام کیا۔ اس کی آمد سے میں اور گاؤں کے لوگ بہت خوش ہوئے۔ مگر ناتھو بھائی کو یہ آمد سخت ناگوار گزری۔ اس انگریز نے پہلے مجھ سے معلومات حاصل کیں۔ اس کے بعد اس دستہ کو ایک ہندوستانی صوبیدار کی ماتحتی میں چھوڑ کر خود ایک نائک اور تین سپاہیوں کے ساتھ مہوہ چلا گیا۔ اس کے بعد سے گاؤں میں میری پوزیشن اور طاقت اور زیادہ مضبوط ہوگئی۔ یہاں پر میں نے جو وقت گزرا وہ میری زندگی کا سب سے زیادہ پرمسرت زمانہ تھا۔ حکومت کی جانب سے فرائض کی ادائیگی میں میرا زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹہ لگتا تھا۔ اس کے بعد پورے دن کا میں مالک ہوتا تھا۔ دن میں' میں دریا کے پاک و صاف پانی میں نہاتا تھا اور اس کے بعد دریائی پرندوں کا شکار کرتا تھا اور پھر مقامی فوجی دستہ کے افسروں کے ساتھ شطرنج کھیلتا تھا۔ رات میں' میں مندر میں باقاعدہ دربار لگاتا تھا جس میں گاؤں کے پنچ اور فوج کے عہدیدار شریک ہوتے

تھے۔ یہ نشست آدھی رات تک جاری رہتی تھی۔

دو مہینے بعد ایک اور انگریز انجنیئر جس کا نام مسٹر ڈینجر فیلڈ تھا معہ اپنے آلات کے پیائش کے لئے آیا۔ اس نے اس جگہ کی مردم شماری کے بارے میں مجھ سے معلومات حاصل کیں۔ اس کے بعد مجھ سے اور سوالات کئے کہ جن کا جواب میں نے دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ انتہائی بیمار تھا' جس وجہ سے وہ درشت اور چڑچڑا ہو گیا تھا۔

اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ جب وہ بیٹھا ہوا تھا تو ایک مکھی بار بار اس کے منہ پر آکر بیٹھ جاتی تھی۔ اس پر اس نے نہ صرف ملازم کو جو اس پر سے مکھیاں اڑا رہا تھا برا بھلا کہا' بلکہ اس کے چہرے پر مکہ مارنے کی بھی کوشش کی جس کو اس نے اپنے سر کو جھٹکا دے کر ناکام بنا دیا۔ اس سے وہ اور بھی زیادہ مشتعل ہو گیا۔ یہاں تک کہ وہ غریب ملازم خود کو بچاتے ہوئے خیمہ سے باہر چلا گیا۔ اور اس کے حکم کے باوجود دوبارہ سے واپس خیمہ میں نہیں آیا۔ یہ دیکھ کر میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ مگر اس کے چہرے پر کسی قسم کی خوش دلی کے آثار پیدا نہیں ہوئے۔

یہاں پر بغیر کسی رکاوٹ کے میں چار مہینہ تک رہا۔ یہاں تک کہ ستمبر کے شروع مہینہ میں میرے سٹیشن پر ڈاک آنا بند ہو گئی۔ اسی مہینہ کے آخر میں مجھے ہیڈکوارٹر سے ایک خط ملا' جس نے مجھ پر وہی اثر کیا جو کہ بندوق کی گولی کسی پرندے پر کرتی ہے' اس میں کہا گیا تھا کہ آئندہ سے میری ملازمت کی ضرورت نہیں رہی اس لئے مجھے فوری طور پر برخاست کیا جاتا ہے۔ اس خط کا ترجمہ یہ ہے: "تم نے اپنے فرائض گورنمنٹ عالی کی مرضی کے مطابق تسلی بخش طور پر انجام دیئے۔ چونکہ پیشوا گرفتار ہو چکا ہے' ملک کے حالات سنبھل گئے ہیں' اس لئے اب تمہاری خدمات کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ لہٰذا تمہیں برخاست کیا جاتا ہے۔ تم کو جو معلومات ہیں وہ سات ہرکاروں کے ہمراہ لکھ کر مہوہ بھیج دو۔ پچاس روپیہ کی رقم جو تمہیں بھیجی جارہی ہے اسے وصول کرو۔ یہ اس مہینہ کی تنخواہ ہے۔ اس کے علاوہ دو مہینہ کی تنخواہ بطور انعام ہے۔ ان احکامات پر سختی سے عمل کرو۔"

اس کے بعد میں نے خود کو پھر اس حالت میں پایا کہ جس کے پاس تھوڑی بہت رقم تھی کہ جس سے دنیا کا کاروبار چل سکتا تھا۔ لیکن میری وہ تمام امیدیں جو اس ملازمت سے وابستہ تھیں اور میں جو خواب ترقی اور اعلیٰ عہدے کے دیکھ رہا تھا' وہ ساری امیدیں اچانک ختم ہو گئیں اور ہوا میں تعمیر کئے گئے قلعے منہدم ہو کر غائب ہو گئے۔

دوسرے دن میں گاؤں کے لوگوں' دوستوں' مقامی فوجی دستہ کے افسروں سے رخصت

ہوا۔ اس مہینہ چاندنی راتیں تھیں، اس لئے ہم نے اپنا سفر رات کو چھ بجے شروع کیا۔ دستہ کا ایک نائک، جس کا نام محی الدین تھا، وہ ایک میل تک میرے ساتھ گیا، اس قیام کے دوران اس سے میری گہری دوستی ہوگئی تھی، ہم دونوں اکثر شطرنج کھیلتے تھے۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ اس کھیل میں اس کو مہارت حاصل تھی۔ میں نے دوبارہ محی الدین صاحب کو 1840ء میں سورت میں دیکھا۔ اس وقت وہ بالکل مذہبی ہو چکے تھے اور ان کے چہرے پر سفید داڑھی چھائی ہوئی تھی۔ وہ مجھے اس آدمی سے بالکل مختلف لگے کہ جس سے میں پہلے مل چکا تھا۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس کی اس تبدیلی اور سید بننے کے باوجود اس کے حالات بہت زیادہ نہیں بدلے۔

میں اپنے سات ہرکاروں کے ساتھ دھرم پوری سے چلا۔ پروگرام یہ تھا کہ میشور پہنچ کر میں ان سے علیحدہ ہوکر اپنے آبائی شہر چلا جاؤں اور یہ مہوہ۔ ہم نے اپنا سفر شروع کیا تو کچھ وقت تو ایک دوسرے سے باتیں کرنے میں گزرا اور کچھ ایک گانے والے سے گانا سننے میں۔ جو بہت اچھا گاتا تھا، اور ہر شخص سے اپنے اچھے گانے کی قیمت وصول کرنے میں مصروف تھا۔ رات کو بادلوں کی وجہ سے زیادہ ہی اندھیرا ہوگیا۔ میں نے مشورہ دیا کہ ہر شخص باری باری جلتی ہوئی لکڑی کو لے کر آگے آگے چلے تاکہ وحشی جانور ڈر کر ہم سے دور رہیں۔ چونکہ اب میں ملازمت میں نہیں تھا اس لئے کسی نے میرے مشورہ کو نہیں مانا اور نہ ہی اس پر کوئی توجہ دی۔ اس کے برعکس انہوں نے میرا مذاق اڑایا اور کہنے لگے کہ "یا تو تم خاموشی سے ہمارے ساتھ چلو، اور اگر نہیں، تو واپس چلے جاؤ، اور جو مرضی میں آئے وہ کرو۔" یہ ملازمت چھوڑنے کے بعد پہلی ذلت تھی جو مجھے برداشت کرنی پڑی، اور اس سے میں اس قدر دل گیر ہوا کہ پھر میں نے ان سے کوئی بات چیت نہیں کی۔

رات کے گیارہ بجے کے قریب سفر کی تھکان اور رات کی ٹھنڈک کی وجہ سے میرا ذہن بھاری ہوگیا اور میرا دل بالکل نہ چاہا کہ میں ان کے ساتھ جاؤں۔ مگر مجبوراً میں قدم بڑھاتا رہا۔ کبھی کبھی جب چاند بادلوں سے نکل آتا تھا تو ہر طرف روشنی ہو جاتی تھی اور جب وہ چھپ جاتا تھا تو پھر گھپ اندھیرا چھا جاتا تھا۔ اچانک ہم نے اپنے بائیں جانب جھاڑیوں کے چرچرانے کی آواز سنی۔ جسے سن کر ہم سب ہوشیار ہوگئے۔ لیکن اچانک جھاڑی میں سے ایک چیتے نے چھلانگ لگائی۔ اور ان لوگوں میں سے جو میرے آگے تھے ایک کو اٹھا پلک جھپکتے میں غائب ہوگیا۔ اس وحشی جانور کا آنا، اس کے منہ میں اس کے شکار کی ہڈیوں کا چٹخنا اور درد و تکلیف سے اس کا ہائے ہائے کہنا، ان سب میں کوئی تین سیکنڈ لگے ہوں

گے۔ اس کے بعد مجھے تو پتہ نہیں کہ کیا ہوا؟ جب مجھے ہوش آیا ہے تو میں اپنے ساتھیوں کے درمیان پڑا ہوا تھا' اور ایسا معلوم ہوتا تھا' کہ ہر شخص خود کو وحشی جانوروں کے حوالے کرنے پر تیار ہے۔ میرے قلم میں اتنی طاقت نہیں کہ اس وقت میں جس خوف سے دوچار تھا اسے الفاظ میں بیان کرسکوں۔

ہمارے جسم اکڑ گئے تھے' ہماری بولنے کی طاقت ختم ہوگئی تھی' ہمارے دل زور زور سے دھڑک رہے تھے اور ہمارے چاروں طرف ہائے' ہائے کی آواز گونج رہی تھی۔ اس حالت میں ہم سب کچھ دیر تو رینگتے ہوئے چلے' اس کے بعد اپنی اپنی زندگی بچانے کے لئے بھاگ کھڑے ہوئے' ہم اس رفتار سے بھاگے کہ شاید عرب کا گھوڑا بھی ہمارا مقابلہ نہ کرسکتا۔ ایک گھنٹہ کے بعد ہم ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچے جہاں تقریباً پچاس کے قریب کچے مکانات تھے۔ ہم بھاگتے ہوئے گاؤں میں داخل ہوئے اور کتوں کی آوازوں اور شور کا بھی خیال نہیں کیا کہ جنہوں نے ہم اجنبیوں کو آتے دیکھ کر بھونکنا شروع کردیا تھا۔ اس عرصہ میں شور سے گاؤں والے بھی اٹھ گئے اور یہ سمجھے کہ ہم شاید ڈاکو ہیں کہ جو لوٹنے کے لئے آئے ہیں۔ ان تمام باتوں سے بے پروا ہوکر اس جھونپڑی میں چلے گئے جوکہ پولیس کی تھی اور جہاں سامنے آگ جلی ہوئی تھی۔ یہاں پر ایک بوڑھا بھیل پولیس افسر تھا' جس نے ہماری شکلوں کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ ہم ڈاکو نہیں ہیں۔ لہٰذا اس نے گاؤں کے لوگوں کو تسلی دی' چونکہ ہمارے سانس پھولے ہوئے تھے اس لئے ہم فوراً تو نہیں بول سکے' لیکن جب ہمارے ہوش و حواس درست ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ ایک ہرکارہ جس کا نام رام تھا' وہ غائب تھا۔ اس کے بعد ہم نے اپنی پوری کہانی لوگوں کو سنائی۔ انہوں نے یہ سن کر ہمیں برا بھلا کہا کہ ہم نے کیوں اس خطرناک جنگل میں رات کے وقت بغیر آگ جلائے سفر کیا۔ اس لئے انہیں اس پر کوئی تعجب نہیں ہوا کہ ہمارے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا۔ اس کے بعد وہ لسی کا ایک بڑا برتن لائے اور ہم سب کو اس میں سے ایک ایک پیالہ پینے کو دیا۔ ہم نے ندیدے پن سے لسی پی اور اپنے میزبانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے فوراً بعد ہم سب کو سخت بخار ہوا جس سے کہ پورے جسم پر کپکپاہٹ طاری ہوگئی۔ یہ کیفیت صبح تک رہی۔ پھر ہم وہاں سے دو بھیلوں کی نگرانی میں میسور روانہ ہوئے اور صبح نو بجے وہاں پہنچ گئے۔ یہاں پر میں نے ہرکاروں کا ساتھ چھوڑ دیا اور اپنے ہم نام قاضی کے ہاں' جو دور کا میرا رشتہ دار بھی تھا' ٹھہر گیا۔

ایک ہفتہ میں نے قاضی کے گھر والوں کے ساتھ گزارا جنہوں نے اس قیام کے دوران

میری خاطر تواضع کی۔ پھر ایک قافلہ کے ہمراہ میں اپنے شہر چلا آیا۔ جہاں کچھ عرصہ میں نے خاموشی سے گزارا۔ لیکن مجھے اس پر افسوس تھا کہ مجھے کیوں اس طرح غیر متوقع طور پر ملازمت سے برخاست کیا گیا۔ خدا کا شکر تھا کہ میرے پاس قرض ادا کرنے کے بعد بھی اس قدر روپیہ تھا کہ ایک سال تک میں نے اور میرے بھائی نے آرام سے گزار دیا۔ ہوا یہ کہ اس موقع پر سر جان مالکم ہماری درگاہ پر آیا اور اس نے اس کے متولین کی خدمت میں خاصی رقم بطور تحفہ دی۔ اس نے ایک کالے پتھر کی سل میں بھی بڑی دلچسپی لی جو مسجد کے ممبر کی نشست پر نصب تھی اور جس پر ایک ہندو دیومالائی قصہ سنسکرت زبان میں بڑے قرینہ سے لکھا ہوا تھا۔ اس نے ہم سے کہا کہ یہ پتھر اسے مناسب قیمت پر فروخت کردیں۔ ہم نے اس درخواست پر بڑا غوروخوض کیا اور اس کو غیرمناسب جانا کہ ایک یادگار کو جسے طاقتور بادشاہ نے اس وقت نصب کیا تھا کہ جب اس جگہ کے مندر کو مسجد میں بدلا تھا اس کو اس کے حوالے کیا جائے۔ اس کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے فوراً اس کی درخواست کو منظور نہیں کیا۔

لیکن دوسری طرف ہم نے یہ بھی سوچا کہ اس جیسے طاقتور اور بااثر شخص کو انکار کرنا بھی مناسب نہیں ہے کیونکہ اس کے ایک اشارہ پر یہاں کا راجہ اس پتھر کی سل کو ہم سے لے کر بغیر معاوضہ کے اس کو دے دے گا۔ اس لئے ہم نے جنرل کے آدمیوں سے درخواست کی کہ اس پتھر کو لے جائیں کیونکہ مقدس مسجد میں اس مشرکانہ یادگار کا نصب ہونا شاید ماضی میں غلطی سے ہوا ہوگا۔ اس لئے اس کو جس قدر جلدی یہاں سے ہٹا لیا جائے اسی قدر مناسب ہے۔

پتھر کو اٹھا لیا گیا اور اس کی جگہ جنرل کے آدمیوں نے عمدہ طریقہ سے مرمت کردی۔ جنرل نے ہم سب کو اپنے خیمہ میں بلایا' ان سب میں سے اس نے مجھے اس قابل سمجھا کہ مجھ سے گفتگو کی جائے۔ لہٰذا میں اس کے اتنا قریب ہوگیا کہ اس کے جسم کو چھونے لگا۔ اس کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوا اور بڑی خوش دلی اور دوستی کے ساتھ فارسی میں بات چیت کی اور اس پتھر کی سل اور ہمارے خاندان کی تعریف کی جس کی وجہ سے ہم بہت زیادہ خوش ہوئے اور یہ خوشی اس قیمت سے زیادہ تھی جو ہم اس سے لیتے۔

پانچواں باب

واپس آنے کے بعد میں نے پھر ملازمت کی تلاش شروع کردی اور ایک عربی کہاوت کے مصداق جو ڈھونڈتا ہے وہ پاتا ہے' جلد ہی مجھے کامیابی ہوگئی اور ایک شریف انگریز' لیفٹیننٹ بی میک موہن' جوکہ ناپچھا میں بھیلوں کے ہاں ایجنٹ تھا' اس کو فارسی زبان پڑھانے کی ذمہ داری دی گئی۔ ہوا یہ کہ وہ لیفٹیننٹ سی ایف ہارٹ کے ساتھ ہمارے شہر میں شکار کھیلنے آیا اور ہماری درگاہ کے قریب کی مسجد میں دو یا تین دن کے لئے ٹھہرا۔ یہاں اس نے ایک دن' اچانک یہ پیش کش کی جسے میں نے بغیر کسی حیل و حجت کے فوراً قبول کرلیا اور اس کے ساتھ اس کے ہیڈکوارٹر ناپچھا روانہ ہوگیا۔ لیفٹیننٹ میک موہن' جو شاید اب کرنل یا اس سے اعلیٰ عہدے دار ہو' ایک لمبا اور دبلا شخص تھا جو ذہانت اور قابلیت کے ساتھ اور بڑی عمدگی کے ساتھ بھیلوں کے اشاروں اور چیخوں کی نقل کرتا تھا جو وہ خطرے' انتقام اور خوشی کے وقت نکالا کرتے تھے۔ وہ ان کی مشکل اور نہ سمجھ میں آنے والی زبان کو بھی اچھی طرح سے بولتا تھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے اگر اسے پردہ کے پیچھے کھڑا کردیا جائے' یا اس کو کالے رنگ سے پینٹ کردیا جائے اور لنگوٹی پہنا کر اس کے ہاتھ میں تیرکمان دے دی جائے تو وہ مکمل طور پر بھیل معلوم ہوگا۔

میں اس نوجوان افسر کی فیاضانہ سرپرستی میں ساڑھے چار مہینے ایک قدیم محل میں رہا۔ بدقسمتی یہ ہوئی کہ وہ ملیریا کے مرض میں مبتلا ہوگیا اور اپنے علاج کے لئے پریذیڈنسی جانا پڑا۔ وہاں سے جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا' وہ اپنے وطن چلا گیا۔ ناپچھا سے جاتے وقت وہ مجھے لیفٹیننٹ ہارٹ کے حوالہ کرگیا تھا جس کو میں نے ہندوستانی پڑھانی شروع کردی۔ اس وقت سے لے کر 1835ء تک میں نے انگلستان سے نئے آنے والوں کو ہندوستانی' فارسی اور مراہٹی زبانیں پڑھانی شروع کردیں۔ پڑھانے کے لئے میں ان کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا تھا اس زمانہ میں کہ جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے' میں نے تقریباً سو طالب علموں کو پڑھایا ہوگا اور یہ بات میرے لئے باعث فخر ہے کہ ان میں ہر ایک نے حکومت کی امتحانی کمیٹی سے اچھے نمبر لئے۔ میرے پاس ان تمام اسناد کی ایک کتاب ہے کہ

جو ان افسروں نے مجھے دیں تھیں جنہیں میں نے پڑھایا تھا۔ انہوں نے میری تعریف کچھ زیادہ ہی کردی ہے۔ لیکن میں ضرور کہوں گا کہ اس پیشہ میں، اور دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں کافی بہتر رہا۔

مجھے مسٹر ہارٹ کے پاس ملازمت کرتے ہوئے تین مہینے ہوئے تھے کہ اس کو ایک فوجی دستہ کے ساتھ کرنل بارکلے کی ماتحتی میں نگر پارکر جانے کا حکم ملا۔ اس مہم کا مقصد ایک بلوچ قبیلہ خوجا کہ جو کھوسہ کے نام سے مشہور تھا، اس کو سزا دینا مقصود تھا۔ مجھے اس مہم میں اپنے شاگرد کے ساتھ جانا پڑا اور ہمیں مہوہ کے آرام دہ کنٹونمنٹ کو چھوڑ کر پارکر کے علاقہ میں سفر کرنا پڑا کہ یہاں پر بلوچ لٹیروں نے پناہ لے رکھی تھی۔ ہماری فوج آرام سے بڑودہ ہوتی ہوئی گئی۔ یہاں پر ہم سے ایک اور فوجی دستہ آکر ملا۔ اس کے بعد ہم رادھن پور گئے اور پھر پارکر کا ریگستان عبور کیا۔ یہ علاقہ کوئی چالیس میل لمبا ہوگا او چوڑائی میں دس، بارہ، پندرہ، بیس میل ہوگا۔ اسکے گرد رن کا صحرا اور ریت کے ٹیلے ہیں۔ اس کے ہر گاؤں میں دس یا بارہ کے قریب انتہائی شکستہ جھونپڑیاں ہیں۔ صرف ویروا ایسا گاؤں ہے کہ جہاں چار سو جھونپڑیاں ہین۔ اس کا جو مرکزی شہر ہے اس میں چھ سو کے قریب تنگ و تاریک چھپرے نما مکان ہیں۔

مہوہ سے روانگی کے وقت لیفٹیننٹ ہارٹ کا عہدہ بھی بڑھ گیا تھا اور اعلیٰ افسروں میں اس کے لئے عزت و احترام بھی۔ اسے برگیڈ کا میجر بنا دیا گیا تھا۔ میرے ساتھ اس کا سلوک بھائیوں جیسا تھا اور اس نے اپنے ماتحتوں سے کہہ رکھا تھا کہ مجھے اس کے برابر سمجھیں۔ میرے لئے ایک علیحدہ خیمہ اور سواری کے لئے علیحدہ گھوڑا تھا۔ میں اسے مشکل سے مہینہ میں ایک یا دو بار پڑھاتا تھا۔ میری خواہش تھی کہ میں نے جو اس کا نمک کھایا ہے اور اس کے نیک سلوک سے فیضیاب ہوا ہوں، اس کے لئے کچھ کروں۔ اس لئے میں نے رضاکارانہ طور پر اسکے گھریلو معاملات کا چارج اپنے ذمہ لے لیا۔ اس انتظام سے نہ صرف وہ خوش ہوا بلکہ اس کے دوست بھی۔ جب ہم سفر کرتے تو میں سب سے پہلے اس کا خیمہ کھڑا کرواتا۔ جب ہم قیام کرتے تو میں نظر رکھتا کہ اس کے ملازمین اس کے سامان کی چوری چکاری نہ کریں۔ میرے اس خلوص اور عمل سے ہماری دوستی مضبوط ہوگئی۔

جب ہم بڑودہ پہنچے تو اعلان ہوا کہ یہاں کچھ دن قیام کیا جائے گا۔ ایک لمبے سفر کی تیاری کے لئے لوگوں کو آرام کے لئے کہا گیا، ساتھ ہی میں کھانے کی اشیاء کا بندوست کیا گیا اور مشکوں میں پانی بھرا گیا جو کہ ان کے طویل سفر کے لئے انسانوں اور جانوروں دونوں

کے لئے انتہائی ضروری تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں صبح و شام گھوڑے پر سوار ہو کر شہر کی تفریح کرنے نکل جاتا تھا۔ ہمارے رخصت ہونے سے پہلے ایک صبح کو جب کہ میں شہر میں گھوم رہا تھا ایک مرہٹہ گھڑسوار نے جو دیکھنے میں بانکا و جھیلا لگتا تھا مجھ پر جملے کسے۔ مجھے تنگ کرنے کے لئے وہ اپنے گھوڑے کو کبھی میرے قریب لے آتا' کبھی دونوں جانب سے اور کبھی پیچھے اس طرح سے گھوڑا دوڑاتا جس سے مجھے کمتری کا احساس ہو۔ اس کا مقصد شاید یہ بھی تھا کہ وہ یہ بتانا چاہتا ہو کہ میرے عربی گھوڑے کے مقابلہ میں اس کا خوبصورت اور مزین گھوڑا زیادہ قیمتی اور زیادہ اچھا ہے۔ کبھی کبھی وہ اپنے نیزے کو میری طرف کر کے مجھے ڈراتا اور دھمکاتا تھا کہ بس اب وہ اس کو میرے سینے میں اتارنے والا ہے۔ کبھی وہ گھوڑے کو دوڑاتا ہی جاتا اور ہوا میں رومال اچھا کر اسے دوبارہ سے پکڑ لیتا۔ اس کی ان حرکتوں کی وجہ میں کافی پریشان تھا چونکہ میرے پاس پستولوں کی بہترین جوڑی تھی۔ اس لئے میں نے یہ تہیہ کرلیا تھا کہ اگر اس نے اپنے نیزے یا کسی ہتھیار سے ذرا بھی چھوا تو میں اسے گولی مار کر ہلاک کر دوں گا۔ لیکن یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ میرا مدمقابل خودبخود ست پڑ گیا اور اپنی حرکتوں میں لاپروائی برتنے لگا۔ اس موقع پر اس کے تضیحکانہ عمل کو نوٹس میں لائے بغیر میں نے گھر جانے کا ارادہ کیا' لیکن جیسے ہی میں نے اپنے گھوڑے کو واپسی کے لئے موڑا وہ شخص دوبارہ سے تروتازہ ہو کر نئی توانائی کے ساتھ میرے سامنے آگیا اور پھر گھوڑے کو دوڑاتا ہوا میرے پیچھے ہو گیا' اس دوران میں وہ میرے گھوڑے کے اس قدر قریب ہوا کہ اچانک حادثاتی طور پر اس کا گھوڑا میرے گھوڑے کی دم سے ٹکرا گیا' اس پر میرے شریف عربی گھوڑے نے اپنی پوری طاقت سے اس کے دولتی رسید کی جس کے نتیجہ میں گھوڑا اور اس کا سوار دونوں تین گز کے فاصلہ پر ایک دوسرے سے جدا ہو کر جا پڑے۔ میں جانور کی اس حرکت پر انتہائی حیرت زدہ ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انتقام اس کے ذہن میں پیدا ہو چکا تھا اور وہ محض کسی مناسب موقع کا انتظار کر رہا تھا۔ گرنے کے فوراً بعد' اس کا گھوڑا اپنے سوار کو چھوڑ کر' ایک گھوڑی کے پیچھے ہو لیا کہ اس وقت وہاں سے اپنے سوار کو لے کر جا رہی تھی۔ اس کے بعد اس نے جو کچھ کیا اس کی وجہ سے مارکیٹ میں کافی افراتفری ہو گئی۔

غریب گھڑسوار کی تلوار گھوڑے سے گرنے کے بعد نیام سے باہر نکلی اور اس کے بازو کو معمولی سا زخمی کر دیا جس کی وجہ سے اس کے جسم سے کافی خون بہہ گیا۔ پولیس نے اس حادثہ کا مجھے ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے گرفتار کرلیا۔ زخمی گھڑسوار کہ جس نے شاید اس

سے پہلے کبھی خون نہیں دیکھا تھا' اپنا زخم اور خون دیکھ کر پیلا پڑ گیا اور عورتوں کی طرح چیختے ہوئے بے ہوش ہوکر گر پڑا۔ "تمہاری گھڑسواری کہاں گئی۔" کسی نے مجمع میں سے آواز لگائی۔ "یہ شیخی خورے' چھچھورے لوگ۔" ایک سپاہی نے کہا' جو وہیں کھڑا تھا' "اس قابل ہیں کہ انہیں منڈی میں طوائفوں کی طرح دکھانے کے لئے رکھا جائے۔ ان میں کوئی ہمت و جرات نہیں' بلکہ یہ باعث ذلت ہیں۔"

اپنے ہیرو کو وہاں چھوڑ کر' میں پولیس کے ہمراہ مجسٹریٹ کی عدالت میں آیا جب میں اس کے دفتر پہنچا تو دیکھا کہ ایک موٹا برہمن سلک کی مسند پر گاؤ تکیہ سے سہارا لئے بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے پاس تین محرر اور کچھ چپڑاسی تھے۔ وہاں پہنچ کر میں نے اپنے گھوڑے کو ایک ستون سے باندھا اور مجسٹریٹ کے سامنے جاکر اسے آداب کیا جس کا جواب اس نے انتہائی پرغرور انداز میں دیا اور سر ہلانے کے بجائے اپنے ہاتھ کو اپنی تھوڑی تک بلند کیا۔ اگرچہ میں نے اس کے اس انداز کو بالکل پسند نہیں کیا مگر پھر یہ سوچ کر خاموش ہوگیا کہ آج کا دن میرے لئے نحوست کا دن ہے۔ اس ؑنے اپنے ایک محرر کو حکم دیا کہ میرا بیان لے۔ اس آدمی نے میرا بیان اسی تیزی سے لکھنا شروع کردیا کہ جس رفتار سے میں بول رہا تھا۔ عدالت کو جیسے ہی یہ معلوم ہوا کہ میں کون ہوں اور کس کی ملازمت میں ہوں' اس کا رویہ فوری طور پر بدل گیا' کیپٹن ہارٹ کا نام لیتے ہوئے عدالت کے تمام حاضرین اچانک چوکنا ہوگئے اور مجسٹریٹ کا رعب و دبدبہ بھی کافور ہوگیا بلکہ اس کی جگہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ اس نے مجھ سے درخواست کی کہ اس کے قریب گدی پر بیٹھ جاؤں مگر میں نے شرافت سے اس پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کردیا اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ میں بوٹ پہنے ہوئے ہوں اور ادب اس کی اجازت نہیں دیتا کہ میں اس کی قالین کو خراب کروں۔ یہ سن کر میرے لئے فوری طور پر ایک کرسی منگوائی گئی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسی دوران میں وہ زخمی ہیرو' گھوڑا' گھوڑی اور اس کا سوار ان سب کو عدالت کے سامنے لایا گیا۔ میری شہادت کے بعد' گھوڑی کے مالک کا بیان ہوا کہ جس نے اپنا درد بھرا قصہ عدالت کو سنایا۔ اس کے بعد وہ شیخی خور آیا جو اس وقت بھیڑ کی مانند ناخوش اور سہا ہوا تھا۔ اس کی ساری توجہ اپنے زخم پر تھی کہ جس سے اب تک خون رس رہا تھا۔ ان بیانات کو سن کر عدالت نے اس مسئلہ پر چند منٹ غور کیا اور پھر اپنا یہ فیصلہ سنایا۔

"کرشنا جی ہلکر (اس بزدل گھڑسوار کا نام) چودہ مہینوں کے اندر اندر پانچویں مرتبہ اس

عدالت کے سامنے آئے ہیں، چار مرتبہ یہ اور باعزت لوگوں کے ساتھ جھگڑا کر چکے ہیں، عدالت نے اس سے پہلے اس لئے انہیں چھوڑ دیا تھا کہ شاید وہ خود کی اصلاح کرلیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ عدالت کی اس نرمی نے ان کی حرکتوں میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اب انہوں نے حکومت برطانیہ کے ایک افسر کی بے عزتی کی ہے جبکہ اس افسر کی جانب سے کسی قسم کا جواب نہیں دیا گیا۔ یہ انتہائی گھناؤنا جرم ہے کہ جس کو معاف نہیں کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس قسم کی حرکت سے ایک طاقتور حکومت ہمارے خلاف ہو سکتی ہے۔ لہٰذا ہلکر مذکورہ کو فوری طور پر مہاراجہ کی ملازمت سے برخاست کیا جاتا ہے، اس کی جائیداد ضبط کی جاتی ہے اور اس کو دریائے ریوا کے اس پار جلاوطن کیا جاتا ہے۔ برطانوی افسر کو تلافی کے طور پر ہلکر تلوار دی جاتی ہے اور اس سے کہا جاتا ہے کہ وہ معافی مانگے۔"

اس فیصلہ کو اختصار کے ساتھ لکھوایا گیا اور اس کو ریاست کے بخشی کے پاس روانہ کیا گیا۔ مجھے تلوار، اس شخص کی معافی اور عدالت کی جانب سے تعریف کلمات ملے، اس طرح میں جب گھر لوٹا ہوں تو بطور انعام میرے ہاتھ میں تلوار اور میرے دل میں اطمینان تھا۔

میرے اس طویل عرصہ تک غیرحاضر رہنے کی وجہ سے کیپٹن بارٹ پریشان ہوگیا تھا اور اس کو خدشہ ہوگیا تھا کہ شاید میرے ساتھ کوئی حادثہ ہوگیا ہو۔ اس لئے میں جیسے ہی خیمے میں داخل ہوا وہ مجھے دیکھ کر ننگے سر ہی بھاگتا ہوا آیا اور مجھ سے ایک اچھے انگریز کی طرح گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ خوشی کے عالم میں اس نے انگریزی میں مجھ سے ایک سوال کر ڈالا (اس وقت وہ بالکل بھول گیا کہ مجھے اس کی زبان سے ناواقفیت ہے) "لطف اللہ تمہیں اتنی دیر کیوں ہوگئی؟" میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ مجھ سے کیا سوال کرہا رہا ہے، اس لئے میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ میرے ساتھ کیا ہوا۔ میری کہانی سن کر وہ خوب ہنسا۔

چھٹا باب

اب میں اپنی مہم کی طرف آتا ہوں۔ مرہٹہ گھڑسوار کے خلاف میری کامیابی کے بعد' دوسرے دن صبح کے وقت ہم احمد آباد' کری' سمی' رادھن پور اور سوتی گام ہوتے ہوئے نگرپارکر کی طرف روانہ ہوئے۔ ہم صرف روزانہ دس میل کا سفر طے کرتے تھے۔ سوئی گام سے رات کو ہم نے ناڑا کو عبور کیا جوکہ رن کے علاقہ کی زیادہ ویران جگہ ہے۔ یہاں سے ہم نے ویروا کی طرف سفر کیا جو ہمارا سب سے لمبا اور تھکا دینے والا سفر تھا۔ اس وقت تک ہم تھک کر اس قدر چور ہوگئے تھے کہ باغیوں کی ایک چھوٹی سی جماعت ہماری پوری فوج کو تباہ کرسکتی تھی۔ اس تھکا دینے والے سفر کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ہمیں تازہ پانی نہیں مل رہا تھا۔ اگرچہ پانی کی کافی تعداد ہمارے ساتھ اونٹوں' بیلوں اور گھوڑوں پر تھی' لیکن ناڑا پہنچتے پہنچتے یہ تمام پانی ختم ہو چکا تھا اور ہمیں مجبوراً اس پانی پر بھروسہ کرنا پڑا جوکہ ہمیں قیام کی جگہ پر ملتا تھا۔ یہ پانی انتہائی کڑوا ہوتا تھا' جو نہ تو ہمارے لئے اچھا تھا اور نہ جانوروں کے لئے۔ اس کے پینے سے ہمارے سب کے پیٹ خراب ہوگئے۔ پانی کی کمی یا اس کے ختم ہونے کی وجہ سے ہماری پیاس اور زیادہ بڑھ گئی۔ ہماری فوج کے برہمن سپاہیوں کی حالت خاص طور سے بہت زیادہ نازک ہوگئی تھی کیونکہ وہ ایسے پانی کو چھوتے تک نہ تھے کہ جو مشکوں میں بھرا ہوتا کیونکہ ان کے عقیدے کے مطابق چمڑا پانی کو ناپاک کردیتا ہے۔ ان کو پانی کے جو برتن دیئے گئے تھے ان میں پانی زیادہ مقدار میں نہیں آسکتا تھا۔ اس لئے یہ جلد ہی ختم ہوگیا۔ بہرحال ہمارے افسروں کا انتظام' اور ہمارے لوگوں کی احتیاط کا نتیجہ تھا کہ ہم حفاظت سے نمک کے اس صحرا تک پہنچ گئے۔

رن میں پہنچنے کے بعد ہمیں احساس ہوا کہ اس کا ماحول اس قدر خراب نہیں ہے۔ رن ایک ایسا صحرا ہے کہ جس میں راستوں کے نشانات نہیں ہیں اور یہ دور تک چمکتا ہوا ایک ہی سطح کا نظر آتا ہے۔ جہاں تک صحرا میں نظر جاتی تھی سوائے اس کے اور کچھ نظر نہیں آتا کہ ایک سفید سی چادر بچھی ہوئی ہے اور دور افق میں آسمان اس کو ڈھکے ہوئے ہے۔ اس پورے منظر کی راہ میں نہ تو کوئی درخت تھے اور نہ ہی جانور اور پرندے۔ یہاں

پر جو جھاڑیاں تھیں وہ سراب میں بڑے بڑے درخت اور خوبصورت باغات نظر آنے لگتے تھے۔ جب اس دھوکہ میں آدمی ان کے قریب جاتا تھا تو اس کو اصلیت کا پتہ چلتا تھا۔ زیبرا جانوروں کا گلہ جو تیز رفتاری سے بھاگتا ہوا ہمارے قریب سے گزرا' دور جانے کے بعد وہ ہمیں بڑے بڑے گھوڑوں کی طرح نظر آئے' اور کبھی ایسا معلوم ہوا کہ ہاتھی ہوا میں اڑ رہے ہیں اور زیادہ دور ہوئے تو وہ ہمیں اپنے قلعوں کی طرح نظر آئے جو زمین و خلا کے درمیان معلق ہوں۔ پھر وہ آہستہ آہستہ سائز میں چھوٹے ہوتے ہوئے غائب ہو گئے۔

دیرادا پہنچنے کے بعد میں صبح کو کیمپ سے چلتا ہوا شہر کے باہر گیا تاکہ اگر کوئی دلچسپ چیز ہو تو اس کو دیکھوں۔ میں دیکھ کر حیران ہو گیا کہ وہاں ایک شریف یورپی شخص تھا جو ایک پتھر کی سل پر عربی عبارت کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا جو کہ ایک شکستہ مسجد کی عمارت سے حاصل کی گئی تھی کیونکہ وہ اسے پڑھے بغیر خاموشی سے نقل کر رہا تھا' اس لئے میں سمجھا کہ یہ کوئی معمولی سا پڑھا لکھا شخص ہے کہ جس کو عربی زبان کی پیچیدگی اور جملوں کی ساخت کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے۔ یہ سوچ کر میں نے اپنی پنسل نکالی اور پانچ منٹ میں اس عبارت کی نقل کر لی۔ اس طرح اس کو کافی پیچھے چھوڑ دیا۔ اس کے بعد میں نے اپنی لکھی عبارت کا اصلی سے مقابلہ کیا اور اس عبارت کو زور سے پڑھا۔ جسے اس یورپی نے غور سے سنا۔ میں نے ایک حصہ کو جان بوجھ کر اس لئے غلط پڑھا تاکہ اس کا امتحان لے سکوں۔ اس نے فوراً میری غلطی پکڑ لی اور اس کو درست کیا۔ اس لئے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ پڑھا لکھا اور اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک ہے۔ میں نے ادب سے اس کو سلام کیا اور پھر ہم دونوں نے فارسی زبان میں گجرات کی تاریخ پر تبادلہ خیالات کیا۔ اس کے بعد ہم دونوں نے ایک دوسرے کا نام و پتہ پوچھا اور دو دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔

اس کا نام کیپٹن مائلز تھا اور یہ پالن پور میں ریذیڈنٹ تھا۔ میں اس سے دوبارہ 1844ء میں لندن میں اس کے گھر ملا۔ اگرچہ وہ مجھے اچھی طرح سے یاد تھا مگر وہ خود مجھے بھول چکا تھا۔

یہاں سے نگرپارکر کا فاصلہ تیس میل کے قریب تھا۔ جو ہم نے چار منزلوں کے بعد اطمینان سے طے کیا۔ سفر کے دوران ہمیں کوئی پریشانی پیش نہیں آئی۔ ایک شام کو ہمیں یہ خبر ضرور ملی کہ چالیس میل کے فاصلہ پر باغیوں کا ایک گروہ ہے جو کہ ہمارے کیمپ پر چھاپہ مارنے کا پروگرام بنا رہا ہے۔ یہ سن کر ایک فوجی دستہ بھیجا گیا تاکہ ان پر اچانک چھاپہ مار کر انہیں انہیں کے جال میں گرفتار کر دیا جائے۔ دوسری صبح باغیوں پر حملہ کیا گیا جس میں

ان کے کچھ لوگ مارے گئے' کچھ زخمی ہوئے اور باقی اپنا سامان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے جس پر ہماری فوج نے قبضہ کرلیا' دوسرے دن ہماری بریگیڈ فاتحانہ انداز میں واپس کیمپ میں آگئی۔ لیکن ہمیں اس وقت شدید صدمہ ہوا کہ جب ہمیں پتہ چلا کہ جس جماعت پر حملہ کیا گیا تھا وہ ہمارے دوست تھے۔ انہیں سندھ حکومت کی جانب سے بھیجا گیا تھا تاکہ ہمارے ساتھ تعاون کرتے ہوئے یا تو باغیوں سے صلح کرائیں یا ان کو ختم کرنے میں ہماری مدد کریں یا ان کو مجبور کریں کہ وہ ہتھیار ڈال دیں۔ یہ ایک فاش غلطی تھی کہ ہم غلط فہمی کا شکار ہوئے۔

جب ہم ویروا روانہ ہوئے تو راستہ میں ہمارے دو افسران کو جنہیں علم آثارقدیمہ سے دلچسپی تھی' انہیں ایسے مواقع ملے کہ انہوں نے اپنے علم اور اپنے تجربہ کو پوری طرح سے آزمایا۔ یہاں سنگ مرمر کے بنے ہوئے مختلف سائز کے بت اور بدھ ازم کے دیوی و دیوتاؤں کی شکلیں کافی تعداد میں زمین میں مدفون ہیں۔ انہیں احتیاط سے زمین سے کھود کر نکالا گیا اور ساتھ میں لے لیا گیا۔

نگرپارکر پہنچنے کے بعد جبکہ ہم خیمے گاڑنے میں مصروف تھے اور فوجی دستے ترتیب کے ساتھ گزر رہے تھے کہ اسی وقت باغیوں نے دور سے ہم پر فائرنگ کرنا شروع کردی۔ ان کا خیال تھا کہ ہم میں سے کچھ کو قتل کرکے اور کچھ کو زخمی کرکے وہ ہمیں بھاگنے پر مجبور کردیں گے اور پھر انہیں موقع مل جائے گا کہ ہمارا سامان آسانی سے لوٹ لیں۔ لیکن ہوا یہ کہ ہماری فوج نے فائر کے بعد اپنے خیموں کوچھوڑ دیا اور اپنی پوری توجہ باغیوں کی سرکوبی پر لگا دی۔ تھوڑی دیر میں وہ مجبور ہوئے کہ شہر چھوڑ کر بھاگ جائیں۔ اس کے بعد انہوں نے شہر کی قریبی پہاڑیوں میں پناہ لے لی اور وہاں سے وہ چٹانوں کے پیچھے سے ہم پر فائر کرتے رہے۔ چونکہ یہ جگہ ہماری پہنچ سے دور تھی' اس لئے ہم ان کے خلاف کوئی اقدام نہیں کرسکے۔ ان کی فائرنگ کا سلسلہ تین بجے تک جاری رہا مگر وہ ہمیں کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکے۔ اس دوران کچھ گولیاں سنسناتی ہوئی میرے سر پر سے بھی گزریں۔ چار بجے کے قریب باغی پہاڑوں اور وادیوں میں روپوش ہوگئے۔ ہم ان کے خلاف اس لئے کچھ نہیں کرسکے کہ یہ راستے ہمارے لئے اجنبی تھے جبکہ وہ ان سے بخوبی واقف تھے۔

اس جھڑپ میں قریب تھا کہ کیپٹن ہارٹ کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑتے اور یہ کسی دشمن کی گولی سے نہیں ہوتا بلکہ خود اپنے ہاتھوں ہوتا۔ اس نے ایک سپاہی کے ہاتھ سے بندوق لے کر کھوسہ باغیوں پر فائرنگ شروع کردی اور جوش میں اس قدر آگے بڑھا کہ ایک

چٹان کے کنارے پہنچ کر نیچے گرنے والا تھا کہ اس سپاہی نے کہ جس کی بندوق سے وہ فائر کررہا تھا' اسے گردن سے پکڑ کر اوپر اٹھا لیا۔ اس نے اس سپاہی کو اس کی توقع سے زیادہ انعام سے نوازا۔ سپاہی کے لئے یہ رقم اتنی زیادہ تھی کہ اس نے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور واپس اپنے گاؤں جاکر باقی زندگی بڑے آرام سے کاٹی۔ دو سال پہلے جب وہ بحیثیت سپاہی کے ملازم ہوا تھا تو اس کی حالت گنوار اور اجڈ لوگوں میں تھی' لیکن ایک لمحہ کی بہادری نے اس کی زندگی کو بدل دیا اور اس کی قسمت ایسی چمکی کہ وہ اپنے گاؤں میں انتہائی قابل احترام اور باعزت شخص بن گیا۔

اس معمولی سے واقعہ کے بعد ہماری فوج لودھرانی سے ہوتی ہوئی بھوج پہنچی۔ رن کو دوبارہ سے عبور کرتے ہوئے ہمیں پھر انہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جو کہ پہلے سفر میں ہمیں درپیش آئیں تھیں۔ لیکن اس خیال سے کہ اس صحرا سے گزرنا ایک کارنامہ ہے۔ اس نے ہمیں تقویت دی۔ جلد ہی ہم کچھ کے علاقے میں داخل ہوئے اور بھوج کی طرف پیش قدمی شروع کردی جو کہ اس صوبہ کا مرکز تھا۔ یہاں تک جانے کے لئے ہم نے انجار کا راستہ اختیار کیا' یہ اس صوبہ کا مشہور شہر ہے اور 18 جون 1819ء میں اس کا قلعہ زلزلہ کی شدت سے بے انتہا متاثر ہوا تھا۔ جب ہم بھوج پہنچے تو کیپٹن ہارٹ کو شدید بخار چڑھ گیا جس کی وجہ سے وہ بھوج میں ریذیڈنسی میں رک گیا۔ ہماری فوج کھیرا کی طرف بڑھی جو کہ بھوج اور منڈاوی کے درمیان واقع ہے۔ یہاں پر کرنل' ایل - اسٹین ہوپ کی سرکردگی میں دوسرے فوجی دستے بھی آکر مل گئے۔ ان کا مقصد تھا کہ سندھ کی گورنمنٹ کو اس فوجی کارروائی سے دہشت زدہ کیا جائے۔

کیپٹن ہارٹ کی بیماری نے طول پکڑ لیا اور وہ تین ہفتہ تک بستر پر رہا۔ اس عرصہ میں میں نے ایک بھائی کی طرح اس کی تیمارداری کی۔ صحت یابی کے بعد میں نے محسوس کیا وہ بے انتہا چڑچڑا ہوگیا ہے اور بجائے اس کے کہ میرا شکرگزار ہوتا' اس نے یہ ظاہر کیا کہ میں نے جو کچھ کیا ہے وہ میرا فرض تھا۔ لہٰذا جب میں اس سے رخصت ہوا تو ماحول دوستانہ نہیں تھا۔ جب میں نے اس کی ملازمت چھوڑی ہے تو میں نے خود کو اس دنیا سے بڑا بیزار پایا اور یہ سوچا کہ منڈاوی سے جہاز میں بیٹھ حج کے لئے مکہ کے لئے روانہ ہو جاؤں میں نے اپنی خواہش کا اظہار اپنے دوست منشی ابا میاں اور محمد سید خاں سے کیا جو کہ رام پور کے ایک شریف خاندان سے تھے اور جو حادثاتی طور پر اس دور دراز مقام پر مل گئے تھے۔ ان دونوں حضرات نے میرے منصوبے کی مخالفت کی کیونکہ میرے پاس جو پیسے

تھے وہ اخراجات کے لئے کافی نہ تھے۔ ابا میاں نے کہا کہ وہ قطعی طور پر میری خواہش کی تکمیل سے انکار نہیں کرتے' لیکن وہ یہ سمجھتے ہیں کہ حج پر جانے پہلے میں کوئی ملازمت کر کے پیسے جمع کروں اور پھر اپنی خواہش کو عملی جامہ پہناؤں۔

میں نے اپنے ان دو مہربان دوستوں کی نصیحت پر عمل کیا۔ منشی مجھے کھیرا کے کیمپ سے بھوج لے گیا جہاں میں لیفٹیننٹ ایچ - اسپنیر کو ہندوستانی پڑھانے پر مقرر ہوا اور اس رجمنٹ کے کیپٹن بیگ نولڈ کے لئے فارسی میں بمبئی کی تاریخ نقل کرنے کی ذمہ داری بھی لے لی۔ جب میں کھیرا میں تو' تو میں نے منڈاوی کا ایک چکر لگایا تھا اور زندگی میں پہلی مرتبہ سمندر کا نظارہ کیا تھا۔ جب میں نے وسیع عریض سمندر میں پانی کو موجیں مارتا اور اس کے اتار و چڑھاؤ کو دیکھا تو میں خدا کی قدرت اور اس طاقت کا اور قائل ہوگیا کیونکہ اس کے سامنے یہ پوری کائنات ایک معمولی ذرہ کے برابر ہے۔ ان خیالات میں غرق ایک دن میں ساحل پر کھڑا ان بڑی بڑی موجود کو دیکھ رہا تھا کہ جو جہاز کو ہچکولے دے رہیں تھیں تو اس وقت میرے ذہن میں جین مت کی یہ تعلیم آئی کہ دنیا میں سوائے مادہ کے اور کوئی چیز ابدی نہیں ہے' میں نے ابھی اس کفرانہ خیال کو قبول بھی نہ کیا تھا کہ اچانک خاموشی سے پیچھے آکر ایک کتے نے زور سے میری ٹانگ میں کاٹ لیا اور مجھے میرے گناہ کی سزا دے کر فوراً بھاگ گیا۔ میں کچھ دور اپنی لکڑی سے اسے مارنے بھاگا تاکہ اپنے زخم کا انتقام لوں' مگر وہ کتا فوراً میری نظروں سے غائب ہوگیا۔ میں گھر واپس لوٹ کر آیا ہوں تو میری ٹانگ میں سخت درد تھا۔ دوسرے دن میں کھیرا واپس گیا اور وہاں اپنے فرائض میں مشغول ہوگیا۔ کام میں' میں صبح سے شام تک مصروف رہتا تھا۔ رات کو میں ابا میاں کے ساتھ گزارتا۔ ان سے میں نے انگریزی حروف تہجی سیکھے اور جلد ہی اس قابل ہوگیا کہ ہندوستانی اور فارسی رومی رسم الخط میں لکھ سکو اور روانی کے ساتھ پڑھ سکوں۔ اس وقت سے لے کر 1829ء تک میرا یہ دستور رہا کہ میں سونے اس وقت جاتا تھا کہ جب انگریزی کے دس الفاظ زبانی یاد کرلیتا تھا۔ میں نے ڈاکٹر گلکرانسٹ کی گرامر کی کتاب کو بھی غور سے پڑھا' نتیجہ یہ ہوا کہ آٹھ سال کی محنت کے بعد میں نے انگریزی زبان پر کہ جو دنیا کی مشکل ترین زبان ہے عبور حاصل کرلیا۔

کچھ سے دوارکا جانے سے پہلے' میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس کے بارے میں کچھ ذکر کروں۔ یہ علاقہ ہندوستان کے دوسرے زرخیز علاقوں کے مقابلہ میں قطعی دلفریب نہیں ہے۔ یہاں تازہ پانی کے کوئی دریا نہیں ہیں۔ لیکن یہاں کے باشندوں کے لئے وہ چشمے کو جو

کچھ پہاڑیوں سے نکلتے ہیں' باعث نعمت ہیں' لیکن یہ چشمے بارش کے موسم کے ختم ہوتے ہی خشک ہو جاتے ہیں۔ ان چشموں کے خشک حصہ میں یہاں کے لوگ گڑھے کھود کر اپنی ضروریات کے لئے پانی جمع کرلیتے ہیں۔ ہر شہر اور گاؤں میں کنویں موجود ہیں۔ جوکہ پانی کی ضرورت تو پوری کرتے ہیں' مگر پانی کی کوالٹی خراب ہوتی ہے۔

یہاں پر قہر خدا کے نشانات' موجودہ زمانے اور ماضی کے' واضح طور پر موجود ہیں۔ پہاڑیوں کی سطح پر آتش فشاں مادہ بکھرا ہوا ہے۔ ان میں سے کچھ بڑے بڑے جلے ہوئے پتھر ہیں' اور کچھ باریک ذرے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے جو زلزلہ آیا تھا اس نے انجار اور بھوج کے قلعوں میں دراڑیں ڈال دیں ہیں۔ اس کے جھٹکے اس قدر شدید تھے کہ بہت سی عمارتیں اور پہاڑیوں کے چھوٹے قلعہ گر کر ملبہ کا انبار ہوگئے۔ لوگوں کی کافی تعداد مکانات کے گرنے سے ان میں دب گئی اب یہ لوگ روز قیامت ہی اپنی جگہوں سے اٹھیں گے۔ اگرچہ ظاہرا طور پر تو یہاں کے لوگ اچھے ہی نظر آتے ہیں' لیکن جب ان میں رہا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اخلاقی طور پر ان کا معیار کوئی بلند نہیں ہے۔ شاہراہوں پر لوٹ مار' ڈکیتی' اور چوری چکاری کو یہاں بہادری سمجھا جاتا ہے۔ ناجائز جنسی تعلقات کا ہونا اور بچوں کو مار ڈالنا' بلکہ اس سے بھی گھناؤنے جرم کا ارتکاب کرنا' ان کے لئے معمولی بات ہے۔

بچوں کو قتل کرنا جوکہ تمام جرائم میں سب سے زیادہ قابل مذمت جرم ہے' اس کا یہاں پر عام رواج ہے۔ یہ جرم کوئی عام آدمی ہی نہیں کرتے ہیں بلکہ یہاں کے حکمران طبقے اس میں بری طرح سے ملوث ہیں۔ خاص طور سے جاریجہ راجپوت جن کا تعلق سندھ سمہ قبیلہ سے ہے اور جوکہ اس ملک پر قدیم زمانہ سے حکومت کرتے ہیں۔ ان کے حکمرانوں کا خطاب جام ہے۔ یہ لوگ اس قابل نفرت جرم کو شاید اپنے ساتھ اپنی آبائی وطن سے یہاں لائے ہوں۔ شاید یہ ہندوؤں کی رسم نہ ہو جوکہ اس عمل سے نفرت کرتے ہیں۔ جاریجہ قبیلہ کے لوگ خود کو دوسرے راجپوت قبیلوں سے برتر سمجھتے ہیں اس لئے ان کا خیال ہے کہ اپنی لڑکیوں کو شادی میں دے دیا گیا تو ان کی بے عزتی ہوگی۔ اس بے جا فخر نے ان کے دلوں کو سخت کردیا ہے اور وہ بچوں کے قتل میں اس حد تک چلے گئے ہیں کہ جب میں نے کچھ میں معلومات کیں تو پتہ چلا کہ یہاں کی کل آبادی پانچ لاکھ نفوس پر ہے ان میں سے تیرہ ہزار جاریجہ میں' ان میں سے صرف سیتیس عورتیں ہیں۔ خوش قسمتی سے اب یہ ملک برطانیہ کی زیر نگرانی آرہا ہے۔ اس کے وفات شدہ راجہ راؤ کو انگریزوں نے بدعنوانیوں کی وجہ سے حکومت سے محروم کر دیا تھا۔ اب اس کا نابالغ لڑکا راؤ دیسالجی اس کا جانشین

ہے۔ اس کی بلوغت تک حکومت کا کام برطانوی حکومت سنبھالے ہوئے ہے۔ اور اس نے ملک کی اصلاح کے لئے کئی اقدامات کئے ہیں۔

میں کھیرا کے کیمپ میں ملازمت کرتے وقت ایک قریبی مسجد میں رہا تھا اور اپنے دوست ابا میاں کی صحبت سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ میری دعا ہے کہ خدا' ان کی مہربانی اور مدد کی بنا پر جو انہوں نے میرے ساتھ کی' ان کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔ وہ انگریزی سکھانے والے میرے اول اور آخری استاد تھے۔ کیونکہ ان کے بعد میں نے یہ زبان کتابوں کی مدد سے سیکھی۔ جیساکہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں جب میں نے کیپٹن بیگ نولڈ کے لئے کتاب کی نقل مکمل کرلی تو اس نے مجھے اس کا اچھا انعام دیا۔ جب سال ختم ہونے کو آیا تو یہ حکم آیا کہ ہماری فوج کا ایک حصہ سمندر کے ذریعہ دوارکا اور بیٹ کے جزیروں میں کرنل ، ایل اسٹین پوپ کی سرکردگی میں جائے تاکہ وہاں باغیوں کو سزا دی جا سکے۔ چونکہ میرے شاگرد اسکالر کی رجمنٹ کا تعلق اس سے تھا اس لئے ہم سفر کے لئے منڈاوی کی بندرگاہ کے لئے روانہ ہوگئے۔ صبح سے پہلے ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ صبح صبح میری آنکھ توپ کے چلنے سے کھلی۔ یہ پہلی مرتبہ تھا کہ میں موذن کی اذان کے بجائے توپ کے گولوں کی آواز سے سو کر اٹھا۔ ہم دریائے گھومتی سے ذرا فاصلے پر اترے۔ یہاں لڑائی جاری تھی اور دشمن کی توپوں کے کچھ گولے ہمارے سروں کے اوپر سے گزرے۔ اس وقت ایک انگریز جہاز بندرگاہ پر آیا اور اس نے قلعہ پر گولے برسانا شروع کردیئے۔ ایک دوسری جماعت میریٹ کی ماتحتی میں قلعہ کی فصیلوں پر چڑھنے لگی۔ غریب ماریٹ جیسے ہی فصیل چڑھ کر قلعہ پر پہنچا تو وہاں اس کو قلعہ والوں نے تلواروں سے کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور اس کا جسم نیچے پھینک دیا۔ یہی کچھ حشر اس کے چند ساتھیوں کا ہوا لیکن یہ سلسلہ کوئی زیادہ دیر نہیں چلا۔ قلعہ والے تربیت یافتہ منظم فوج کے آگے نہیں ٹھہرسکے اور جلد ہی ان میں بھگدڑ مچ گئی۔ قلعہ میں دشمنوں کی تعداد چھ سو کے قریب تھی۔ جلد ہی مقابلہ میں چند کے علاوہ سب ہی مارے گئے۔ مقامی ہندوستانی فوج کے دستہ نے کیپٹن سولیر کی سرکردگی میں اس دستے پر حملہ کیاکہ جو قلعہ سے باہر آیا تھا۔ یہ بڑی بہادری سے لڑے اور مردانہ وار لڑتے ہوئے مارے گئے۔ اس لڑائی میں کیپٹن سولیر کے ہاتھوں کی انگلیاں تلوار کی کاٹ سے کٹ گئیں۔ اس میں کچھ لوگ زخمی ہوئے مگر ہمارا جانی نقصان نہ ہونے کے برابر تھا۔

ہماری اس شاندار فتح کے بعد' اس جگہ پر کہ جو ہندو بت پرستوں کے لئے بڑی مقدس

ہے، ہمیں یہ حکم ملا کہ یہاں ہم کچھ دنوں کے لئے قیام کریں۔ قیام کے دوران میں نے اس جگہ کو خوب گھوم پھر کر دیکھا اور اس وقت میری حیرانی کی انتہا نہیں رہی کہ جب میں نے یہاں ایک مسلمان صوفی کی درگاہ کو پایا جو "پیر پٹہ" کے نام سے امارہ جزیرہ پر ہے۔ یہ درگاہ کفر کے اندھیرے میں اسلام کی روشنی بن کر چمک رہی ہے۔ ہماری رجمنٹ کو حکم ملا کہ ہم گھیر کے پہاڑوں میں کاتیز اور کمانی قبیلوں کے باغیوں کا خاتمہ کریں۔ جنہوں نے جوکی داس کی سرکردگی میں بغاوت کی آگ بھڑکا رکھی ہے۔ ہم ایک ہندوستانی جہاز پر سوار ہوئے اور اٹھارہ گھنٹے کے تکلیف دہ سفر کے بعد سریا بندرگاہ پر اترے۔ یہاں سے ہم نے اپنی رجمنٹ کو دو کمپنیوں میں تقسیم کیا اور کاتیز قبیلہ کا گھر تار کے پورے علاقہ میں پیچھا کیا۔

یہاں پر پہاڑوں کی اونچائی ہندوستان کے دوسرے پہاڑوں کی طرح نہیں ہے۔ اس لئے ہرے بھرے اور سبز پہاڑوں کو دیکھ کر بڑا اچھا لگا۔ یہ جگہ تمام ہندوؤں کے لئے انتہائی مقدس ہے۔ اس کا قدیم نام ان کے ہاں ریوات چل ہے ان پہاڑوں کی ایک شاخ گوئل وار میں پالی تانہ تک پھیلی ہوئی ہے یہاں پر کئی قسم کے جین مت کے مندر ہیں جو کہ اس کے ماننے والوں کے لئے انتہائی قابل احترام ہیں۔

ان پہاڑوں میں کثرت سے جانور و پرندے ہیں۔ جن میں خطرناک شیروں سے لیکر تیتر تک شامل ہیں۔ ان پہاڑوں کی ویرانی میں ہندو سنیاسی عبادت میں مشغول پائے جاتے ہیں۔ وہ دنیا کے تمام بکھیڑوں سے دور اس جگہ خاموشی اور تنہائی کے ساتھ غورو فکر میں محو رہتے ہیں۔ ان سنیاسیوں کی خوراک اس جگہ پیدا ہونے والی سبزی ہے۔ آگ وہ چقماق کے ذریعہ جلاتے ہیں تاکہ سردی میں خود کو گرم رکھ سکیں۔ وہ اپنے جسم پر راکھ مل لیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے جسم کے مسان بھر جاتے ہیں اور انہیں پھر کپڑوں کی ضرورت نہیں رہتی ہے۔ ایک ایسا شخص اس طرح سے دس یا بارہ سال رہنے کے بعد جانوروں کی طرح ہو جاتا ہے جو انسانوں کو دیکھ کر بھاگتا ہے۔ یہاں اکثر لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ یہ سنیاسی آدم خور ہیں اور اگر کوئی تنہا شخص ان کے ہتھے چڑھ جائے تو یہ اس کو کھا جاتے ہیں۔ مگر یہ سب ناقابل یقین اور غلط ہے۔

ایک صبح کو جب میں اپنے اسکالر شاگرد کے ساتھ جا رہا تھا تو ہم نے مادہ اور روح کے موضوع پر گفتگو شروع کر دی۔ اسے اس موضوع میں اس قدر دلچسپی نظر آئی کہ اس نے اپنی جماعت کو ایک دوسرے عہدے دار کے سپرد کیا اور مجھ سے کہا کہ ہم ذرا شاہراہ سے الگ ہٹ کر دور بغیر کسی دخل اندازی کے آرام سے گفتگو کریں۔ ہم دونوں نے اپنے

گھوڑوں کا رخ موڑا اور اپنی جماعت سے علیحدہ ہوگئے۔ لیکن یہ خیال بھی رکھا کہ ہم کہیں ان سے بچھڑ نہ جائیں۔ اچانک ہمارا واسطہ جلتی ہوئی آگ کے ڈھیر سے پڑا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ وہاں کسی انسان کا نام و نشان نہ تھا۔ آگ پوری طرح سے جلی ہوئی تھی۔ اس لئے وہاں کسی کا موجود ہونا لازمی تھا۔ ہم نے اپنے چیروٹ سلگائے اور اپنے سائسوں سے پوچھا کہ اس ویران جگہ میں آگ جلنے کے کیا معنی ہیں۔ ان دونوں نے بیک وقت ایک سا ہی جواب دیا کہ اس آگ کا تعلق "اغوری بابا" سے ہے اور ہمارا یہاں پر زیادہ دیر ٹھہرنا خطرناک ہے۔ اس پر ہمیں ہنسی آگئی اور ہم اس پر زیادہ دھیان دیئے بغیر آگے کی جانب بڑھ گئے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد ہم وادی میں پہنچے جو کہ بہت زیادہ گہری تھی۔ اوپر سے جب ہم نے نیچے کی طرف دیکھا تو ایک سنیاسی نظر آیا جو کہ ہم سے ایک ہزار گز کے فاصلہ پر ہوگا۔ وہ بری طرح بھاگ رہا تھا اور بار بار اپنے پیچھے دیکھتا تھا کہ کوئی اس کے تعاقب میں تو نہیں آرہا ہے۔ غریب سائسوں نے جب یہ دیکھا تو وہ ڈر کے مارے کانپنے لگے۔ جب وہ سنیاسی قریب آیا تو وہ اس کے سامنے جھک گئے اور اپنے سر زمین پر رکھ دیئے۔ میرا یورپی اسکالر یہ دیکھ کر اس کے قریب گیا اور چاہا کہ اس سے کچھ گفتگو کرے، مگر اس کے بجائے وہ رکتا اور کوئی جواب دیتا، وہ ہمیں دیکھ کر اور زیادہ تیزی سے دوڑنے لگا۔ اس پر ہم نے ٹیلسکوپ کے ذریعہ اس کو غور سے دیکھا۔ وہ مضبوط اور طاقتور شخص تھا۔ اس کے سر پر لمبے سفید بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی لمبی اور پھیلی ہوئی داڑھی کی بھی یہی کیفیت تھی۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے اور اس کے جسم پر بھبوت ملی ہوئی تھی۔ ابھی اس کو ہم نے اس قدر دیکھا تھا کہ وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

ہماری جماعت کی اگلی منزل تلسی شام تھی، یہ ہندوؤں کی خانقاہ تھی جو کہ پہاڑ کے بالکل بیچوں بیچ تھی۔ پروگرام یہ تھا کہ یہاں پر تمام فوجی دستے جمع ہوں اور پھر ان کو باغیوں کے خلاف بھیجا جائے۔ ہم تلسی شام خیریت سے پہنچ گئے جہاں پہلے ہی سے کچھ فوجی دستے موجود تھے۔ فوج میں اس وقت رسد کی کمی کی عام شکایت تھی۔ خاص طور پر سے میری طرح کے لوگ کہ جن کو کمپنی کے ملازمین طرح بھتہ ملتا تھا، سب سے زیادہ پریشان تھے۔ بھوک اور فاقہ کی شکایتیں کمپنی کے کمانڈر کے سامنے لائی گئیں۔ اس نے خانقاہ کے مہنت سے اس مسئلہ میں گفتگو کی اور اس کو دھمکی دی کہ اگر وہ ہمیں معلومات اور رسد بہم نہیں پہنچائے گا تو وہ یہ حکم دے گا کہ خانقاہ کو کہ جس میں کافی تعداد میں اناج موجود ہے۔ اس کو لوٹ لیں۔ اس دھمکی نے اس بوڑھے مہنت کے ہوش ٹھکانے لگا دیئے۔ اس نے بتایا کہ

اس علاقہ میں گیہوں اور چاول بالکل نہیں ہیں۔ اس کے اسٹور میں باجرہ ہے جس کو وہ ابھی پسواتا ہے۔ لہٰذا فوراً چکی کہ جس کے پاٹ دو بیل چلا رہے تھے حرکت میں آگئی اور اس قدر باجرہ پیس دیا گیا کہ جو پوری فوج کی ایک دن کی خوراک کے لئے کافی تھا۔ یہ اس نے ہر شخص کو آدھ سیر کے حساب سے دیا اور اس کے ساتھ ہی گھی اور شیرا بھی تقسیم کیا۔ اس کے بدلے میں اس نے کسی قسم کی رقم قبول نہیں کی۔ اس نے کہا کہ یہ اشیاء اس کی ذاتی نہیں ہے۔ دوسرے وہ کوئی اناج کا بیوپاری نہیں ہے۔ یہ اناج اس کو خیرات میں تقسیم کرنے کو دیا گیا تھا' لہٰذا وہ انہیں یہ اس نیت سے دیر رہا ہے۔ اس طرح اس کھانے سے ہماری ضرورت پوری ہوگئی۔ لیکن ہم میں سے جو اس کھانے کے عادی نہ تھے وہ پوری طرح سے مطمئن نہیں ہوئے۔ میرا تعلق بھی انہیں لوگوں میں سے تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے میرا پیٹ خراب ہوگیا۔ لیکن جب مجھے اچھا کھانے کو ملا تو اس کا علاج بھی ہوگیا۔ مجھے اچھا کھانے کو کیسے ملا' یہ اس طرح سے ہوا کہ اپنی بیماری کی حالت میں' میں ایک مسلمان جو نان کمیشنڈ افسر تھا' اور جس کا نام سکندر خان تھا' اس سے ملا۔ یہ بھتہ کا حقدار تھا۔ اس لئے جب اسے میری بیماری کا پتہ چلا تو اس نے اپنے حصہ میں سے کچھ چاول مجھے دے دیئے جس سے مجھے اور میرے ملازم کو تکلیف سے نجات مل گئی۔ میں اس کی اس مدد سے اس کا بے انتہا شکر گزار ہوا' جب سے ہم دونوں ایک دوسرے کے گہرے دوست ہیں۔

تلسی شام ہندوؤں کے ہاں ایک مقدم جگہ ہے کیونکہ یہاں پر کرشن کا ایک چھوٹا بت ہے۔ اس کے سامنے ہی معدنیات کا چشمہ ہے۔ یہ دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ اس میں کافی گندھک ہے کہ جس کو بو دور تک آتی ہے۔ چشمہ کے پانی کو اردگرد دیواریں بنا کر محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اس میں نیچے جانے کے لئے سیڑھیاں ہیں۔ چشمہ کا پانی ابلتا ہوا ہے' اس کی گرمی کو عقیدت مند کرامت قرار دیتے ہیں۔ اس لئے اگر کوئی اس پانی سے غسل کرے یا جسم صاف کرے تو عقیدہ ہے کہ اس کی نجات ہو جائے گی۔

یہاں پر ہمارا قیام چار دن رہا۔ اس کے بعد ہم چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں بٹ کر کئی سمتوں میں چلے گئے۔ چھ ہفتوں تک پہاڑوں میں سیر و سیاحت کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ اب اس علاقے میں کوئی ڈاکو اور لٹیرا باقی نہیں رہا ہے۔ چھٹے دن صبح کے وقت' جب ہم تلسی شام سے چلے اور تھوڑی دور بعد آموں کے درختوں کے جھنڈ کے قریب پہنچے تو یہاں ہمیں سخت قسم کی بدبو آئی۔ جب ہم اور قریب گئے تو دیکھا کہ چار ڈاکوؤں کی لاشیں درخت پر لٹکی ہوئی ہیں۔ ان کے جسم پر تشدد کے نشانات تھے اور سارا منظر دیکھنے میں

انتہائی دل ہلا دینے والا تھا۔ اس بربریت کا مظاہرہ' گیکواڑ فوج کے ایک دستہ نے کیا تھا۔ جو ہمارے ساتھ تعاون کررہا تھا' اور یہاں ہم سے تین دن پہلے آیا تھا۔ اس طرح پہاڑوں میں تین مہینے تک گھومنے پھرنے کے بعد آخر کار ہمیں بتایا گیا کہ باغیوں پر قابو پا لیا گیا ہے' یا تو انہیں گرفتار کرلیا گیا ہے یا ختم کردیا گیا ہے' للذا ہمیں حکم ہوا کہ ہم دھاری کی طرف جائیں اور وہاں بارش کے موسم ختم ہونے تک قیام کریں۔

میرا اسکالر شاگرد جو بڑا محنتی اور پڑھنے کا شوقین نوجوان تھا' وہ سفر ہو یا قیام' کبھی اپنا سبق نہیں چھوڑتا تھا۔ مون سون موسم کے ختم ہوتے ہوتے وہ ہندوستانی زبان کا ماہر ہو چکا تھا۔ اس کے بعد اس نے درخواست دی کہ اسے بمبئی میں امتحان کی اجازت دی جائے۔ میں اس کے ساتھ گوگو تک گیا اور یہاں ہم 17 ستمبر 1821ء کو دوستوں کی طرح سے ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ اس نے بطور انعام مجھے نقد روپیہ دئے' یہ میری تنخواہ کے علاوہ تھے۔ میں نے اسے امتحان میں کامیابی کی نیک تمناؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ بعد میں مجھے خبر ملی کہ اس نے امتحان میں شاندار کامیابی حاصل کرلی ہے اور جلد ہی اسے رجمنٹ میں کوارٹر ماسٹر کا عہدہ ملنے والا ہے۔

گوگو ایک چھوٹا قصبہ ہے جو کمبے کے مغربی حصہ میں واقع ہے۔ یہاں پر مسلمانوں کے تقریباً تین ہزار گھرانے ہیں۔ روایات کے مطابق پیرم کا جزیرہ پرانے زمانوں میں گوئل راجپوتوں کا صدر مقام تھا۔ بعد میں یہ گجرات کے جزیرہ نما سے مل گیا۔ یہ جزیرہ اب ویران ہے۔ یہاں حکومت نے لائٹ ہاؤس تعمیر کرا دیا ہے۔ یہاں پر کئی قسم کے سانپوں کی بکثرت آبادی ہے۔ جانوروں اور درختوں کے فوسلز یہاں پر تھوڑی سے کھدائی پر دستیاب ہو جاتے ہیں۔ بہت سے یورپی سیاح ان کو بطور نادر اشیاء کے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔

گوگو کی مسلمان آبادی بہت تیزوطرار' صحت مند اور بہترین ملاح ہیں۔ میں یہاں تین یا چار دن رہا۔ اس کے بعد وہاں سے جہاز میں سوار ہوکر سورت چلا گیا۔ مجھے جہاز پر بتایا گیا کہ یہاں پر کسٹم لوگ ہر مسافر کو تنگ کرتے ہیں۔ چاہے اس کے پاس بیچنے کا سامان ہو یا نہ ہو۔ اس لئے میں پہلے سے تیار ہوگیا اور آٹھ آنے رشوت دیکر میں نے خود کو اور سامان کو خاموشی سے باہر نکلوا لیا۔ لیکن اس کے لئے مجھے رات کا انتظار کرنا پڑا۔ رات کے اندھیرے میں دو ملاحوں نے میرا سامان اٹھایا اور مجھ سے کہا گیا کہ میں ان کے پیچھے پیچھے چلوں۔ یہاں سے ہم ایک جگہ پہنچے جسے بادشاہی بھاگل یا شاہی دروازہ کہتے ہیں۔ یہ کہنے کو دروازہ ہے' مگر یہاں اس کا کوئی نام و نشان نہیں سوائے دو ٹوٹی ہوئی دیواروں کے' کہ جن

کے درمیان ایک راستہ ہے۔ میں اپنے رہنما کے پیچھے پیچھے جارہا تھا کہ تھوڑی دیر چلنے کے بعد بدقسمتی سے کسٹم ہاؤس کے ایک چپڑاسی نے اس آدمی کو پکڑ لیا کہ جو میرا سامان اٹھائے ہوئے تھا اور اسے قاعدہ و قانون کی خلاف ورزی پر برا بھلا کہنا شروع کردیا۔ وہ اصرار کرنے لگا کہ ہمیں کسٹم ہاؤس لے کر جائیگا اور اس جرم میں رات بھر قید میں رکھے گا۔ دوسرے دن ہم پر جرمانہ عائد ہوگا اور ہمارا سامان ضبط کرلیا جائے گا۔ میں یہ سن کر ڈر گیا اور اس کی دھمکیوں کو حقیقت سمجھنے لگا۔ لیکن ملاح جو شاید ان سب باتوں کا تجربہ رکھتا تھا' اس نے خاموشی سے ان سب باتوں کو سنا اور اس سے کہا کہ یہ کوئی تاجر نہیں ہے اور نہ ہی اس کے پاس تجارت کا کوئی سامان ہے' اور پھر یہ اس کے لئے تیار ہے کہ اس کو بطور رشوت کچھ دیدے۔

یہ کہتے ہوئے اس نے میرے چٹکی لی کہ میں اس کی نصیحت پر عمل کروں۔ اس پر میں نے اس شخص کو وہ رقم دی کہ جس کا مجھ سے کہا گیا تھا' اس پر وہ کچھ کہے بغیر خاموشی سے چلا گیا۔ میں نے رات کو ایک مسجد میں قیام کیا کیونکہ اتنی رات گئے میرے لئے کوئی رہائش تلاش کرنا مشکل تھا۔

25 ذالحجہ 1236ھ جوکہ عیسائی سنہ کے حساب سے 23 ستمبر1821ء ہوگی' جب میں گہری نیند سے موذن کی اذان پر آرام سے اٹھا تو میں نے اپنے ملازم کو آواز دیتے ہوئے کہا " اسماعیل ذرا حقہ کو گرم کر دو تاکہ میں نماز سے پہلے اس کے دو ایک کش لگا لوں۔" لیکن مجھے اس وقت سخت حیرانی ہوئی جب میں نے دیکھا کہ وہاں اسماعیل کا کوئی وجود نہیں تھا۔ میں نے کہا کوئی بات نہیں۔" دنیا کے حالات بھی عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ میں نے ایک رات میں وہ کچھ کھو دیا کہ جسے چار سال کی مدت میں حاصل کیا تھا' خدا عظیم ہے! انسان کی تقدیر میں لکھا ہے وہ تو پورا ہوکر رہتا ہے۔" یہ سوچتے ہوئے میں نے اپنے بستر کو ٹٹولا کہ جس میں' میں نے ایک چھوٹا سا بکسہ اور دوسری چیزیں باندھ دیں تھیں۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ یہ سب چیزیں اپنی جگہ پر تھیں۔ وہ لڑکا صرف اپنے سامان اور تین روپیہ لے گیا تھا کہ جو میں نے اسے خرچہ کے لئے دیئے تھے۔

جب دن کا اجالا ہوا تو میں سامان کے ساتھ مسجد کے باہر کھڑا ہوکر کسی مزدور کا انتظار کرنے لگا کہ جو میرا سامان کرائے کے مکان تک لے جائے کہ جس کا انتظام مسجد کے موذن نے کیا تھا۔ میں نے کھڑے کھڑے دیکھا کہ مسلمان چاہے امیر ہوں یا غریب' وہ پالکیوں'

بیل گاڑیوں' یا پیدل ایک ہی سمت میں جارہے ہیں۔ اور ان کے چہروں سے افسوس و صدمہ کا اظہار ہورہا ہے۔ میرے معلوم کرنے پر بتایا کہ شہر کا نواب' نصیرالدین خان کا کل رات انتقال ہوگیا ہے اور یہ سب اس کی تجہیز و تکفین میں جارہے ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ نواب کے دو لڑکوں میں سے ایک کا 18 مہینہ پہلے انتقال ہوگیا تھا' یہ لڑکا اپنے کردار اور خوبیوں کی وجہ سے سب لوگوں میں مقبول تھا' اس کا دوسرا لڑکا اس کے بالکل برعکس ہے اور بری صحبت و عادتوں کی وجہ سے بدنام ہے۔ لیکن یہ امید کی جاتی ہے کہ انگریزی حکومت اسے اپنے باپ کا جانشین تسلیم کرے گی' جس کے بعد اسے ڈیڑھ لاکھ روپے سالانہ کی پنشن اور وہ دوسری تمام مراعات ملیں گی جو اس کے خاندان کو دی گئی ہیں۔

سورت شہر میں کہ جسے باب المکہ بھی کہا جاتا ہے' وہاں میں چار دن ٹھہرا اور اس عرصہ میں اس شہر کو دیکھا کہ جہاں حج پر جانے سے پہلے حاجی لوگ قیام کرتے ہیں۔ یہی وہ جگہ ہے کہ جہاں سب سے پہلے انگریز ہندوستان میں آئے۔ انگریزوں میں سب سے پہلے آنے والا کیپٹن ہاکنس تھا جو 1608ء میں یہاں آیا۔ اس کا مقصد تھا کہ اپنی قوم کے تاجروں کے لئے تجارتی مراعات حاصل کرے۔ اس نے اپنے کچھ ساتھیوں کو سورت میں چھوڑا اور خود جہاں گیر سے ملنے کے لئے دربار روانہ ہوگیا تاکہ اس سے مراعات کا فرمان حاصل کرسکے۔ اس نے خود کو انگلستان کے بادشاہ کا سفیر کہا جس کی وجہ سے دربار میں اس کی آؤ بھگت ہوئی۔ اس نے بادشاہ کی خدمت میں معمولی سے تحفے پیش کئے اور درباریوں کو رشوت دے کر اپنی مرضی کا فرمان حاصل کرلیا۔ دربار میں اس کو قیمتی خلعت دیا گیا اور ساتھ ہی میں ایک عیسائی کنیز بھی اسے دی گئی جو کہ حادثاتی طور پر قیدی کی حیثیت سے بادشاہ کے حرم میں آگئی تھی۔

سورت کا شہر دریائے تاپتی کے جنوب میں واقع ہے۔ اس کے اردگرد فصیل کی شکل کمان کی طرح ہے۔ شہر کا رقبہ تقریباً چھ میل کا ہوگا۔ فصیل پر تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر برج بنے ہوئے ہیں۔ اس کی بلندی کہیں سے تیرہ اور کہیں سے اٹھارہ فٹ ہے۔ یہ شروع ہی سے کوئی مضبوط فصیل نہیں ہے اور جب سے تعمیر ہوئی ہے اس کی مرمت بھی نہیں ہوئی۔ اس لئے اس وقت اس کی حالت انتہائی خراب ہے۔ اس میں بارہ دروازے ہیں۔ اس کے بعد ایک اندرونی فصیل ہے مگر اس کی حالت اس سے بھی زیادہ خراب ہے اور یہ اکثر جگہ سے بالکل گر چکی ہے۔

1512ء میں شہر کی کوئی فصیل نہیں تھی۔ اسی زمانہ میں اسے پرتگالیوں نے لوٹا تھا۔

اس لوٹ مار کے بعد سے یہ چھوٹا سا قصبہ کئی مرتبہ لٹیرے عیسائیوں اور جنجیرہ جزیرہ کے افریقی وحشیوں کے ہاتھوں تباہ ہوا۔ اس لئے گجرات کے بادشاہ بہادر شاہ کے حکم پر احمد آباد کے حکام نے اس شہر کے گرد یہ فصیل اور قلعہ تعمیر کرایا۔ جو 1530ء میں جاکر مکمل ہوا۔ اس تعمیر کا انچارج رومی خاں تھا جو کہ ایک ترکی غلام تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہر زوال پذیر ہے۔ اس کی آبادی اس وقت صرف ایک لاکھ پچیس ہزار ہے۔ یہ اس کی آبادی کا صرف چھٹا حصہ ہے کہ جو آج سے ساٹھ سال پہلے تھی۔ یہاں کی حکومت مکمل طور پر انگریزوں کے ماتحت ہے۔ یہاں پر چوبیس کے قریب انگریز عہدیدار اور صدر عدالت موجود ہے۔ پیادہ فوج کی دو رجمنٹیں اور ایک جماعت گولہ اندازوں کی یہاں موجود رہتی ہے۔ فوج کی موجودگی شاید ہمسایوں کو ڈرانے کے لئے ہو۔ لیکن حکومت کے اخراجات اس وجہ سے بہت بڑھے ہوئے ہیں۔

میں نے پارسیوں کے قبرستان کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا۔ اس لئے میں چاہتا کہ اس شہر میں جہاں ان کے قبرستان تھے ان کا مشاہدہ خود کرو۔ اس لئے ایک صبح جبکہ میں جانے کی تیاری کررہا تھا' میرے موذن دوست نے مجھے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا کہ میں ایسا ہرگز نہیں کروں۔ کیونکہ ان کے قبرستان میں ان کا مذہبی پجاری ہمیشہ نگرانی کے لئے رہتا ہے اور اگر کوئی اجنبی شخص وہاں جاکر دیکھنے کی کوشش کرے تو وہ سمجھتے ہیں کہ اس سے ان کی جگہ ناپاک ہوجائے گی۔ اس لئے یا تو وہ اسے سخت سزا دیتے ہیں یا مار ڈالتے ہیں۔ میرے دوست کی تنبیہہ نے میری خواہش کو کم کرنے کے بجائے اور بڑھا دیا اور میں نے کہا کہ "چاہے جو کچھ بھی ہو' اب تو میں نے اسے دیکھنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

جب اس نے دیکھا کہ میں اپنے ارادے سے باز نہیں آؤں گا تو وہ مجھ سے کہنے لگا کہ اچھا رات ہونے تک انتظار کرو' کیونکہ وہ میرے ساتھ جائے گا اور اس مہم میں میری مدد کرے گا۔ چنانچہ ہم دوپہر کے بعد روانہ ہوئے اور شہر کے مشرقی دروازے سے ایک میل کے فاصلہ پر ہمیں کئی مینار نظر آئے کہ جن پر کافی تعداد میں ایسے بدصورت گدھ بیٹھے ہوئے تھے کہ جن کے سر گنجے تھے اور کوئی پر نہیں تھے۔ ہم ایک درخت کے نیچے رک گئے اور اندھیرا ہونے کا انتظار کرنے لگے تاکہ نہ تو ہمیں پارسیوں کا پجاری دیکھ سکے اور نہ کوئی مسافر یا چرواہا۔ جب اندھیرا ہوا تو میں نے اپنے دوست کو درخت کے سایہ میں چھوڑا اور خود مینار کی جانب روانہ ہوا۔ میرے دوست نے کہا کہ میں پوری طرح سے محتاط رہوں۔ اگر اس نے کسی شخص کو میری جانب جاتے دیکھا تو وہ زور سے کھنکارے گا' جسے سن کر میں

فوراً بھاگ کر اس درخت کی طرف آجاؤں گا۔ میں اپنے دوست کا شکریہ ادا کرکے روانہ ہوا اور اپنی منزل پر ایک منٹ کے اندر اندر پہنچ گیا۔ میں بند دروازے کے سہارے دیوار پر چڑھا' اور یہاں سے میں نے ایک ڈراؤنا منظر دیکھا۔ انسانی ڈھانچے کچھ پورے اور کچھ ٹکڑے ٹکڑے ہوئے ہوئے۔ کفن کے ٹکڑوں میں ادھر ادھر پڑے تھے۔ وہاں اس قدر انسانی جسم کی بدبو تھی کہ میں پانچ منٹ سے زیادہ دیر نہیں رک سکا۔ لہٰذا میں نے جلدی جلدی اترنا شروع کیا۔ ہوا یہ کہ' بدقسمتی سے اترتے ہوئے دیوار پر سے میرا ہاتھ پھسل گیا اور میرا پیر جو دروازہ پر رکھا تھا' وہ الجھ گیا' اس کی وجہ سے میں اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا اور زور سے زمین پر گرا۔ گرنے کی آواز اور دروازے کی کھڑکھڑاہٹ سے پارسی چوکیدار جو ایک قریبی جھگی میں تھا' وہ غصہ میں گالیاں دیتا اور برا بھلا کہتا باہر آیا۔ وہ زور زور سے چیخ رہا تھا کہ کوئی اس کی مدد کو آئے کیونکہ چور اسے مار ڈالنے والے ہیں۔ یہ شور اور میرے دوست کی کھنکار نے مجھے چوکنا کردیا اور میں بھاگ کر درخت کے پاس پہنچ گیا۔ یہاں سے ہم نے دیکھا کہ غریب چوکیدار ایک بوڑھا' کمزور' اور تقریباً اندھا ہے' کیونکہ ہماری طرف آنے کے بجائے وہ دوسری طرف چلا گیا۔ جب وہ جارہا تھا تو اپنے ڈنڈے سے راستہ ٹٹولتا جاتا تھا۔ وہ مسلسل بڑبڑا رہا تھا اور زور زور سے بول رہا تھا' تاکہ اس کی زبان اس کمی کو پورا کرے دے کہ جو اس کے پاس نہیں ہے۔ اس کی مدد کے لئے کوئی نہیں آیا اور ہم خاموشی سے وہاں سے چل دیئے۔ گھر پہنچ کر میں نے اپنی خراشوں کو عرق گلاب سے دھوکر صاف کیا۔

26 ستمبر کی صبح کو میں سورت سے بھڑوچ کے لئے روانہ ہوا۔ میں نے تین قلیوں کو ساتھ لیا کہ جو میرا سامان لے کر میرے ساتھ چلے۔ انہیں میں ہر گاؤں پہنچنے کے بعد بدل لیا کرتا تھا۔ میں نے ان کی مزدوری حساب سے زیادہ ہی دی۔ جب میں انہیں تاڑی کی بنی شراب پلاتا کہ جس کے وہ بے حد شوقین تھے۔ تو اس کے بعد سے وہ میرے مرید ہو جاتے تھے۔ تین میں سے دو میرا سامان اٹھاتے' اور تیسرا میرے لئے حقہ تیار کرتا اور جب میں آرام کرتا تو میرے جسم کی مالش کرتا۔ راستہ میں یہ چھتری اٹھائے چلتا تاکہ میں سورج کی گرمی سے بچا رہوں۔ تاڑی' اس علاقہ کے لوگوں کی کمزوری بھی ہے' اور یہ ان کے لئے زہر قاتل بھی۔ اس کی دکانیں یہاں ہر گاؤں میں موجود ہیں۔ یہاں تک کہ شاہراہوں پر بھی یہ موجود ہیں۔ آپ کو یہ ایک یا دو میل سے نظر آجاتی ہیں۔ یہ کسی درخت کے سائے میں ہوتی ہیں' اور ان کے اوپر ایک جھنڈا ہوا میں لہرا رہا ہوتا ہے۔ اس کا مالک اکثر مہذب

پارسی ہوتا ہے جو کہ اپنی میٹھی زبان سے آپ کو ورغلاتا ہے کہ اس کا ایک گلاس پی لیا جائے۔ یہ شیطانی مشروب ان غریب اور ان پڑھ لوگوں میں ہزارہا برائیوں کا سبب بنتا ہے۔

میں 30 ستمبر کی شام کو بھڑوچ پہنچ گیا۔ سورت سے یہ تیس میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہاں آتے ہوئے میں نے راستہ میں ایک جگہ قیام کیا جو چوکیکے نام سے مشہور ہے۔ بھڑوچ اگرچہ زرخیز علاقہ میں واقع ہے مگر شہر انتہائی ٹوٹا پھوٹا اور بدصورت ہے۔ یہ دریائے نربدا کے کنارے واقع ہے۔ یہ دریا 25 میل کے فاصلہ پر کمبے میں جاکر سمندر میں گرتا ہے۔ یہاں کے مکانات بھی سورت کی طرح کے ہیں' لیکن اس کی گلیاں بہت تنگ اور گندی ہیں۔ جیساکہ مجھے بتایا گیا' اس کی آبادی تیس ہزار کے قریب ہوگی۔ اب یہ انگریزوں کے قبضے میں ہے جسے انہوں نے 1803ء میں دولت راؤ سندھیا سے لیا تھا۔ اگرچہ میں ایک دن اور دو راتوں کے قیام کے بعد اس شہر کے بارے میں بہت کچھ تو نہیں بتا سکتا' لیکن جو بھی میں نے ذاتی طور پر دیکھا ہے اس کی بنیاد پر میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کی عادات اور اخلاق ایسے نہیں ہیں کہ جن کی تعریف کی جائے۔ میری خواہش تھی کہ اگر ممکن ہو تو میں دریائی راستہ سے دھرم پوری تک جاؤں' مگر مجھے بتایا گیا کہ دریا میں کئی ایسے مقام آتے ہیں کہ جہاں کشتی نہیں جاسکتی ہے اس لئے یہ سفر کے لئے مناسب نہیں ہے۔

اس سے پہلے کہ میں بھڑوچ کو چھوڑوں' میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ایک عجیب چیز کا ذکر کروں کہ جسے لوگ مقامی پیر سید اسماعیل شاہ' جو کہ عوام میں پیر چھتر کے نام سے مقبول ہے' اس سے بطور معجزہ منسوب ہے۔ میں اس پیر کی درگاہ کو دیکھنے گیا جو کہ شہر سے باہر ایک اونچے ٹیلے پر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مقبرہ تین سو سال پرانا ہے۔ یہ ایک معمولی سا بنا ہوا مقبرہ ہے جس کے اردگرد دیواریں ہیں۔ اس پر کھیرنی کے درخت کا سایہ ہے۔ اس کے بیچوں بیچ ایک حوض ہے۔ اس کے درمیان میں چھوٹے سے ٹیلہ پر ایک اور قبر ہے۔ یہ حوض ہمیشہ ٹھنڈے پانی سے بھرا رہتا ہے۔ جبکہ ذائقہ شورہ کا ہوتا ہے۔ کئی سو زائرین ہر جمعرات کو یہاں آتے ہیں۔ اور یہاں سے مٹکے بھر کر پانی پینے کے لئے لے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود یہاں پر پانی کبھی کم نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی پانی زیادہ ہوتا ہے۔ بلکہ اپنی مقدار کے مطابق رہتا ہے۔ جب میں وہاں گیا ہوں تو اس وقت تقریباً پچاس لوگ موجود تھے۔ ہم سب نے وہاں پانی پیا۔ مگر اس کی مقدار میں ذرا بھی کمی نہیں آئی۔ اس جگہ کا چوکیدار ایک بوڑھا آدمی ہے کہ جس کی عمر تقریباً سو سال کی ہوگی' اس نے مجھے بتایا کہ جب وہ لڑکا تھا اس وقت یہاں ایک مرہٹہ سردار آیا اور معجزہ کا امتحان لینے کی خاطر اس نے اپنے تین

ہاتھیوں کو اس حوض میں سے پانی پلانا شروع کیا۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ پانی کی مقدار اتنی ہے تو پھر وہ مقبرہ کی دہلیز پر سجدہ ریز ہوگیا اور حکم دیا کہ مقبرہ اور اس کے اردگرد دیواروں کی اس کے خرچہ پر مرمت کرائی جائے۔

جو کچھ میں نے سنا اور دیکھا اس کی بنیاد پر میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ مقدس پانی کسی چشمہ کے ذریعہ یہاں آتا ہے لیکن اس کا میں کوئی جواب نہیں دے سکتا کہ آخر اس کی مقدار ایک جیسی کیوں رہتی ہے اور اس میں کمی و بیشی کیوں نہیں ہوتی ہے۔

بھڑوچ سے آرام سے سفر کرتا ہوا دو دن میں میں بڑوڈہ پہنچا جہاں مجھے محرم کی وجہ سے سات دن تک ٹھہرنا پڑ گیا۔ میں جیسے ہی شہر میں داخل ہوا' اتفاق سے میری ملاقات نواب میر امیرالدین خاں اور ان کے عملہ سے ہوگئی۔ چونکہ میں ان سے پہلے مل چکا تھا۔ اس لئے انہوں نے مجھے پہچان لیا اور خواہش ظاہر کی کہ میں ان کے ہاں رہوں۔ لیکن میں چاہتا تھا کہ میں اپنی رہائش کا خود ہی بندوبست کروں اور بغیر کسی دخل اندازی کے آزادی سے رہوں' اس لئے میں نے نواب صاحب سے معذرت کرلی۔ میں نے ان سے کہا کہ میں اور میرا پورا گھرانہ ان کا شکر گزار ہے کہ ان کے مرحوم والد نے اس وقت ہماری مدد کی تھی کہ جب ہم پریشانی کے عالم میں تھے' ہم اس قابل تو نہ ہو سکے کہ ان کی مہربانی کا بدلہ دیتے' لیکن ہم سب ان کے ہمیشہ احسان مند رہیں گے اور خدا تعالیٰ سے دعا کرتے رہیں گے کہ وہ انہیں ہمیشہ خوش و خرم اور خوش حال رکھے۔ لیکن اس آدمی میں جو نیکی اور خاطر مدارات کا جذبہ تھا' وہ میری باتوں سے ختم نہیں ہوا۔ وہ اپنے گھوڑے سے اترا اور میرا ہاتھ پکڑ کر زبردستی مجھے اپنے گھر لے گیا اور مجھے علیحدہ سے ایک کمرہ دیا کہ جہاں میں آرام سے رہوں۔ یہاں میں نے ایک ہفتہ گزرا' جس میں' میں شہر بھی گھوما اور اس عالی مرتبت شخص کی صحبت سے فائدہ بھی اٹھایا۔ اس کے بعد میں نے اس سے درخواست کی مجھے میرے شہر جانے کی اجازت دی جائے۔ اس نے اجازت دیتے ہوئے مجھے قیمتی لباس اور نقد روپیہ دیئے۔ یہ شریف نواب 1837ء میں اس دنیائے فانی سے کوچ کرکے راہ عدم کو روانہ ہوا۔ اس نے اپنے دو بھائیوں میں سے ایک کو بطور اپنے جانشین کے چھوڑا۔ اگرچہ وہ مرحوم ہو چکا ہے' مگر اس کی اچھی یادیں اب تک میرے دل میں موجود ہیں۔

10 اکتوبر کو بڑودہ سے چل کر میں تیرہ دن میں حفاظت کے ساتھ اپنے شہر پہنچ گیا۔ یہاں اپنے ماموں' نانی اور گھر کے دوسرے لوگوں سے مل کر مجھے انتہائی خوشی ہوئی۔

میرے پہنچنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد ہمارا نوجوان شہزادے روم چندر راؤ گوالیار جانے

کی تیاری کررہا تھا۔ جہاں اس کی شادی سندھیا کی لڑکی سے ہونے والی تھی۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا سوچا تاکہ گھر کی روزمرہ کی زندگی سے چھٹکارا پالوں۔ میں نے ایک گھوڑا خریدا اور اس جماعت کے ساتھ اس امید میں ہولیا کہ شاید اس طرح سے مجھے ملازمت مل جائے۔ کچھ چلنے کے بعد راستے میں ہمیں انگریز پولیٹیکل افسر مسٹر رابن سن ملا جوکہ شہزادے کے ساتھ شادی میں شرکت کرنے جارہا تھا۔ راجہ نے اس کا استقبال بڑے احترام کے ساتھ کیا۔ اس نے راجہ اور اس کے وزیر راگھو ناتھ راؤ باپو کو کچھ خطوط فارسی زبان میں لکھے ہوئے دیئے۔ وہ راجہ کے پاس کچھ دیر ٹھہر کر' تھوڑی دور نصب اپنے خیمہ میں چلا گیا۔ راجہ کے عملہ میں کوئی ایسا نہیں تھا کہ جو فارسی زبان سے واقف ہو' لہٰذا یہ خطوط ان کے لئے سربستہ راز رہے۔ وزیر نے فوراً معلومات کرائیں کہ کیا کیمپ میں کوئی ایسا شخص ہے کہ جو فارسی سے واقف ہو۔ اس پر دربار میں میرا تعارف فارسی کے استاد کی حیثیت سے کرایا گیا۔ دربار پہنچ کر میں شہزادے اور درباریوں کو آداب بجا لایا۔ اس پر مجھے بیٹھنے کو کہا گیا اور کاغذات میرے حوالے کئے گئے۔ تاکہ میں انہیں زور سے پڑھوں۔ یہ کام میں نے انتہائی قابلیت اور اطمینان سے کیا۔ درباری اس بات پر بڑے حیران ہوئے کہ میں نے اس کے ساتھ ان کا ترجمہ مراٹھی زبان میں بھی کردیا۔ وزیر' جوکہ چالاک' ہوشیار' عقلمند آدمی معلوم ہوتا تھا' وہ میرے کام کی اس بجا آوری سے بڑا خوش ہوا۔ جب میں وہاں سے چلا آیا تو اس نے فوراً اپنے کلرک کو میرے پاس بھیجا اور پچاس روپیہ ماہوار پر مجھے ملازمت کی پیشکش کی۔ شام کا کھانا و ناشتہ اور گھوڑے کا الاؤنس اس کے علاوہ۔ چونکہ میں آیا اسی مقصد کے لئے تھا' اس لئے میں نے اس پیشکش کو فوراً قبول کرلیا۔

وزیر کی ملازمت میں میرے فرائض کچھ زیادہ نہ تھے۔ مجھے دن میں دو مرتبہ دربار جانا ہوتا تھا' یا تو راجہ یا وزیر' یا دونوں کو آداب کرنے کے لئے۔ میں مہینے میں ان کے لئے دو یا تین خطوط لکھا کرتا تھا۔ کبھی کبھی دوپہر کو مجھے اس کے ساتھ شطرنج کھیلنی ہوتی تھی' جس میں مجھے ہارنا ہوتا تھا' لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ وزیر کو مجھ سے اچھا کھیلنا آتا تھا۔ اگر وہ انصاف سے کام لیتا تو تیسرے یا چوتھے کھیل میں' میں ضرور جیت جایا کرتا۔ لیکن افسوس کہ وہ اس کھیل میں بے ایمانی کرتا تھا۔ جب کبھی میں اس کی کوئن کو مار لیتا تو یا تو وہ دوبارہ سے کوئن واپس مانگ لیتا' یا چال بدلنے پر اصرار کرتا۔ چونکہ میرا عہدہ اتنا بڑا نہیں تھا کہ میں انکار کرتا اس لئے ہر بار میں اس کی بات مان لیتا تھا جس کے نتیجہ میں آخرکار میری ہار ہوتی تھی۔ اس پر وہ تو بے انتہا خوش ہوتا' مگر میرا دل اس سے اداس ہو جاتا تھا۔ اس کے

علاوہ وہ بڑی ہوشیاری سے ہر اس موقع پر مجھے کاٹ دیتا تھا کہ جب میں شہزادے کی نگاہوں میں آتا اور اس کی توجہ مجھ پر ہوتی۔ اس کے اس رویہ کی وجہ سے میں اس سے خوش نہیں تھا۔

جب شادی پوری شان و شوکت کے ساتھ ختم ہوگئی' تو ہم سب کو سندھیا کے محل میں دعوت دی گئی۔ یہاں پر انتہائی لذیذ کھانوں اور بہترین رقص و موسیقی سے ہماری خاطر تواضع کی گئی۔ اس کے بعد قیمتی خلعتیں ہم سب کو ہمارے رتبہ کے اعتبار سے دی گئیں۔ اس کے بعد عطر اور عرق گلاب کے ساتھ سونے کے ورقوں میں لپٹے ہوئے پان دیئے گئے۔ اس کا مطلب تھا کہ اب رخصت ہوا جائے۔ اس کے بعد سوائے دلہا کے سب رخصت ہوگئے' اس کے بعد محل میں اسے شب عروسی کے لئے کمرہ دیا گیا کہ جہاں وہ چلا گیا۔

اس کے ایک ہفتہ بعد واپسی کے سفر کی تیاریاں شروع ہوئیں اور دو مہینہ کے قیام کے بعد ہم سندھیا کے ہاں رخصت ہوئے۔ اب ہمارا چھوٹا سا کیمپ سائز میں بڑا ہوگیا تھا' اس میں اب ایک ہاتھی' سازوسامان سے مرصع گھوڑے تھے۔ چھت دار گاڑیاں تھیں کہ جن میں زیورات اور روپیہ پیسہ تھا۔ حرم کے لئے شاندار خیمہ تھا۔ اس کے علاوہ مرد و عورت ملازم۔ ایک حفاظتی دستہ جو ایک تجربہ کار مرہٹہ سردار کی سربراہی میں تھا۔ اس سازوسامان اور لوگوں کے ہمراہ ہم سترہ دن میں حفاظت کے ساتھ اپنی منزل مقصود کو پہنچ گئے۔

مرہٹوں کے ساتھ رہنے کے دوران ایک واقعہ اور ایسا ہوا کہ جن کی وجہ سے میری طبیعت بے انتہا حالات سے متنفر ہوگئی۔ ہوا یہ کہ جیسے ہی ہم واپس پہنچے' وزیر کے آدمیوں نے ہم سب سے وہ خلعتیں واپس لے لیں جو کہ ہمیں دعوت کے موقع پر دی گئی تھیں اور انہیں سرکاری خزانے میں جمع کرا دیا گیا۔ دیکھا جائے تو یہ عمل انتہائی گرا ہوا اور کمینہ پن کا تھا' اور ان کے لئے مناسب نہیں تھا کہ جو خود کو سرکار اور ریاست کہتے ہیں۔ بعد میں ان لباسوں کو مارکیٹ میں فروخت کرکے دوسرے سستے کپڑے ان کے بدلے خرید لئے گئے جنہیں لوگوں میں تقسیم کیا گیا۔ اس تقسیم کے وقت بھی مجھے بھلا دیا گیا۔ جب ہم بھیلسہ پہنچے اور وہاں قیام کیا تو ایک دن کلرک ایک بنڈل لئے ہوئے میرے پاس آیا اور بنڈل کھول کر اس میں سے ایک پگڑی و ایک جوڑی شالوں کی مجھے وزیر کی جانب سے دی۔ یہ لباس اس خلعت کے مقابلہ میں جو ہمیں دی گئی تھی بہت ہی کم تر تھا۔ اس میں وہ ہار بھی نہیں تھا کہ جس کی قیمت دو سو روپیہ تھی اور جو میری خلعت کے ساتھ تھا۔ میں نے اس آدمی سے پوچھا کہ کیا وہ بتا سکتا ہے کہ جو چیزیں مجھے سندھیا کے دربار سے ملیں تھیں وہ

اس میں کیوں نہیں ہیں؟ اس نے اس کا کوئی صاف جواب تو نہیں دیا۔ مگر اپنی گفتگو سے یہ ضرور بتا دیا کہ یہ جو کچھ ہوا ہے اس ستم کا شکار سب ہی ہیں۔ اس نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ میں اس تحفہ کو بظاہر خوشی کیساتھ" لے لوں۔ اس قسم کے پیغامبر جو کہ دربار سے تحفہ تحائف لے کر آتے ہیں' وہ یہ توقع کرتے ہیں کہ انعام پانے والا ان کی خدمت میں کچھ پیش بھی کرے۔ لہٰذا میں نے انہیں وہ تحفہ پیش کردیا کہ جو وہ لایا تھا مگر اس نے یہ لینے سے انکار کردیا۔ اس پر میں نے اسے اس کی توقع سے زیادہ انعام دیا تاکہ وہ اپنے آقا سے میری فیاضی اور میرے آزادانہ خراج کے بارے میں بتا سکے۔

مختصراً یہ کہ گھر پہنچ کر میں نے وزیر کی خدمت میں اپنا استعفیٰ پیش کردیا۔ مجھے اس پر فخر ہے کہ میں نے اپنا استعفیٰ واپس نہیں لیا حالانکہ میرے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس کی معافی وزیر نے مانگی اور میرے تنخواہ بڑھانے کا وعدہ کیا' مگر یہ ساری باتیں میرے ارادے میں حائل نہیں ہوئیں اور میں دوبارہ سے آزاد ہوگیا۔

ملازمت چھوڑنے کے بعد کچھ دنوں تک میں بیکاری کی حالت میں رہا۔ انہی دنوں ڈیوڈ آکٹرلونی ہمارے شہر میں راجہ سے ملاقات کرنے آیا۔ اگرچہ بظاہر تو اس کا مقصد شادی کی مبارکباد دینا تھا' مگر درحقیقت یہ سیاسی معاملات تھے کہ جو اسے اس شہر تک لائے تھے۔ اس موقع پر اس مشہور بوڑھے جنرل نے ہماری درگاہ کی زیارت کی اور ہمیں نقدی کی صورت میں تحفہ دیا۔ اگرچہ اس کا تحفہ سر جان مالکم سے زیادہ تھا' مگر اس کی ملاقات سے ہمیں وہ خوشی نہیں ہوئی کہ جو سر جان مالکم کی خوش اخلاق اور دوستانہ گفتگو سے ہمیں ہوئی تھی۔ میں نے اس کے لئے دروازے لکھے ہوئے عربی و فارسی میں لکھے گئے کئی کتبات پڑھے' اس پر اس کو اندازہ ہوا کہ میری قابلیت اس کے دو مقامی ہندوستانی فارسی کے سیکرٹریوں سے زیادہ ہے۔ یہ دو کرم خاں اور حافظ ابوالحسن تھے۔ مجھے ان پر اس لئے سبقت ہوگئی کہ میں اسی جگہ کا رہنے والا تھا اور یہ کتبات مجھے زبانی یاد تھے۔ جب کہ ان دونوں کو روانی کے ساتھ پڑھنے میں دقت ہورہی تھی۔ جب میں ایک کتبہ کو فرفر پڑھ رہا تھا' تو جنرل نے میرا امتحان لینے کی غرض سے مجھے روکا اور کہا کہ میں ان الفاظ کی نشان دہی بھی کروں کہ کہاں ہیں۔ میں نے اسی وقت اس جگہ کی طرف اشارہ کردیا۔ اس سے وہ بہت خوش ہوا اور بعد میں مجھے علیحدہ سے انعام سے نوازا۔

ساتواں باب

راگھوناتھ راؤ باپو کی ملازمت چھوڑنے کے بعد چار مہینے تک میں گھر پر رہا۔ اس عرصہ میں روزمرہ کے معمولات سے تنگ آکر 1823ء کے شروع میں' میں نے سوچا کہ میں انگریزوں کو پڑھانے کا سلسلہ دوبارہ سے شروع کردوں تاکہ میرے لئے ترقی کی راہیں کھل سکیں۔ یہ ملازمت حاصل کرنے کے لئے مجھے انگریز دوستوں کی مدد کی ضرورت تھی۔ چونکہ میرے علاقے میں یہ دوست نہیں تھے' اس لئے میں نے چھٹی رجمنٹ اور اپنے سابق شاگردوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنی شروع کیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ میرا ایک سابق شاگرد گوگو میں تھا اور وہاں سے تبادلہ کے بعد اب وہ ستارا میں ہے۔ میں نے یہ سن کر پکا ارادہ کرلیا کہ میں اس سے ملنے وہاں جاؤں۔ میں نے جب نقشہ میں اس کے بارے میں دیکھا تو معلوم ہوا کہ سب سے قریبی راستہ خاندیش ہوکر ہے۔ لیکن اونچے پہاڑ' گھنے جنگل وحشی جانوروں اور ڈاکوؤں کی آماجگاہ تھے' اور اس علاقہ کی بدامنی کو دیکھتے ہوئے میں نے اس راستہ کو اختیار کرنے کا ارادہ ترک کردیا' اس کے برعکس دوسرے پیچیدہ راستے کو اختیار کیا جو بڑوڈہ سورت اور بمبئی ہوتے ہوئے جاتا ہے۔ دوبارہ گھر چھوڑنے کے بعد بارہ روز کے اندر اندر میں سورت پہنچ گیا۔ یہاں سے میں ایک کشتی میں سوار ہوکر بمبئی کے لئے روانہ ہوا کہ جس کے بارے میں میں نے بہت کچھ پڑھا اور سنا تھا۔ خوشگوار موسم اور موافق ہوا کی وجہ سے سفر اچھا گزرا اور سورت سے رخصت ہونے کے چار دن بعد ہم نے پریذیڈنسی کے جزیرہ کو دیکھا' جو چاروں طرف سمندر سے گھرا ہوا تھا۔ اس کے بعد ہمیں اونچی اور خوبصورت پہاڑیاں نظر آئیں۔ اس کے مغربی حصہ میں سوائے سمندر کے اور کچھ نہیں تھا۔ جب ہم بندرگاہ میں داخل ہوئے تو وہاں میں جہازوں کی تعداد دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ان میں سے کچھ پانی میں تیرتے ہوئے قلعے تھے۔ پہلی نظر میں مستول اور بادبان دیکھ کر یہ خیال گزرتا ہے کہ یہ جہازوں کا گھنا جنگل ہے۔ ان کے مقابلہ میں ہماری کشتی کی حالت ایسی تھی کہ جیسے وہ ایک چھوٹی سی چڑیا ہو۔

اس کے بعد جس چیز نے متاثر کیا وہ قلعہ تھا کہ جو بلندوبالا اور خوبصورت عمارتوں سے

گھرا ہوا تھا۔ یہ ان تمام قلعوں سے مختلف تھا جو میں نے اب تک دیکھے تھے۔ یہ یورپی طرز کا بنا ہوا تھا اور اس کی دیواریں موٹی اور مضبوط تھیں' اگرچہ یہ بہت زیادہ اونچی نہیں تھیں۔ اس کے آگے ایک چوڑی خندق تھی کہ جو پانی سے بھری رہتی تھی۔ اس کے دروازوں کے سامنے پل تھے۔ جو خطرہ کے وقت ہٹا دیئے جاتے تھے۔ ایک ہی نظر ڈالنے پر محسوس ہوتا تھا کہ یہ قلعہ ناقابل تسخیر ہے۔

قلعہ کے اندر عیسائیوں کے لئے کیتھڈرل اور گودی کا احاطہ ہے۔ کیتھڈرل میں ہر اعلیٰ و ادنیٰ عیسائی اتوار کے روز عبادت کے لئے آتا ہے۔ گودی کے احاطہ میں تقریباً ایک ہزار لوگ ملازم ہیں جو جہازوں کو بنانے اور ان کی مرمت میں مصروف رہتے ہیں۔ ان لوگوں کو اچھی تنخواہیں ملتی ہیں۔ کسی کو اس بات پر مجبور نہیں کیا جاتا ہے کہ وہ بغیر اجرت کے کام کرے۔

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جگہ جو اب ایک اہم اور مشہور شہر کی حیثیت اختیار کر رہی ہے' ماضی میں یہ ایک نامعلوم اور چھوٹا سا ماہی گیروں کا گاؤں تھا جو کہ ضلع اورنگ آباد میں آتا تھا۔ 1494ء میں واسکو ڈی گاما کی آمد کے بعد جب پرتگالی یہاں آئے تو وہ اس جزیرے کی خوبصورتی اور اہمیت دیکھ کر بے انتہا متاثر ہوئے۔ کیونکہ یہ ایک محفوظ بندرگاہ کے طور پر ان کے کام آسکتا تھا۔ اس لئے انہوں نے اس کو حاصل کرنے کا تہیہ کیا اور 1530ء میں ہمایوں کے دور حکومت میں انہوں نے بلا کسی مزاحمت کے اس پر قبضہ کرلیا۔ اورنگ آباد کے گورنر نے اس جگہ کو اس قابل نہیں سمجھا کہ اس قبضہ پر کسی ردعمل کا اظہار کرتا۔ اس کے بعد پرعزم اور حوصلہ مند پرتگالیوں نے یہاں پر یہ پررعب قلعہ تعمیر کیا' اور یوں یہ ماہی گیروں کا گاؤں اہم بنتا چلا گیا۔ ملک کے حالات کی خرابی کی وجہ سے لوگ حفاظت کی غرض سے یہاں آکر آباد ہونے لگے کیونکہ اس شہر کے حاکم انصاف پسند تھے اور ظلم سے پرہیز کرتے تھے۔ اس کی وجہ سے یہاں کی آبادی بڑھتی گئی اور یہ ایک شہر میں تبدیل ہوگیا۔ اگرچہ اس شہر کی آب و ہوا بڑی خراب تھی اور جگہ جگہ گندے پانی کے تالاب تھے۔ بہرحال پرتگالیوں کا اس پر 1661ء تک قبضہ رہا اور بعد میں یہ چارلس دوم کو پرتگالی شہزادی کیتھرائن سے جہیز میں ملا۔ اس وقت تک یہ شہر اتنا غریب تھا کہ اس کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک سو روپیہ سالانہ کی لیز پر انگلستان کی حکومت سے لیا۔

یہاں پر جیسے ہی میں جہاز سے اترا' ایک قلی نے کہ جس سے میں قطعی واقف نہیں تھا میرا سامان میرے ہاتھ سے چھین لیا اور اسے سر پر اٹھا کر چلا۔ شاید اس غریب نے یہ اس

لئے کہا تھا کہ میں کوئی دوسرا قلی نہ کروں اور اس طرح اس کی مزدوری پکی ہو جائے۔ لیکن میں اس قسم کے لوگوں کو قطعی پسند نہیں کرتا۔ اس لئے میں نے اس کے رویہ کو اشتعال دلانے والا پایا اور اس کے پیچھے بھاگا تاکہ اپنا سامان واپس لے لوں۔ تیز تیز چلنے کے بعد میں اس قابل ہوا کہ پیچھے سے اس کی لنگوٹی پکڑ سکوں۔ یہ وہ واحد لباس تھا کہ جو اس کے جسم پر تھا۔ مگر ہوا یہ کہ لنگوٹی پرانی تھی اور پوری طرح سے بندھی ہوئی بھی نہ تھی۔ اس لئے جب میں نے اسے کھینچا تو وہ میرے ہاتھ میں آگئی۔ وہاں کھڑے ہوئے کسٹم افسر اور دوسرے لوگ اس صورتحال کو دیکھ کر زور زور سے ہنسنے لگے۔ مگر مجھے حیرانی اس وقت ہوئی کہ جب قلی نے ان باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی اور اطمینان سے اس نے دوبارہ سے اپنی لنگوٹی کو کسا اور مجھ سے مخاطب ہوکر کہنے لگا کہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ قصور لنگوٹی کا ہے کہ جو اتنی پرانی ہوگئی ہے۔ "میں نے اسے دو سال ہوئے خریدا ہے، مگر دیکھیں یہ بالکل پھٹ گئی ہے۔ جبکہ اس سے پہلے یہی کپڑا پانچ سال تک چلتا تھا۔"

کسٹم ہاؤس میرے سامان کی جانچ پڑتال کے بعد میں اپنے شریف قلی کے ساتھ شہر کی حدود میں داخل ہوا۔ جب میں نے رہائش کے بارے میں معلومات کیں، تو میرے قلی نے بتایا کہ شہر میں مسافروں کے رہنے کی کوئی سہولت نہیں ہے۔ اگر کوئی گھر کرائے پر لیا جائے تو مالک ایک مہینہ کا پیشگی کرایہ مانگتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ شرط پوری کرنا میرے لئے ممکن نہیں تھی۔ اس پر جب میں نے اپنے دوست قلی سے مشورہ مانگا تو اس نے کہا کہ میں مسجد حاجی ذکریا میں جاکر ٹھہر جاؤں۔ مسجد میں حاجی ذکریا کے ملازموں نے میرے ساتھ اچھا سلوک کیا اور بڑے ادب کے ساتھ پیش آئے۔ کچھ دن بعد جب میں نے اس کے ملازموں سے درخواست کی کہ میں مسجد کے بانی اور نیک دل حاجی سے ملنے کا خواہش مند ہوں کہ جس کے بارے میں، میں نے بمبئی میں رہتے ہوئے بہت کچھ سنا ہے، تو انہوں نے کہا کہ میں نے مسجد میں نماز کے بعد کئی مرتبہ اس سے بات چیت کی ہے اور اس کے ساتھ وقت گزارا ہے۔ اس پر مجھے یاد آیا کہ واقعی ایسا ہوتا رہا ہے، لیکن مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا کہ میں ایک عظیم آدمی سے باتیں کررہا ہوں۔ میں نے ہمیشہ اس کے خراب لباس اور مسخرے پن کی باتوں کی وجہ سے اس کو حقیر سمجھا اور کبھی اس کے ساتھ مہذبانہ طریقہ سے نہیں ملا۔ اس پر مجھے بہت افسوس ہوا کہ ایک شخص جو میرے ساتھ اس قدر مہمان نوازی کا سلوک کررہا ہے میں نے اس کے ساتھ اس قدر بدتمیزی کی۔ لیکن اس میں اس کا قصور بھی ہے کہ آخر وہ کیوں اس قدر میلے کچیلے لباس میں رہتا ہے اور کیوں ادب آداب کا

خیال نہیں رکھتا ہے۔ لیکن میں نے سوچا کہ یہ میرا فرض بنتا ہے کہ میں اس سے اپنے رویہ کی معافی مانگوں' لہٰذا میں اس کے دفتر گیا کہ جہاں وہ ایک پرانی گدی پر آلتی پالتی مارے بیٹھا گاؤ تکیہ کا سہارا لئے بیٹھا ہوا تھا۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ اس کے ملازم اور خادم انتہائی صاف ستھرا لباس پہنے ہوئے تھے اور اپنے مالک کے مقابلہ میں زیادہ اسمارٹ نظر آرہے تھے۔ یہاں پر کچھ انگریز بھی تھے۔ ایک کیپٹن اور اس کا اسسٹنٹ تھا جو شاید اس کے جہاز پر ملازم ہوں۔ یہ اپنے ہاتھوں میں ہیٹ لئے اس کے احکامات کے منتظر تھے۔ میں جیسے ہی داخل ہوا' اس نے بڑی خوش اخلاقی کے ساتھ میرا خیر مقدم کیا اور مجھے اپنے قریب بٹھایا۔ میں نے اپنے رویہ کی معافی مانگی کہ میں اس کے ساتھ اچھے طریقے سے پیش نہیں آیا' اور یہ محض اس لئے ہوا کہ میں اس کی اصلیت سے واقف نہیں تھا۔ اس نے صاف گوئی سے کہا کہ خاک سے بنے ہوئے انسان کو حقیر اور نیک ہونا چاہئے۔ اس پر میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ مجھے شناختی کاغذات دے کیونکہ ان کے بغیر کوئی بھی بمبئی سے باہر نہیں جا سکتا ہے۔ اس پر اس نے کہا کہ میں حلف لے کر یہ کہوں کہ اس سلسلہ میں میری کوئی بری نیت نہیں ہے' جب میں نے یہ عہد لے لیا تو اس نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ میرے شناختی کاغذات تیار کر کے مجھے دے دیں۔" یہ کاغذات فوراً ہی لکھے گئے' تیار ہو کر اس کے دستخط ہوئے اور مجھے دے دیئے گئے۔ اس پر میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور واپس مسجد میں آگیا۔

بمبئی میں چار دن گزار کر میں ایک کشتی میں پانویل کے لئے روانہ ہوا جو کہ یہاں سے بیس میل کا فاصلہ ہوگا۔ ہم شام کو پانچ بجے روانہ ہوئے اور دوسرے دن صبح کے چھ بجے یہاں پہنچ گئے۔ یہ سفر نا تجربہ کار لوگوں کے لئے شاید معمولی سا ہو' لیکن خدا گواہ ہے کہ یہ سفر میرے لئے انتہائی اذیت ناک رہا۔ میں اپنے قارئین کو تنبیہہ کرتا ہوں کہ کبھی کسی مقامی کشتی پر یہ سفر نہیں کریں۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو انہیں بھی اس تجربہ سے گزرنا ہوگا کہ جس سے میں گزرا ہوں۔ یہ پوری کشتی عورتوں' مردوں اور بچوں سے بری طرح سے بھری ہوئی تھی۔ اس کے نچلے حصہ میں جہاز میں توازن قائم کرنے کے لئے شاید انہوں نے مٹی اور سڑی ہوئی مچھلیاں بھر دی تھیں جس سے اس قدر سخت بدبو اٹھ رہی تھی کہ دماغ اڑا جا رہا تھا۔ وہ رات بھی خاص طور پر حبس والی تھی' اگرچہ مارچ کا مہینہ تھا' مگر جہاز کے تمام ملازمین اس قدر پسینہ میں تر تھے کہ اس کی بو بھی ناقابل برداشت تھی۔ اس گرمی کی شدت میں جب پیاس لگی اور پانی پینے کا ارادہ کیا تو وہ اول تو گرم تھا اور پھر اس میں بھی

جہاز کی بدبو بس گئی تھی۔ اس پر ستم یہ کہ مکھیاں اور کھٹمل ہمارے لباس میں گھسے جارہے تھے اور بڑی بے دردی سے ہمارا خون چوسنے اور جسم کاٹنے میں مصروف تھے۔ ان کی تعداد اس قدر تھی کہ اگر ایک کو مارا جاتا تو فوراً اس کی جگہ ایک درجن اور آجاتے تھے۔ جس کا جو حصہ کھلا ہوا تھا وہ مچھروں اور جھینگروں کی زد میں تھا۔ مچھر سر پر بھنبھناتے ہوئے جب موقع ملتا تو ڈنک مارتے تھے' جبکہ جھینگر ادھر سے ادھر جاتے ہوئے منہ اور گردن پر حملہ آور ہوتے تھے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ کشتی والے کرایہ کے علاوہ یہ توقع کررہے تھے یا ان کا مطالبہ تھا کہ انہیں کچھ تحفے تحائف بھی دیئے جائیں۔ ان میں سے ایک خالی پیالہ ہاتھ میں لیا ہوا ہر مسافر کے سامنے سے گزرنے لگا تاکہ اس میں کچھ رقم ڈالی جائے۔ جبکہ ایک دوسرا ایک ڈرم پر کھڑے ہوکر یہ تبلیغ کرنے لگا : "میرے دوستو! سخی بنو' تاکہ تم حفاظت کے ساتھ ساحل پر پہنچو۔" تمہیں معلوم ہے کہ تم ایک خطرے میں ہو' تمہارے اور موت کے درمیان صرف ایک تختہ درمیان میں ہے۔ ہوا کا ایک تھپیڑا ہم سب کو ایک لحہ میں تباہ و برباد کرسکتا ہے۔ ہم کوشش کرکے تمہاری اور تمہارے سامان کی حفاظت کررہے ہیں اس لئے اگر معمولی سے عطیہ کا سوال کیا جائے تو اس کے دینے میں ہچکچاہٹ سے کام نہ لینا۔ نیک و سخی بنو تاکہ خدا تمہیں اس مشکل سے جلد نجات دلائے۔"

غریب اور ضعیف الاعتقاد مسافروں نے اس تنبیہہ کے زیراثر دوسری مرتبہ ان بدمعاشوں کو کچھ نہ کچھ دیا' ان میں ایک جب اپنی ٹوپی میں پیسے جمع کرتا ہوا میرے پاس آیا تو میں نے اس سے درشتگی کے ساتھ کہا : "میں نے اپنا کرایہ ادا کردیا ہے' اور میں ان لوگوں کو کوئی عطیہ نہیں دوں گا کہ جو اپنی کشتی کو کبھی نہیں دھوتے ہیں اور نہ ہی دوسرے لوگوں کے آرام کا خیال رکھتے ہیں۔" اس غیرمتوقع جواب کو سن کر اس نے ڈرم پر کھڑے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا کہ : "اس نوجوان کی بے وقوفی ملاحظہ کی' یہ شکایت کررہا ہے کہ کشتی کو دھویا نہیں گیا ہے اور یہ کہ یہاں پر آرام سے نہیں ہے۔ اس کو پتہ نہیں کہ کشتی جب پانی کی سطح پر ہوتی ہے تو وہ مسلسل دھلتی رہتی ہے اور یہ اس لئے تکلیف میں ہے کہ یہ سمندر میں ڈوبا نہیں ہے۔" اس کی اس بدتمیزی کی باتیں سن کر میں غصہ میں آگ بگولا ہوگیا اور اس سے کہا کہ یا تو وہ اپنی زبان پر قابو رکھے ورنہ نتائج کو بھگتنے کے لئے تیار ہو جائے۔ میرے اس طرح بولنے سے وہ دونوں فقیر اچانک نرم پڑ گئے' اور ڈرم پر کھڑے شخص نے اس سے مخاطب ہوکر کہا کہ : "اس شخص کو چھوڑو' یہاں اور سخی و فیاض اور نیک لوگ ہیں' جوکہ عطیات دینے کے لئے تیار ہیں۔" لیکن ہوا یہ کہ میرے الفاظ نے

لوگوں پر اثر کیا' میری تقریر کے بعد کسی نے ان بدمعاشوں کو کچھ نہیں دیا' بلکہ ان سب نے ان دونوں کو برا بھلا کہا اور یوں ان کی دھوکہ بازی کا خاتمہ ہوا۔

ہم جیسے ہی پانویل پر پہنچے جوکہ ڈسٹرکٹ کونکن میں واقع ہے' تو میں وہاں سے اس طرح بھاگا کہ جیسے کوئی قیدی پرندہ پنجرے سے چھوٹا ہو۔ یہاں میں نے پورا ایک دن نیم کے ایک سایہ دار درخت کے نیچے کونکن کی تازہ ہوا میں گزارا۔ اس کے بعد میں نے اپنے سارے کپڑوں کو خوب دھلوایا اور خود بھی نہایا دھویا تاکہ وہ چار دن جو بمبئی کی گندگی میں گزارے اور ایک رات جو کشتی کی غلاظت میں بسر کی' اس کی بدبو دور ہو۔ دوسرے دن میں پونا کے لئے روانہ ہوگیا جو یہاں سے اکہتر میل کے فاصلہ پر تھا۔ سڑک انتہائی اچھی تھی' اس کے دونوں طرف درختوں کی وجہ سے سایہ دار تھی۔ اسے پہاڑوں کے درمیان سے انگریزی حکومت نے کاٹ کر بنایا تھا۔ سوائے خاندالا گھاٹ کے کہ جو پانویل سے تیس میل کے فاصلہ پر تھا۔ یہ گھاٹ کچھ زیادہ اونچا نہیں ہے۔ سطح سمندر سے اس کی بلندی دو ہزار فٹ ہوگی۔ چونکہ فطرت کی پیدا کردہ چڑھائیاں ہموار نہیں ہیں' اس لئے یہاں سے گاڑیوں کا گزرنا مشکل ہوتا ہے اور چار پایو کے لئے مشکل ہے کہ وہ بوجھ کو اٹھائے یہاں سے گزر سکیں۔ پانویل سے تین دن کے سفر کے بعد' میں مرہٹوں کے سابق دارالحکومت پونا پہنچا' یہ ماضی میں اورنگ آباد کے صوبہ میں تھا' لیکن بعد میں مرہٹوں کے قبضہ میں آگیا۔ جب 1818ء میں انگریزوں نے مرہٹوں کے علاقوں پر قبضہ کیا تو یہ برطانوی حکومت کے ماتحت ہوگیا۔

یہ شہر اجین سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ پونا پہاڑوں کے درمیان گھرا ہوا ہے۔ ان شہر کا قلعہ کہ جسے محل کہا جاتا ہے' اس قابل نہیں کہ اس کا ذکر کیا جائے۔ یہ جیل کی مانند ہے کہ جس میں جانے کا ایک ہی دروازہ ہے۔ اس کی دیواریں موٹی اور اونچی ہیں جوکہ چار برجوں کو گھیرے میں لئے ہوئے ہیں۔ جب ہم شہر کی شمالی سمت سے داخل ہوئے تو پہلے دریائے موتا کو عبور کیا جوکہ تھوڑے فاصلہ پر مولا دریا سے جاکر ملتا ہے۔ یہ جگہ کہ جہاں دونوں دریا ملتے ہیں سنگم کہلاتی ہے اور یہیں پر پیشوا کے زمانے میں برطانوی ریذیڈنٹ کا گھر ہوا کرتا تھا۔ میں یہاں دو دن رکا تاکہ شہر کو دیکھ سکوں کیونکہ اس شہر کی دولت اور شان و شوکت کے بارے میں' میں پہلے سے بہت کچھ سن چکا تھا۔ لیکن جب میں نے ذاتی طور پر شہر کو دیکھا تو میں انتہائی مایوس ہوا۔ یہاں کے لوگوں نے بتایا کہ اس کی ساری شان' اس کے قدیم حکمرانوں کے ساتھ چلی گئی۔

انھوں نے بتایا کہ : "وہ بازار کے جہاں اشرفیوں کے ڈھیر ہوتے تھے' موتیوں کے ہار ہوتے تھے' اور قیمتی زیورات کے صندوقچے ہوتے تھے' اب یہ سارا سازوسامان اور مال ان بازاروں میں مفقود ہے۔" اس شہر کی آبادی بھی پہلے کے مقابلہ میں گھٹ گئی ہے۔ آبادی کی کمی پیشوا کی جلاوطنی' اس کی فوج کی برطرفی اور بیروزگاری کی وجہ لوگوں کا شہر چھوڑنا ہے۔

شہر میں ہوتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ شہر کا منظر دیکھنے کے لئے کیوں نہ میں پاربتی پہاڑی پر جاؤں اور وہاں بلندی سے اس کا جائزہ لوں۔ اس مقصد کے لئے میں نے ایک گارڈ کا انتظام کیا اور اس کے ہمراہ پہاڑی کی چوٹی پر چڑھ گیا۔ یہاں سے پورے شہر کو دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں سے میں نے شہر کے گردوپیش کا علاقہ' انگریزی کیمپ' اور شہر سے باہر کا علاقہ کہ جہاں پیشوا نے نو لاکھ آموں کے درخت لگائے تھے اور جو اب "نو لکھا باغ" کہلاتا ہے وہ سب دیکھا۔

دوسرے دن میں پونا سے ستارا کے لئے روانہ ہوگیا جوکہ میری منزل مقصود تھی اور جس کا یہاں سے 56 میل فاصلہ ہے۔ میں آرام سے سفر کرتا ہوا یہاں تین دن کے اندر اندر پہنچ گیا۔ میری آمد کی تاریخ 30 مارچ 1823ء تھی۔ ستارا کا شہر ابتداء میں بیجاپور کے صوبہ میں تھا۔ یہ پہاڑی علاقہ میں آباد ہے اور تین اطراف سے پہاڑیوں میں گھرا ہوا ہے۔

جب میں نے اس کا قلعہ دیکھا تو مجھے نعمت اللہ کا واقعہ یاد آگیا جو اورنگ زیب کے دربار کا ایک اہم امیر تھا۔ یہ وہ پہلا شخص تھا کہ جو قلعہ پر مغلوں کے قبضہ کی خبر لے کر بادشاہ کے پاس گیا تھا۔ جب وہ بادشاہ کے خیمہ کے قریب پہنچا تو اس نے دیکھا کہ بادشاہ خیمہ کے سامنے بیٹھا ہوا دور سے قلعہ کو دیکھ رہا ہے اور ساتھ ساتھ تسبیح پڑھنے میں مصروف ہے۔ جب نعمت خان آداب بجا لایا تو بادشاہ نے اس سے پوچھا "کیا خبر ہے؟"

"میرے سرکار! میں اچھی خبر لایا ہوں" نعمت خان نے کہا "آپ کی دعاؤں کے اثر سے قلعہ پر قبضہ ہوگیا ہے۔ اس قبضہ کی تاریخ اعلیٰ حضرت کے ہاتھ سے ظاہر ہے۔" اس کا مطلب تھا کہ اس کے ہاتھ کی انگلیاں اور اس کا انگوٹھا جو چھنگلیا کے اوپر تھا' یہ چار کے ہندسے کو چار مرتبہ دھراتی تھی' اس سے ہجری سال 1111ھ نکلتا تھا۔

برطانوی کنٹونمنٹ اور ریذیڈنسی شہر کے مشرق میں دو میل کے فاصلہ پر تھی' لہٰذا میں وہاں چلا گیا' یہاں میری ملاقات میرے پرانے دوست تلسی شام' سکندر خاں جو اب حوالدار میجر ہے' ان سے ہوئی۔ میں انہیں کے ساتھ ٹھہرا اور ان کی مہمان نوازی کا احسان مند

ہوا۔

میرے پہنچنے کی خبر فوراً پورے کیمپ میں پھیل گئی۔ اتفاق سے اس وقت وہاں کوئی قابل استاد موجود نہیں تھا' اس لئے مجھے فوراً ہی چھ شاگرد مل گئے۔ اگرچہ یہ کام مالی لحاظ سے تو نفع بخش تھا مگر اس میں محنت بہت تھی اور میرا پورا دن پڑھانے میں صرف ہو جاتا تھا۔ رات کو جب تک میں جاگ سکتا ڈاکٹر جے بی گلکرائسٹ کی کتاب سے انگریزی سیکھا کرتا تھا۔ اس طرح سے میں نے اس جگہ پر چھ سال گزار دیئے۔ اس عرصہ میں کئی نوجوان افسران نے مجھ سے پڑھ کر امتحانات پاس کئے۔ اس وجہ سے میری شہرت بھی ہوئی' اور میں نے اس پیشہ میں کچھ پیسے بھی جمع کر لئے۔

میں کچھ عرصہ تو دوست کے پاس مہمان رہا' مگر اس کے اخراجات کو دیکھتے ہوئے جو اس کے خاندان کے لئے مشکل سے پورے ہوتے تھے' میں نے علیحدہ سے شہر میں مکان لے لیا۔ جہاں رات کا ایک حصہ مطالعہ میں اور دوسرا آرام میں گزارا کرتا تھا۔ اس آرام کے مزہ کو وہی لوگ جان سکتے ہیں کہ جو دن بھر سخت محنت کرتے ہیں۔

اس طرح میرا وقت خاموشی سے گزرتا رہا اور اس دوران سوائے گھریلو معاملات کے اور کوئی مسئلہ میرے لئے پریشانی کا باعث نہیں بنا۔ میرے ملازمین اکثر اپنے معمولات پورے کرنے میں سستی کرتے تھے۔ چھوٹی موٹی چوریاں کرلیا کرتے تھے' کیونکہ دن میں' میری غیرموجودگی میں' انہی کی حکومت ہوا کرتی تھی۔ یہ گھریلو معاملات اکثر میرے لئے پریشانی کا موجب ہوا کرتے تھے اور میری پرامن و خاموش زندگی کو ڈسٹرب کردیتے تھے۔ اس لئے اس کا حل میرے لئے یہ تھا کہ میرے پاس کوئی ایسا رفیق زندگی ہو جو میرے گھر کی دیکھ بھال کر سکے اور میری تنہائی میں میرا ساتھی بن سکے۔

چنانچہ ان حالات کے دباؤ میں' میں نے 23 ستمبر 1824ء کو ایک نوجوان عورت سے شادی کرلی کہ جسے میں اس وقت سے جانتا تھا جب میں کچھ میں تھا اور جو میرے آنے سے پہلے اس شہر میں آگئی تھی۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ طمع میں آکر دھوکہ کھا جاتا ہے' اس کو اس وقت تک فریب اور دھوکہ کا پتہ نہیں چلتا ہے جب تک کہ وہ اس تجربہ سے نہ گزرے۔ کبھی کبھی انسان چھوٹی چھوٹی مشکلات سے چھٹکارا پانے کی خواہش میں' بڑی مصیبتوں میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ لہٰذا میرا یہ خواب کہ شادی کے بعد میری زندگی مسرت و خوشی سے بھرپور ہو جائے گی' یہ تھوڑے دن ہی رہا۔ میں جلد ہی گھریلو معاملات میں پہلے سے زیادہ الجھ گیا۔ جب تک میں کنوارا تھا' میں صرف اپنے بارے میں سوچا کرتا تھا' اب

مجھے ایک دوسرے شخص کے بارے میں بھی سوچنا پڑ گیا کہ جس کی قسمت میرے ساتھ مل گئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرا پرس جو اب تک بھرا ہوا تھا' اب آہستہ آہستہ خالی ہونے لگا۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوا کہ اور جس نے میری مشکلات میں بے انتہا اضافہ کردیا' وہ میری یہ دریافت تھی کہ میری رفیق زندگی طبیعت کے لحاظ سے انتہائی چچھوری اور مراقی ثابت ہوئی۔

اگر کسی کی شادی شدہ زندگی میں یہ مسائل ہوں تو ہماری شریعت میں اس کا حل یہ ہے کہ طلاق کے ذریعہ علیحدگی اختیار کرلی جائے' کیونکہ علیحدگی کا سبب بیوی کا کوئی جرم کرنا ہی ضروری نہیں ہے بلکہ اگر اس سے نااتفاقی ہو تو یہ سبب ہی طلاق کے لئے کافی ہے۔ لیکن کون ہے کہ جو بغیر کسی وجہ کے اپنے وفادار ساتھی سے جدا ہونا پسند کرے گا؟ یہ خراب رسم صرف معاشرے کے نچلے طبقوں میں ہے' ایک شریف اور اعلیٰ گھرانہ کا شخص بیک وقت چار شادیاں کرسکتا ہے اور اگر اس کی مالی حالت اجازت دے تو جس قدر چاہے کنیزیں رکھ سکتا ہے۔ اتنی عورتوں میں سے اسے کوئی ایک ایسی ضرور مل جاتی ہے کہ جو اس کو خوش و مسرور رکھ سکے لہٰذا دوسری عورتیں بغیر کسی توجہ کے گھر میں رہ سکتی ہیں۔ یا ہر عورت یہ کوشش کرتی ہے کہ وہ اپنے آقا کو خوش رکھے تاکہ اس کی توجہ دوسری عورتوں کی طرف نہ ہو۔ بہرحال یہاں میں اس پر زیادہ بحث نہیں کروں گا' کہ ایک عورت سے شادی کرنا بہتر ہے یا کئی عورتوں کو رکھنا اچھا ہے یہ مسئلہ مسلمان اور عیسائی علماء کے درمیان زیر بحث رہا ہے۔ اس کے حق و مخالفت میں کئی دلیلیں دی جا سکتی ہیں۔ اس لئے میں اس بحث کو اور زیادہ طول دینا نہیں چاہتا ہوں۔ اگرچہ میں زندگی بھر ایک ہی عورت سے شادی کا قائل رہا ہوں' مگر پھر بھی شریعت کے اس اصول کو مانتا ہوں کہ کئی شادیاں مرد کے لئے ضروری ہیں۔

ایک دن میں 24 رجمنٹ کے ای۔ ایم۔ ارل کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ جو مجھ سے فارسی پڑھتا تھا (اس نے ہندوستانی اور مراٹھی زبانوں کے امتحانات پاس کرلئے تھے) کسی نے آکر ہمیں بتایا کہ دوپہر کو قریبی گاؤں مھولی میں کہ جو دریا کے کنارے واقع ہے' ایک عورت ستی ہونے جارہی ہے۔ اس خبر سے میرا شاگرد اور میں دونوں ہی حیران ہو کر رہ گئے۔ ہمیں اس پر یقین نہیں آیا کہ ایسا جرم اس علاقہ میں کیسے ہو سکتا ہے کہ جب کہ برٹش ریذیڈنٹ قریبی مرکزی شہر میں موجود ہو۔ ابھی ہم نے مشکل سے اس موضوع پر اپنی گفتگو ختم کی تھی کہ ہم نے جلوس کی آواز سنی کہ جو باجے بجاتے اور گاتے ہوئے شہر سے گزر

رہے تھے۔ اس کو سن کر ہم فوراً گھوڑوں پر سوار ہوئے اور اس طرف روانہ ہوئے کہ جہاں یہ رسم ادا کی جانی تھی۔ یہاں ہم آدھے گھنٹے کے اندر اندر پہنچ گئے۔ میرا ایک دوسرا شاگرد ڈاکٹر ایم ایف کے نے جب یہ افسوسناک خبر سنی تو وہ بھی ہمارے بعد فوراً اس جگہ پہنچ گیا۔

ہم نے کوئی پون گھنٹہ ایک سایہ دار پیپل کے درخت کے نیچے انتظار کیا جوکہ دریا کے کنارے پر تھا' یہاں تک کہ ماتمی جلوس معہ برہمنوں کے جو جنازہ اٹھائے ہوئے تھے آیا اور جنازہ کو دریا کے کنارے رکھ دیا۔ اس طرح سے کہ لاش کے پیر دریا کے پانی سے دھل جائیں۔ مردہ شخص کا چہرہ اور ہاتھ کھلے ہوئے تھے' جن کو دیکھ کر ہم نے اندازہ لگایا کہ یہ چالیس سالہ صحت مند شخص کا تھا کہ جس کا تعلق برہمن ذات سے تھا۔

مردہ شخص کو دیکھنے کے بعد اس نوجوان عورت کی طرف گئے جو ایک دوسرے پیپل کے درخت سایہ میں بیٹھی تھی کہ جہاں سے وہ جنازہ کو دیکھ سکتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ جلنے پر تیار تھی۔ اس کو جلانے کی تیاری ہورہی تھی اور لکڑیوں کا ڈھیر اکٹھا کیا جارہا تھا۔ وہ اپنے رشتہ داروں اور دوسرے لوگوں کے درمیان گھری ہوئی تھی۔ جن کی تعداد تقریباً بیس کے قریب ہوگی۔ وہ ان لوگوں سے مسلسل گفتگو میں مصروف تھی اور جو وہ پوچھ رہے تھے ان کے سوالوں کا جواب دے رہی تھی۔ اس کی عمر پندرہ سال کی ہوگی۔ شکل و صورت کی اچھی تھی۔ اس کے حسین چہرے پر کسی قسم کی پریشانی یا گھبراہٹ نہیں تھی۔ لیفٹیننٹ ارل جوکہ اچھی مراہٹی زبان جانتا تھا اسے یہ موقع مل گیا کہ اس سے گفتگو کرسکے۔ اس نے ایک لمبی تقریر کرکے اسے قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ اس ظالمانہ خودکشی کا ارادہ ترک کردے۔ کیونکہ اس کے نزدیک ستی ایک قسم کا قتل ہے کہ جو برہمنوں کے ہاتھوں ہوتا ہے۔ جن کی شیطانی تعلیم ہندو مذہب کے خلاف ہے۔ وہ اپنی پیدا کردہ رسومات کے تحت اس کو مرنے پر مجبور کررہے ہیں اور اس طرح اس کی دنیا اور آخرت دونوں کو تباہ کررہے ہیں۔ اس کے جواب میں اس نے مختصراً طور پر صرف یہ کہا: "تمہاری جو مرضی ہو وہ کہو' مگر میں تو اپنے آقا کے ساتھ جاؤں گی۔ میری قسمت میں اس کی بیوی بننا لکھا تھا' لہٰذا میں صرف اس کی بیوی رہوں گی' اور کسی بھی صورت میں اپنی زندگی میں دوسرے کو شریک نہیں کروں گی۔ میں نے اس سے محبت کی تھی' اب اس کے علاوہ اس خلوص کے ساتھ میں کسی اور سے محبت نہیں کرسکوں گی۔ لہٰذا میں اس کی ساتھی رہنا چاہتی ہوں چاہے وہ جہاں بھی جائے۔ برائے مہربانی آپ اس سلسلہ میں فکرمند نہ ہوں۔ خدا آپ کو امن و

امان میں رکھے۔"

لیفٹیننٹ ارل نے میرے اور ڈاکٹر کے' کے اصرار پر ایک بار اس سے اور درخواست کی کہ وہ اپنے فیصلہ پر نظرثانی کرے۔ لہٰذا اس نے پھر اس عورت کو سمجھایا کہ: "محترم خاتون' میں تم سے درخواست کرتا ہوں ستی پر عمل کرنے سے پہلے ایک بار اور اس پر غور کرلیں۔ ٹھیک ہے' تم جو صحیح سمجھتی ہو' اسی پر عمل کرو' لیکن یہ سوچہ کہ ہم تمہارے دوست ہیں' دشمن نہیں۔ اگر تم نے ذرا بھی اشارہ کیا تو ہم تمہیں اس ہولناک موت سے بچالیں گے' اور تمہاری بقایا زندگی گزارنے کی بھی ذمہ داری لے لیں گے۔" اس کے بعد اس نے مزید زور دیتے ہوئے اس سے کہا: "اس سے پہلے کہ تم اپنے پورے جسم کو جلاؤ' تم اپنی انگلی جلاکر ذرا تجربہ کرو کہ یہ کس قدر تکلیف دہ چیز ہے۔"

افسوس کہ وہ اپنے عقیدے کی سختی میں جس انتہا پسندی کو پہنچی ہوئی تھی وہاں پر نصیحتیں کارگر ثابت نہیں ہوئیں۔ اس نے بڑی حقارت سے مسکراتے ہوئے مسٹر ارل سے کہا کہ وہ اس کی مہربانی کی وجہ سے اس کی احسان مند ہے لیکن اس وقت اسے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے جو فیصلہ کرلیا ہے اب وہ تبدیل نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد وہ مڑی اور اپنی چادر سے ایک ٹکڑا پھاڑا اور اس کے قریب جو لیمپ جل رہا تھا اس کے تیل میں اسے ڈبویا اور اپنی انگلی سے لپیٹ کر اس کو بڑے جوش کے ساتھ آگ لگا دی' وہ تھوڑی دیر تک موم بتی کی طرح جلتا رہا' اس کے بعد اس میں سے گوشت کے جلنے کی بو آنے لگی۔ اس دوران میں وہ حسین لڑکی مسلسل باتیں کرتی رہی اور اس نے انگلی کے جلنے پر کسی قسم کی تکلیف کا مظاہرہ کیا اور نہ اس کی جلن کو محسوس کیا لیکن اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ جس کی وجہ سے ہمیں اندازہ ہوگیا کہ وہ اس اذیت کو کس جرات کے ساتھ برداشت کررہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کا یہ جذبہ' جوش اور انتہا پسندی اس وجہ سے بھی تھا کہ اسے نشہ آور اشیاء کھلا دی گئیں تھیں۔ خاص طور سے کافور کی ایک بڑی مقدار ظالم برہمنوں نے اس کو کھلائی تھی یہ عمومی طور پر اس وقت دے دی جاتی تھی کہ جب بیوہ عورت غم کی حالت میں فوری طور پر اپنے جلنے کا اعلان کردیتی تھی۔ اس کے اثرات سے فوری طور پر اعصاب مفلوج ہو جاتے تھے اور اس کا جسم جلنے سے پہلے سن ہو جاتا تھا۔

مردہ کو غسل دینے کے بعد' اسے جلانے کے لئے تیار کردیا گیا۔ اس عورت کی گردن میں آدھا پاؤنڈ کافور باندھ دیا گیا۔ وہ مستعدی کے ساتھ اٹھی' اپنے دیوتاؤں سے دعا کی اور

لکڑیوں کے ڈھیر کی طرف اس کشش کے ساتھ چلی جیسے کہ پروانہ شمع کے سامنے جاتا ہے۔ اس کے بعد اس نے ڈھیر کے سامنے سات چکر لگائے۔ اس کے بعد ڈھیر پر بیٹھ کر اپنے مردہ شوہر کا سر اپنی گود میں رکھا۔ اس کے بعد اس نے خود ہی لکڑیوں کے ڈھیر کو آگ لگائی۔ اس وقت اس کے آگے برہمن ڈنڈے لے کر کھڑے ہوگئے تاکہ کوئی اس کے قریب نہ جاسکے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر ڈاکٹر کے' کو اس قدر غصہ آیا کہ وہ اپنے پر قابو نہیں پاسکا۔ اگرچہ اس کو ان کی زبان نہیں آتی تھی' لیکن اس کے باوجود اس نے اس قدر زور سے کہ جس قدر وہ بول سکتا تھا برہمنوں سے مخاطب ہو کر کہا "تم بدمعاش لوگ۔ یہ ٹھیک نہیں ہے' دروازہ مت کھولو۔" اگرچہ وہ اس سے الٹ کہنا چاہتا تھا کہ دروازہ کھولو۔ زبان کی اس غلطی نے اس موقع پر بھی کہ جو انتہائی افسوسناک تھا' لوگوں کو مسکرانے پر مجبور کردیا۔ جب عورت نے آگ لگائی' تو اسی وقت برہمنوں نے رام' رام کا شور مچانا شروع کردیا اور ساتھ میں ڈھول' تاشے بجانا شروع کردیئے۔ یہ سب شور اور باجا اس لئے تھا تاکہ اس ہنگامہ میں اس عورت کی چیخ و پکار سنائی نہ دے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اوپر سے لکڑیاں پھینکنی شروع کردیں تاکہ وہ لڑکی اس کے بوجھ تلے دب جائے۔ چنانچہ پندرہ منٹ کے اندر اندر وہاں سوائے راکھ کے اور کچھ نہیں رہا۔ اس کے بعد شور و غل بھی ختم ہوگیا اور موسیقی بھی روک دی گئی۔ اور یہ قاتل' جو اب تک تھک چکے تھے خاموشی سے درخت کے نیچے بیٹھ گئے تاکہ آگ ٹھنڈی ہو تو اس کی راکھ کو وہ دریا میں بہا سکیں۔ ہم بھی اس کے بعد انتہائی افسردگی کی حالت میں اپنے گھر واپس ہو لئے۔

مذہب اپنے ابتدائی دور میں خالص اور پاک و صاف تھے' مگر وقت کے ساتھ ساتھ ان میں توہمات آتے چلے گئے جس کے نتیجہ میں یہ سب کچھ پیدا ہوا کہ جو ہم دیکھ کر آئے تھے۔ ہندومت کی ابتدا بھی پاک اور روحانیت سے بھرپور تھی۔ اس کا ثبوت ابتدائی وید اور ان کی دوسری مذہبی کتابیں ہیں۔ جو کہ ہمارے ہجری سن سے 1800 سال پہلے سے موجود تھیں۔ ان میں خالق کائنات برہما کہلاتا ہے۔ اس کی تین صفات یہ ہیں: برہما' خالق' وشنو' محافظ اور شیوا' تباہ کرنے والا۔ ان میں سے ہر صفت کا ایک خاص امیج ہے تاکہ مادی نظر والے اس غیرمادی شے کو دیکھ سکیں جو کہ نظر آنے والی اور نہ نظر آنے والی دنیا کا خالق ہے۔ یہ قادر مطلق ہے جو کہ اپنی تمام مخلوق پر پہلے سے متعین اور قائم شدہ اصولوں کے تحت حکومت کرتا ہے۔

ان کے ان اعلیٰ اور حقیقی اصولوں سے ان کے پاکیزہ قوانین کی تشکیل ہوتی ہے۔ وہ

ان تمام جرائم کی سختی سے منع کرتے ہیں کہ جو آج کی مہذب دنیا میں بھی قابل سزا ہیں۔ اس لئے اس میں خودکشی، بچوں کو مار ڈالنا اور صرف انسانوں ہی کی نہیں بلکہ ہر قسم کی قربانی، چاہے وہ جانوروں کی ہو، سخت منع ہے۔ لیکن توہمات، قصوں و کہانیوں، اور خودغرض پجاریوں نے وقت کے ساتھ ساتھ بدعنوانی، کرپشن اور غیراخلاقی رسومات اس حد تک پیدا کر دی ہیں کہ اس وقت کے ہندو خود ان کے مذہب کے اعتبار سے کافروں میں شمار ہوتے ہیں۔

ستارا میں قیام کے دوران مجھے انگریزوں کے ایک عظیم شخص سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ اس کی شہرت میں نے صرف انگریزوں سے ہی نہیں بلکہ ہندوستانیوں سے بھی سنی تھی۔ یہ آنریبل ماؤنٹ اسٹوراٹ الفنسٹن، بمبئی کے گورنر تھے۔ وہ ریاست میں سیاسی معاملات کے سلسلہ میں اس وقت تشریف لائے تھے کہ جب راجہ کی لڑکی کی شادی پونا کے گھور پورا کے ایک لڑکے سے ہو رہی تھی۔ اس موقع پر شہر کے معززین کی پندرہ دن سے شاہی محل میں دعوتیں ہو رہی تھیں۔ میں بھی ان میں سے ایک تھا۔ میں اس وقت وہاں موجود تھا جب گورنر صاحب نے راجہ سے بڑی ہی پر مغز اور سلجھی ہوئی گفتگو کی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے یہ عظیم آدمی کسی بچے سے باتیں کر رہا ہو۔ کبھی وہ اس کی باتوں کی تصحیح کرتا تھا اور کبھی اس کے خیالات کو ادھر ادھر کر دیتا تھا، یہ دیکھنے کے لئے کہ کیا راجہ میں اتنی لیاقت ہے کہ وہ اپنے مفہوم کو صاف اور واضح طور پر بیان کرسکے۔ لیکن مجھے یہ کہنا پڑے گا کہ راجہ نے ہمیں سب کو سخت مایوس کیا۔ مجھے گورنر بہادر کا ایک ریمارک اب تک یاد ہے جو انہوں نے اس ملاقات کے موقع پر دیا تھا۔ راجہ نے اس سے پوچھا تھا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ اس سے ہندوستانی میں بات چیت کر رہا ہے اور مراہٹی نہیں بول رہا ہے جبکہ وہ اس زبان سے بھی بخوبی واقف ہے۔ اس پر اس نے کہا کہ: "میں جناب عالی سے بہتر ہندوستانی بول سکتا ہوں، جبکہ آپ مراہٹی زبان مجھ سے اچھی جانتے ہیں۔"

میں نے چھ سال ستارا میں گزار دیئے۔ اس دوران میں، میں نے اپنی محنت سے اس قدر پیسے کما لئے کہ میں چھ ہفتے بغیر کسی ملازمت کے رہ سکتا تھا۔ لیکن میں نے اس وقت اپنے بہت سے انگریز اور ہندوستانی دوستوں کو کھو دیا کہ جب چھٹی رجمنٹ کا وہاں سے تبادلہ ہوگیا۔ اس کے بعد سے میں نے خود کو تنہا اور بیکار پایا۔ دکن کی آب و ہوا، اور مراہٹوں کی ناپسندیدہ صحبت نے مجھے بے انتہا بور کر دیا اور میں اس موقع کی تلاش میں رہا کہ مہذب جگہ پر جاؤں۔ میں انہی تفکرات میں تھا کہ مجھے لیفٹیننٹ ویب کی جانب سے جو کہ

ایک شریف شخص اور پکا عیسائی تھا' اور جو مجھ سے کچھ عرصہ پڑھا بھی تھا' پیشکش وصول ہوئی' اس کا تبادلہ سورت کردیا گیا تھا۔ میں نے فوراً اس کی پیشکش قبول کی اور سورت کے لئے روانہ ہوگیا۔ جہاں میں اپنے خاندان کے ساتھ اپریل 1828ء میں پہنچ گیا۔ میرا بمبئی سے سورت تک کا یہ سفر بڑا خطرناک' مشکل' مگر جلدی طے ہوگیا۔ ایک دوسرا جہاز کہ جس کا مالک بھی ہمارے جہاز والا تھا اس میں تقریباً ایک سو چالیس بوہری تھے۔ جنہیں ان کے روحانی سربراہ نے اپنے بیٹوں کی شادی میں بلایا تھا۔ وہ ہم سے تھوڑی دور کے فاصلہ پر تھا۔ لیکن اچانک سمندر میں طغیانی آئی کہ جس میں وہ ہچکولے کھانے لگا' اور وہ تمام بدقسمت مسافر' شادی کی رسومات سے لطف اٹھانے کے خیال کے بجائے' سمندر میں اپنی قبریں دیکھنے لگے۔ مجھے خیال آیا کہ ان کے روحانی پیشوا کے پاس اب اپنے مردہ مریدوں کی ایک لمبی فہرست ہوگی کہ جو انہوں نے جبریل کو بھیج دی ہوگی تاکہ وہ انہیں جنت میں بسا سکیں۔ اس فرقہ میں یہ رواج ہے کہ وہ اپنے پیشوا سے ہر مرنے والے کے لئے ایک سرٹیفکیٹ لیتے ہیں۔ جو فرشتوں کو مخاطب کرکے لکھا جاتا ہے جبکہ وہ اسے جنت میں بہترین جگہ آباد کریں۔ اس سرٹیفکیٹ کے بدلہ میں پیشوا کو مناسب رقم دی جاتی ہے۔ یہ پرچہ مرنے والے کے کفن پر احتیاط سے رکھ دیا جاتا ہے۔

یہاں مجھے اپنے دوست ڈاکٹر سی ڈی اسٹریکر کا ایک واقعہ یاد آتا ہے جوکہ سول سرجن تھا' اور اس جگہ کئی سال خدمات انجام دیتا رہا تھا۔ اس ڈاکٹر نے روحانی پیشوا کا ایک سخت بیماری کے زمانہ میں علاج کیا تھا۔ جب رمضان کا مہینہ آیا تو ڈاکٹر نے اپنے روحانی مریض کو ہدایت کی کہ وہ صحت یاب ہونے تک روزے نہ رکھے کیونکہ اس حالت میں روزے رکھنا اس کی صحت اور جان کے لئے نقصان دہ ہوں گے۔ لیکن اس عیار پیشوا نے محض اپنی مذہبیت ظاہر کرنے کے لئے یہ جواز دیا کہ وہ ایک ایسے حکم کی کیسے خلاف ورزی کرسکتا ہے کہ جس کا حکم مقدس کتاب میں آیا ہے۔ اگر اس نے خلاف ورزی کی تو اگلی دنیا میں اس کی سخت سزا ہوگی۔

اس پر ڈاکٹر اسٹریکر نے انگریزوں جیسی صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ: ''نہیں' نہیں' مولوی صاحب' آپ کو اس کے لئے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کو ایک سرٹیفکیٹ دے دوں گا جو آپ اپنے بھائی فرشتہ کو دکھا دینا جو یقیناً آپ کے لئے نجات کی کوئی راہ ڈھونڈے گا۔''

ایک نیک دل انگریز کے اس ریمارک سے پیشوا کے چہرہ پر شرمندہ سی مسکراہٹ آئی۔

دوسرے ملازم جو وہاں کھڑے تھے وہ اپنی ہنسی کو چھپاتے ہوئے دوسری طرف ہوگئے۔ ان میں سے دو یا تین جو صحیح العقیدہ مسلمان تھے وہ کمرہ سے باہر چلے گئے تاکہ آزادی سے ہنس سکیں۔

سورت میں مجھے اتنے شاگرد مل گئے کہ میرے لئے ان سب کو پڑھانا مشکل ہوگیا۔ لیکن میں دکن کے مقابلہ میں سورت میں زیادہ خوش تھا۔

یہاں پر میں یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ انگریزی زبان میں میری قابلیت کافی بہتر ہوگئی تھی۔ میں اس زبان میں آسانی سے لکھ پڑھ سکتا تھا۔ جہاں تک بولنے کا تعلق ہے تو میرا لہجہ اس قدر عمدہ تھا کہ میرے شاگرد انگریز مذاق میں پوچھا کرتے تھے کیا میرے والدین انگریز ہیں، یا ان میں سے کوئی ایک انگریز ہے۔ یہ اس لئے تھا کہ میری رنگت اور بولنے کا طریقہ دوسرے مقامی لوگوں سے بالکل علیحدہ تھا۔ ان کے ان بے ہودہ سوالوں کے جواب میں، میں صرف مسکرا دیا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ ان کی تعریف میری اوقات سے زیادہ ہی ہے۔ میری خوش قسمتی تھی کہ لورت میں میرا اٹھنا بیٹھنا ان لوگوں سے ہوا کہ جو سائنس اور ادب کے دلدادہ تھے۔ میری کمزوری یہ تھی کہ میری عربی زبان کی لیاقت اس قدر اچھی نہیں تھی کہ ان کی گفتگو سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا۔ اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ میں ہر قیمت پر چاہے میرا کتنا ہی پیسہ خرچ ہو یا وقت لگے، یا کتنی ہی محنت کرنا پڑے، اس زبان کو جو انگریزی کے بعد سب سے مشکل ہے، سیکھ کر رہوں گا۔

میں نے عربی کا مطالعہ اس لگن اور جذبہ سے شروع کیا کہ جیسے کوئی سچا عاشق اپنی محبوبہ کے حصول کے لئے کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں جو بھی مشکلات تھیں ان کا مقابلہ میں نے بڑی خوش دلی کے ساتھ کیا۔ میں دن کا وقت اپنی روزی کمانے میں گزارتا تھا، اور رات کو دیر تک میں کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ تین سال کی محنت کے نتیجہ میں مجھے وہ حاصل ہوگیا کہ جس کی میں نے خواہش کی تھی۔ میں نے شیخ تاج الدین، جوکہ عدالت کے قاضی تھے، ان سے شرعی قوانین میں سند لی، اور مشہور حکیم میر عیسیٰ سے حکمت میں سرٹیفکیٹ لیا۔

سورت میں، میرے جو شاگرد تھے ان میں ایک نوجوان 12 رجمنٹ بمبئی کا، ڈبلیو، جے، ایسٹ وک تھا۔ یہ نوجوان محنتی، ذہین، اور قابل تھا۔ خاص بات یہ کہ اس کا حافظہ قابل رشک تھا۔ وہ جو کچھ بھی یاد کرتا تھا، وہ اس کے حافظہ میں محفوظ ہو جاتا تھا۔ میں جب اس کے ساتھ رہا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی صلاحیتیں اور ذہنی پختگی اس کی عمر کے مقابلہ میں

زیادہ ہیں۔ وہ بڑا نرم مزاج، فیاض، اور کھلے دل کا انسان تھا۔ اس وجہ سے میں اس قابل ہوگیا کہ اس کے علاوہ اور کسی شاگرد کو قبول نہ کروں۔ اس نے ہندوستانی اور فارسی دونوں زبانوں کے امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کرلئے۔ عربی زبان کی ابتدائی قواعد پر بھی اسے تھوڑے ہی وقت میں عبور ہوگیا۔ یہ اس نے اس وقت سیکھی تھی کہ جب میں اس کے ساتھ صبح کی سیر پر جایا کرتا تھا۔ اس کے ساتھ رہنے میں مجھے اس قدر لطف آیا کہ وہ جب تک ہندوستان میں رہا میں نے اسے نہیں چھوڑا۔ سوائے ان چند وقفوں کے درمیان جبکہ زیادہ تنخواہ کی لالچ میں میں نے کوئی اور ملازمت کرلی۔ لیکن پھر جیسے ہی موقع ملا میں واپس اس کے پاس چلا آیا۔

مئی 1822ء میں مجھے 9 رجمنٹ بمبئی کے جان رامزے نے آنے کی دعوت دی۔ ان کی دعوت پر میں شدلا پور کے لئے روانہ ہوا جوکہ سورت سے چار سو پچاس میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہ سفر میں نے بمبئی اور پونا کے راستہ چودہ دن میں طے کیا۔ بمبئی تک میرا سفر بڑا خوشگوار تھا یہاں سے پانویل تک کے لئے میں نے اپنے لئے ایک کشتی، اور ملازم کرایہ پر لئے، چونکہ میں دوبارہ سے اس قسم کی کشتی میں سفر کرنا نہیں چاہتا تھا کہ جسکا تجربہ ایک بار مجھے 1923ء میں ہو چکا تھا۔ شولا پور کا شہر انتہائی گرم اور بغیر کسی درخت کے مجھے ویرانہ سا لگا۔ یہ چاروں طرف سے فصیلوں میں گھرا ہوا ہے۔ اس کے جنوب مغرب میں قلعہ ہے جو کہ پتھروں سے بنا ہوا ہے۔ اس میں کئی برج ہیں۔ اس کے سامنے ایک لمبی خندق ہے جوکہ قلعہ کے جنوب میں جاکر ایک تالاب سے ملتی ہے۔ یہاں آبادی زیادہ مراہٹہ لوگوں پر ہے جن کی تعداد بائیس ہزار ہے۔

اگرچہ رن کا علاقہ گرم ہے، مگر شولا پور سب سے زیادہ گرم ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کی وجہ وہ جگہ ہے کہ جہاں یہ بسا ہوا ہے، کیونکہ یہاں پر گرم ہوا کو سوائے انسانوں کے اور کوئی شکار ملتا ہی نہیں ہے۔ اپنی آمد کے بعد میں کنٹونمنٹ کی طرف گیا کہ جو شہر سے تھوڑے فاصلہ پر تھا۔ جہاں میرے میزبان نے میری بڑی آؤ بھگت کی۔ یہاں پر میں سات مہینے رہا، اس دورانیہ میں میرے نوجوان شاگرد نے ہندوستانی میں خاص قابلیت پیدا کرلی۔ لہٰذا میں کافی انعامات و اکرام کے بعد سورت واپس لوٹا۔ یہاں ایسٹ وک نے کھلے دل سے میرا استقبال کیا اور میں دوبارہ سے اس کی ملازمت میں آگیا۔

1831ء میں ہندوستان میں اپنی آمد کے بعد پہلی مرتبہ مسٹر ایسٹ وک کو سخت بخار آیا۔ گرمی و سردی کے حملے اس پر پانچ دن تک متبادل دنوں ہوتے رہے۔ بخار کی شدت کے

وقت اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اس کے انگریز دوست اس کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ اس دوران میں نے دن رات اس کی دیکھ بھال کی۔ حکمت کے بارے میں' میری جو تھوڑی بہت معلومات تھیں' ان کی بنیاد پر میں کہہ سکتا تھا کہ اس کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اگرچہ بیماری کا حملہ اس قدر شدید تھا کہ اس کی توانائی اس میں گھل گئی تھی۔ وہ اس قدر کمزور ہو گیا تھا کہ بغیر کسی کی مدد کے بستر پر بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس دوران مین کہ جب اسے بخاری نہیں ہوتا تھا' تو میں اسے لیموں کا شربت دیا کرتا تھا جس سے تھوڑی دیر کے لئے اس میں تازگی آجاتی تھی۔ وہ جب بھی مایوسی کا شکار ہوتا تو میں اس کی ہمت بڑھاتا تھا اور اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہتا تھا کہ اس کی حالت ضرور بہتر ہوگی۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ میری نصیحتوں کا اس پر خوشگوار اثر ہوتا تھا۔ کچھ دن بعد وہ بمبئی چلا گیا اور جاتے وقت اپنے گھوڑے اور دوسرا سامان میری تحویل میں دے گیا۔ یہ اچھا ہوا کہ وہ یہاں سے چلا گیا ورنہ میرا خیال ہے کہ اسے اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑتے کیونکہ جس ڈاکٹر کے وہ زیرعلاج تھا' وہ موت کے فرشتہ کا نائب تھا۔ اس کے نسخہ کو جب دواؤں کی دکان پر لے کر جاتا تھا تو' دکاندار' جوکہ میرا دوست تھا' اس کی لکھی دواؤں کو دیکھ کر کبھی تو خوب ہنستا تھا' اور کبھی اس پر لعنت ملامت بھیجتا تھا۔ اس نسخہ کو دیکھتے ہی وہ کہتا تھا: "میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر پاگل ہوگیا ہے' اگر میں اس نسخہ کے مطابق دوا دوں تو میں اس سے زیادہ پاگل ہوں' یا یہ کہو کہ قاتل ہوں جوکہ ایک معصوم شخص کی جان لے رہا ہے۔" ایک مرتبہ جب میں نسخہ لے کر گیا تو اس نے ایک طرف لے جاکر اس کا انگریزی ترجمہ مجھے سنایا۔ (چونکہ یہ نسخہ لاطینی میں لکھا ہوا تھا) اور ایک دوا کے لئے کہا کہ اس میں پانچ قطروں کے بجائے پچاس قطرے لکھے ہیں۔ اگر یہ دوا نسخہ کے مطابق مریض کو دے دی جاتی تو پھر اس دنیا میں اسے کسی اور دوا کی ضرورت نہیں رہتی۔ میں بہرحال اس دوا کے پانچ قطرے مریض کے لئے لیکر آیا' مگر وہ بھی میں نے اس کی مرضی سے پھینک دیئے اور اس کے بجائے اسے لیموں کا شربت دیا۔

وہ ڈاکٹر اس قدر شراب کے نشہ میں دھت رہتا تھا کہ اسے اپنی بھی خبر نہیں رہتی تھی۔ وہ چار دن تک ہمارے ساتھ مریض کی دیکھ بھال کے لئے رہا' مگر اس عرصہ میں' اس نے مریض کی طرف بالکل توجہ نہیں دی۔ وہ تمام رات برانڈی کی بوتل لئے میز پر بیٹھا رہتا تھا۔ شمع جلتی رہتی تھی' اس کا سگار کا ڈبہ اس کے آگے پڑا رہتا تھا' اور وہ رات بھر میں ایک بوتل ختم کر دیتا تھا۔ جہاں تک سگاروں کا تعلق ہے تو ان کی تعداد بیان کرنے سے

قاصر ہوں، لیکن صبح ہوتے ہوتے میزان کی راکھ سے ائی ہوتی تھی۔

مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ پانچویں رات کو ہمارا نوجوان مریض ڈاکٹر کی پہنچ سے دور بمبئی کے لئے روانہ ہو چکا تھا اور میرے گھر میں اس کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ نشہ باز وہاں شراب پی سکے۔ جب میں نے کچھ عرصہ تک اپنے نوجوان دوست کے بارے میں کچھ نہیں سنا تو میں نے اسے خط لکھا اور اس کی صحت کے بارے میں معلومات کیں۔ دس دن تک مجھے کوئی جواب نہیں آیا۔ اس پر میں پریشان ہوگیا، اور بمبئی جانے کا ارادہ کرنے لگا، تاکہ وہاں جاکر بذات خود اس کی خیریت دریافت کروں۔ لیکن 29 اکتوبر کو مجھے اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط ملا۔ اس میں اس نے اپنی صحت کے بارے میں لکھا تھا اور مجھے ہدایت دی تھی کہ میں فوراً اس کے گھوڑے و سامان لے کر تن کاریہ روانہ ہو جاؤں، جہاں سے وہ لارڈ کلیر کی کمانڈ میں اجمیر روانہ ہو رہا ہے۔ میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور تن کاریہ کی بندرگاہ پر ملنے کے بعد ہم لارڈ شپ کے ہمراہ روانہ ہوگئے۔

آرام سے سفر کرنے اور پانچ جگہ قیام کرنے کے بعد ہم بروڈہ پہنچ گئے کہ جہاں ہم نے کچھ دن قیام کیا۔ یہاں پر لارڈ شپ گیکواڑ کے لوگوں سے ملاقاتوں میں مصروف رہے۔ ہمارے روانہ ہونے پر مہاراجہ نے لارڈشپ اور ان کے ساتھ جو بھی لوگ تھے انہیں قیمتی تحفوں سے نوازا۔ میرے حصہ میں سونے کا ہار، پگڑی اور ایک شال آیا۔ لیکن مجھ سے اور دوسرے اور لوگوں سے یہ تحائف لے لئے گئے۔ شاید یہ حکومت کے خزانہ میں جمع کرا دیئے ہوں۔ جب ہمیں صبح جانے کا حکم ملا تو میں نے اپنا پلنگ جو کسی دوست سے ادھار لیا تھا اسے واپس بھیج دیا اور خود زمین پر بستر بنا کر سو گیا۔ صبح جب میں بگل کی آواز سن کر اٹھا، تو میں نے دیکھا کہ میر بستر پر نمی آلود گرد ہے جس کی وجہ سے جگہ جگہ سے میری کھال ادھڑ گئی ہے اور میری پیٹھ میں مسلسل کھجلی ہو رہی ہے۔ میں نے فوراً اپنے ملازم کو آواز دی کہ جو گھوڑے پر زین کسنے میں مصروف تھا۔ "مہدی علی" میں نے غصہ میں کہا: "تم نے گھوڑے کی زین کو صاف کرتے ہوئے ساری گرد میرے بستر پر پھینک دی۔"

"نہیں، جناب میں نے بالکل ایسا نہیں کیا۔" اس نے جواب میں کہا۔ جب میں نے اپنا کوٹ اٹھایا تو وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوکر میرے ہاتھ میں آگیا، اور یہی کچھ میرے کمبل کے ساتھ ہوا، اور میری ڈسک کے نچلے حصہ کا جس میں رکھے ہوئے اہم کاغذات بھی ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے تھے یہ دیکھ کر میں ششدر رہ گیا اور خود سے کہنے لگا کہ آخر یہ سب کچھ کیا ہے؟

جب میں زور سے چیخا تو مہدی علی ایک جلتی ہوئی لکڑی کو قریب لایا اور اس کی روشنی مین اس نے ان بوسیدہ چیزوں کو دیکھا' اور پھر بڑے اطمینان سے کہنے لگا کہ "یہ سفید چونٹیاں ہیں۔ جناب' بس اس کو قسمت کی خرابی کہئے۔" یہ سن کر میں سوچنے لگا کہ چاہے کسی قدر مصیبتیں آئیں یا حادثات ہوں' یہ ہمیشہ قسمت کو الزام دیتا ہے۔ لیکن کبھی خود کو یا مجھے اس کا ذمہ نہیں ٹھہراتا ہے۔

ہم آہستہ آہستہ سفر کرتے ہوئے بڑودہ سے احمد آباد کے راستے دبیسا پہنچے جہاں کہ ایک بڑا کنٹونمنٹ تھا۔ یہاں پر اس کو اس لئے قائم کیا گیا تھا تاکہ اس علاقہ کو ڈاکوؤں اور لٹیروں سے محفوظ رکھا جائے۔ وہاں سے ہم آبو کی طرف گئے جہاں پہاڑ کے دامن میں ہم نے تین دن گزارے۔ یہاں پر لارڈ شپ کی خواہش تھی کہ وہ پہاڑ پر چڑھ کر قدیم یادگاروں کو دریافت کریں۔ لہٰذا دوسرے دن خاص خاص لوگوں کی ایک جماعت پہاڑ پر چڑھنے کے لئے تیار ہوئی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں بھی اس جماعت میں شامل تھا۔ اگرچہ میں دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں تو پیچھے رہ گیا' مگر لارڈشپ جوکہ اپنے اسسٹنٹ ساتھ تھے' ان سے آگے نکل گیا۔ جب ان کے ساتھی نے دیکھا کہ میں تیزی سے آگے بڑھ رہا ہوں تو اس نے درخواست کی کہ میں اپنی چھڑی لارڈشپ کو دے دوں کہ جس کے سہارے وہ چل سکیں۔ میں یہ سوچتے ہوئے کہ انکار کرنا بدتہذیبی ہے فوراً اپنی چھڑی ان کے حوالے کردی۔ لارڈشپ نے اس تحفہ کو قبول کرتے ہوئے میرا شکریہ ادا کیا' اس کو تحفہ اس لئے کہنا چاہئے کہ میری چھڑی پھر مجھے واپس نہیں ملی۔ وہ اس چھڑی کو پاکر بے انتہا خوش ہوئے کیونکہ اس سے انہیں چڑھنے میں آسانی ہوگئی۔

میں لارڈ شپ اور ان کی جماعت کے ساتھ دیلورا کے مندروں تک رہا پھر ان کا ساتھ چھوڑ کر اکیلا ہی ادھر ادھر گھوما۔ جب شام ہونے لگی تو میں نے محسوس کیا کہ مجھے بھوک بھی لگی ہے اور سردی بھی ہوگئی' مگر مسئلہ یہ تھا کہ میں اپنے ساتھیوں سے کھانا مانگتے ہوئے شرم محسوس کرتا تھا کیونکہ وہ اپنی ضرورت کے تحت کھانے کا سامان لائے تھے' میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ یہاں کے مقامی باشندوں سے جو مکمل طور پر گمراہ ہیں۔ ان سے روٹی مانگوں۔ اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ میں واپس کیمپ جاؤں اور وہیں اپنی بھوک کا بندوبست کروں۔ بدقسمتی سے میری واپسی پر زبردست بارش ہوگئی کہ جس سے میں بری طرح سے بھیگ گیا' لہٰذا جب نو بجے رات کو میں اپنے خیمہ میں پہنچا ہوں تو اس وقت تک میں تھک کر چور ہو چکا تھا۔ دوسرے دن اس کے نتیجہ میں سخت بخار ہوگیا' مگر بروقت علاج اور

میرے نیک دل آقا کی مدد سے میں نے جلد ہی اس سے نجات پا لی۔

آبو کا پہاڑ، سروہی شہر سے مشرق کی جانب بیس میل کے فاصلہ پر ہے یہ راؤ سیو سنگھ جی کے متعلق ہے اور ہندوؤں کی، خاص طور سے جین مت ماننے والوں کی قدیم عبادت گاہ ہے۔ یہ سطح سمندر سے دس میل اونچا ہے۔ اس پر چڑھنے کے لئے بارہ راستے ہیں۔ ان میں سے ان نادرہ سب سے زیادہ محفوظ ہے۔ اس لئے اس راستہ پر سیاح اور زائرین کافی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ نادرہ کا گاؤں سروہی سے بیس میل ہے۔ اس پہاڑ کے اوپر ایک تالاب ہے جو "نکھی تلا" کہلاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس تالاب کو ہندوؤں کے دیوتاؤں نے اپنے ناخنوں سے کھودا تھا۔ اس تاباب کے اردگرد غاروں اوز پہاڑ کی وادی میں سنیاسی اور جوگی رہتے ہیں۔ مگر وہ بہت کم لوگوں کو نظر آتے ہیں۔ اگست کے مہینہ میں جب کہ سورج درگو کے دائرہ میں جاتا ہے، تو ہندوؤں کے لئے مقدس ہوتا ہے اور اس وقت وہ اس تالاب میں نہا کر گناہوں سے پاک صاف ہو جاتے ہیں۔ اس وجہ سے اس موقع پر دور و نزدیک سے ان کی بڑی تعداد یہاں جمع ہو جاتی ہے۔

ان بارہ راستوں میں سے دو بہت زیادہ مشکل سمجھے جاتے ہیں۔ یہ کاچھولی اور نیٹوری گاؤں سے جاتے ہیں۔ ان میں پہلا راستہ اس قدر تنگ اور ناہموار ہے کہ مسافر کو ہاتھوں کے سہارے چلنا پڑتا ہے۔ اگر وہ اوپر دیکھتا ہے تو چوٹی آسمان کو چھوتی نظر آتی ہے، اور جب نیچے دیکھتا ہے تو اندھیری گہرائی کے اور کچھ نظر نہیں آتا ہے۔ ذرا سی بھی غلطی نہ صرف اس کے سفر کو ختم کردیتی ہے بلکہ اس کی زندگی کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔

دوسرے راستہ سے بھی چڑھنا اور اترنا دونوں خطرناک ہیں۔ اس کے علاوہ اس راستہ پر گھنا جنگل ہے کہ جس میں وحشی جانور ہیں، جن کی وجہ سے وہ اور بھی زیادہ غیر محفوظ ہو گیا ہے۔ اس کی ایک وادی کو پہنچ سے دور سمجھا جاتا ہے اس لئے سروہی کے سابق حکمرانوں نے یہاں اپنے اور اپنے خاندان والوں کے لئے ایک قلعہ بنوایا تھا تاکہ خطرے وقت آکر رہا جا سکے۔

پہاڑ کے اوپر تیرہ گاؤں ہیں، ان میں سے تین ویران ہیں۔ باقی دس میں دو دیلوارا اور اچھلگڑھ ہیں کہ جن کی آبادی سات سو کے قریب ہے۔ یہاں پر ہندوؤں اور جین مت کے بہت سے مندر ہیں۔ ان میں کچھ بڑے خوبصورت اور شاندار ہیں۔ ان کے فرش اور چھت پر سنگ مرمر ہے۔ دیواریں اس قدر چکنی ہیں کہ ان میں اپنی صورت دیکھی جا سکتی ہے۔ میں خاص طور سے ان پانچ جین مندروں سے بڑا متاثر ہوا کہ جو دیلورا میں ہیں جو نیم ناتھ

اور راکھیدیو' جوکہ دو جین مقدس ہستیاں ہیں' ان کی یاد میں تعمیر ہوئے ہیں۔ ان کے ستونوں اور چھتوں پر جو نقش و نگار اور پھول پتیاں بنائی گئی ہیں وہ بالکل اصلی معلوم ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک مندر کے پیچھے دس ہاتھیوں کے مجسمے ہیں۔ ایک دوسرے مندر میں مین گیٹ پر دس ہاتھی اور ایک گھوڑے کے مجسمے ہیں۔ یہ سب خالص سنگ مرمر سے تراشے گئے ہیں۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح سے ان بھاری پتھروں کو کہ جن کو تراش کر یہ مجسمے بنائے گئے ہیں' پہاڑ کے اوپر پہنچایا گیا ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ ان خوبصورت مندروں کی تعمیر کرانے والا ایک ساہوکار تھا کہ جسکے کوئی اولاد نہ تھی' لہٰذا اس نے اپنی ساری دولت ان مندروں کی تعمیر پر خرچ کی یہ 1243ء کی بات ہے۔

اس پہاڑ سے جو آمدنی ہوتی تھی' اس کا آدھا سروہی کے راجا لے لیا کرتے تھے اور تھوڑا بہت چھوٹے چھوٹے سردار۔ باقی جو بچتا تھا وہ مذہبی کاموں پر لگا دیا جاتا تھا۔ جیسے کہ مندروں کی مرمت اور غریب زائرین کی مدد۔ لیکن موجودہ راؤ سیو سنگھ جی جنہوں نے سنگا میں غسل کرلیا ہے' اب اس کی ساری آمدنی خیرات و صدقات پر خرچ کرنے کا حکم دے دیا ہے۔

ہمارا کیمپ یہاں سے 2 جنوری 1832ء کو روانہ ہوا اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے پندرہ دن کے اندر اجمیر پہنچے جو کہ سورت سے دو سو انتیس میل کے فاصلہ پر ہے۔

آٹھواں باب

آبو سے اس پار کا علاقہ ریتیلا ہے۔ سوائے ان چند حصوں کے کہ جہاں اراوی کے پہاڑ ہیں' یہ جگہیں پتھریلی اور کھردری ہیں۔ یہ بنجر علاقہ میواڑ کہلاتا ہے۔ اگرچہ یہاں دور دور تک کوئی آبادی نہیں' مگر اس کے تین شہر بڑے مشہور ہیں جن میں اودے پور' پالی' پوکھرجی شامل ہیں۔

اودے پور سوڈیہ راجپوتوں کا حکومتی مرکز ہے۔ ان کے قبیلہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ صحیح النسل ہے اور راجپوتانہ میں ان کا رتبہ اونچا ہے۔ ان کے حکمران رانا کہلاتے ہیں۔ جب یہ گدی نشین ہوتے ہیں تو ان کے ماتھے پر انسانی خون سے تلک لگایا جاتا ہے۔ ایسے موقع پر اسے کیسے حاصل کیا جاتا ہے یہ ایک راز ہے۔ میرا خیال ہے کہ کسی قیدی کو قتل کرکے اس کے خون کو اس مقصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہوگا۔ یہ شہر خوبصورت ہے اور اونچائی پر آباد ہے۔ اس کے مغربی حصہ میں ایک بڑی جھیل ہے جس کے درمیان میں ایک چھوٹا سا جزیزہ ہے' جس میں دو محلات بنے ہوئے ہیں۔ ان محلات میں حکمران گرمیاں گزارتے ہیں اور پوری طرح سے عیش و آرام سے لطف اٹھاتے ہیں۔

پالی صحرا کے کنارے پر واقع ایک بڑی منڈی ہے۔ میں نے یہاں سے چند یورپی اشیاء بمبئی کے مقابلہ میں زیادہ سستی خریدیں۔ یہاں کی آبادی عام طور پر دولت مند ہے۔ گھروں کی تعداد تقریباً گیارہ ہزار ہے۔

تیسرا شہر پوکھرجی ہے۔ اس کا اصلی نام پش کارا تھا جوکہ ایک بڑے تالاب سے موسوم تھا۔ اس تالاب کے تین اطراف میں پتھروں کی دیواریں ہیں اور تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر نیچے جانے کے لئے سیڑھیاں ہیں۔ تالاب کے کناروں پر مندر ہیں۔ شہر زیادہ بڑا نہیں ہے مگر اس کے مشرقی حصہ سے یہ بڑا خوبصورت نظر آتا ہے۔ 17 جنوری ہماری آمد کا دن تھا۔ رات خاموش اور ٹھنڈی تھی۔ جب میں اس تالاب کو دیکھنے گیا ہوں تو سنسان رات میں آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ میں اس کی سیڑھیوں پر کھڑا' تنہا غور و فکر میں مدہوش رہا۔ میں اس کی خوبصورتی سے بے انتہا متاثر ہوا۔ اس میں پانی ایسا نظر آتا تھا جیسے

کہ آئینہ۔ اس میں قریبی عمارتوں کے سائے جھلملاتے نظر آرہے تھے۔ جب میں واپس اپنے خیمہ میں آیا ہوں تو اپنی اس مہم پر بڑا مطمئن تھا۔

دوسرے دن 18 تاریخ کی صبح کو ہم اجمیر پہنچ گئے جو کہ راجپوتانہ کا کیپٹل ہے یہاں ہم نے اپنے خیمے گورنر جنرل کے کیمپ کے سامنے لگا لئے جو کہ شہر سے تھوڑے ہی فاصلہ پر تھا۔

یہ دونوں عظیم ہستیاں خاموشی سے سیاست کے اسرار و رموز پر باہم گفتگو کرتی رہیں۔ قریب کے سرداروں اور راجاؤں کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ آکر ہندوستان کے ان حکمرانوں کی خدمت میں سلامی دیں۔ اجمیر میں ہم چھ ہفتہ ٹھہرے اس کے بعد نصیر آباد اور لون واڑہ ہوتے ہوئے برودہ کے لئے روانہ ہوئے۔

میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اجمیر چھوڑنے سے قبل اس کے بارے میں ضرور بتاؤں۔ یہ قدیم شہر جو پش کارا شہر کے جنوب میں چھ میل کے فاصلہ پر ہے' ایک پہاڑ کے دامن میں آباد ہے جس کے اوپر مشہور قلعہ تارا گڑھ واقع ہے۔ یہاں کے لوگ مالدار ہیں۔ ان کے مکانات پکے اور شاندار ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آبادی تیس ہزار سے زیادہ نہیں ہوگی۔ انگریزوں نے اس شہر کو سندھیا سے لیا اور اس کا انتظام مسٹر ولڈر کے حوالہ کیا' جن کی شبانہ روز محنت کی وجہ سے اب یہ شہر جے پور سے مقابلہ کرنے لگا ہے۔ شہر کے ایک بازار کا نام ولڈریہ ہے جو اپنی تعمیراتی خوبصورتی کی وجہ سے اس علاقہ کے تمام شہروں میں لاجواب ہے۔

سید حسین مشہدی اور خواجہ معین الدین اجمیری جو مسلمانوں کے دو انتہائی مقدس بزرگ ہیں وہ اسی شہر میں مدفون ہیں۔ پہلے بزرگ کی درگاہ تارا گڑھ پہاڑی کی چوٹی پر ہے' جبکہ معین الدین اجمیری کی پہاڑی کے دامن ہے۔ سید حسین روحانی و مادی دونوں لحاظ سے اہم شخصیت تھے' وہ قطب الدین ایبک کے زمانہ میں اس جگہ کا گورنر تھا۔ اس کے زمانہ میں خواجہ ایک طویل سفر کے بعد یہاں پر آئے اور پھر بقایہ زندگی یہیں پر گزاری۔ وہ بڑے اچھے تیرانداز تھے اور یہ ان کی عادت تھی کہ ایران و ترکستان میں صحراؤں میں رہتے تھے اور تیر کمان سے جو شکار کرتے اس پر گزارا کرتے تھے۔ باقی وقت دنیا سے دور مراقبہ میں گزارتے تھے۔ وہ بجستان میں 527 ھ میں پیدا ہوئے تھے اور جب مرے ہیں تو ان کی عمر ایک سو آٹھ سال تھی۔ ان کی اور گورنر کی باوجود اس کے کہ گورنر شیعہ تھا اور یہ سنی۔ دوستی ہوگئی تھی اور بعد میں یہ دوستی رشتہ داری میں بدل گئی۔

اجمیر میں قیام کے دوران وہ دو مرتبہ دہلی گئے۔ کہا جاتا ہے کہ جب وہ دوسری مرتبہ دہلی گئے تو گورنر اجمیر کا چچا جو دہلی میں رہتا تھا' خواب میں اس کے آباؤاجداد نے یہ ہدایت کی کہ وہ اپنی لڑکی کی شادی اپنے عہد کے بزرگ خواجہ معین الدین چشتی سے کردے۔ جب انہوں نے یہ سنا تو کہا کہ اگرچہ ان کی زندگی کے دن کم ہیں' لیکن وہ اس مقدس رشتہ سے انکار بھی نہیں کرسکتے۔ لہٰذا دونوں کی شادی ہوگئی جس کے بعد وہ سات سال زندہ رہے اور اس بیوی سے ان کے کئی بچے پیدا ہوئے۔

ان کے مقبرے کے قریب جو بڑی اور کشادہ مسجد ہے وہ 1027ھ میں شہنشاہ جہانگیر نے تعمیر کرائی تھی۔ یہ درگاہ اب تمام مسلمانوں میں بڑی مقدس خیال کی جاتی ہے۔ شہنشاہ اکبر کئی بار اس کی زیارت کے لئے آگرہ سے آیا جو کہ یہاں سے دو سو بتیس میل کے فاصلہ پر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب وہ دور سے مقبرہ دیکھتا تھا تو ننگے پیر پیدل چل کر یہاں تک آتا تھا۔ بہت سے ہندو' کہ جن کا ذہن آسانی سے توہمات کو قبول کرلیتا ہے' وہ بھی درگاہ میں زیارت کے لئے عام مسلمانوں کی طرح آتے ہیں۔ مہاجی سندھیا اور جسونت راؤ ہلکر درگاہ کے لئے ہر سال نذرانہ بھیجا کرتے تھے۔ دولت راؤ سندھیا نے نذرانہ کے علاوہ اس پوری عمارت کی مرمت کرائی۔ یہاں پر روز ہزاروں زائرین زیارت کے لئے آتے ہیں۔ ان میں سے کچھ کی منتیں پوری ہو جاتی ہیں۔ اس لئے وہ سمجھتے ہیں کہ اس میں شیخ کا وسیلہ ہے' لہٰذا وہ لوگ اسے شیخ کی کرامت سمجھ کر اس پر اور زیادہ ایمان لے آتے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو انسان کی حیثیت بھیڑوں کے گلہ کی ہے' جو ایک کرتا ہے دوسرا بھی اس کی نقل کرنے لگتا ہے۔ مقبرہ کے اندر کا حصہ شاندار بھی ہے اور مقدس بھی۔ فرش پر خالص سنگ مرمر ہے' دیواروں پر جالیاں ہیں اور چھت سفید رنگ کی خوبصورت ہے جو دیکھنے میں ہموار نظر آتی ہے۔ بیچ میں قبر ہے جس پر قیمتی چادر پڑی ہوئی ہے۔ اس کے اردگرد چاندی کا جنگلہ ہے۔ قبر کے سرہانے چاندی کا بڑا خوشبو دان رکھا ہے جس میں سے خوشبو کا دھواں آتا ہے اور پورے مقبرہ کو معطر بنا دیتا ہے۔ جو کوئی اس جنگلہ میں جاکر قبر کو چھونا چاہتا ہے' متولی اس سے کافی رقم اینٹھتا ہے۔

مارچ 1833ء میں واپس سورت آگیا' اور یہاں کچھ وقت اپنے گھر والوں اور دوستوں کے ساتھ گزارا۔

چونکہ اس سال میری آمدنی کم تھی' اس لئے میں نے حکمت شروع کردی اور خدا کا شکر ہے کہ جلد ہی اس میں میری صلاحیتوں سے زیادہ میرا نام ہوگیا۔ میرا یہ دستور تھا کہ

غریبوں کو مفت دوا دیا کرتا تھا اور امیروں سے فیس وصول کرتا تھا۔ میں نے یہ بھی خیال رکھا کہ ایسے مریض کا علاج نہ کروں کہ جس کا مرض میری سمجھ سے باہر ہو۔ ایسے مریضوں کو میں گورنمنٹ ہاسپٹل بھیج دیا کرتا تھا۔ پندرہ مہینہ تک میں نے پریکٹس کی۔ اس دوران میں چھ سو چونسٹھ مریضوں کا میں نے علاج کیا' ان میں سے چھ سو اکسٹھ مریض صحت یاب ہوئے' تین مریض مر گئے' دو بخار سے اور ایک ہیضہ سے۔

نومبر میں میرے ہاں لڑکا پیدا ہوا جس کا نام میں نے قدرت اللہ رکھا۔ اگرچہ اس کی پیدائش سے مجھے بے انتہاء خوشی ہوئی' مگر میری یہ خوشی میرے حالات کی وجہ سے زیادہ نہیں رہی۔ کیونکہ اس کی پیدائش سے میرے اخراجات بہت بڑھ گئے' نرس کی فیس' خیرات و صدقہ دینا جو کہ ایسے موقع پر ضروری خیال کیا جاتا ہے' اس لئے مالی حالات کی وجہ سے میں اس بات پر مجبور ہوا کہ حکمت کے پیشہ کو خیرباد کہہ دوں اور دوبارہ سے تدریس کو اختیار کروں۔ لہٰذا میں نے نئے شاگردوں کی تلاش شروع کی اور جب مجھے لیفٹیننٹ بوائے کی احمد آباد سے پیش کش آئی تو فوراً اسے قبول کرتے ہوئے روانہ ہوگیا۔ یہ نوجوان چونکہ ذہین اور باصلاحیت تھا اس لئے اس نے بہت جلد اردو زبان میں مہارت حاصل کرلی اور مجھے ساتھ لے کر پریذیڈنسی روانہ ہوا۔ جہاں اس نے کمیٹی کے سامنے اچھے نمبروں سے امتحان پاس کرلیا اور مجھے میری توقع سے زیادہ انعام و اکرام سے نوازا۔ لہٰذا میں دوبارہ گھر آیا' یہ روپیہ جو میں نے کمایا تھا اب سال بھر کے لئے میرے لئے کافی تھا۔

جون میں' میں سورت واپس آیا اور تین ہفتہ تک بغیر کسی ملازمت کے رہا۔ اسی دوران ہزہائی نس میر افضل الدین خان سورت کے نواب نے مجھ سے درخواست کی کہ میں ان کے سیکرٹری کی حیثیت سے کام کروں۔ میں نے فوراً اس پیشکش کو قبول کرلیا۔ ہزہائی نس نے مجھے ناشتہ پر بلایا اور وہاں انہوں نے اعلان کیا کہ وہ ہمیشہ کے لئے مجھے اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں اور وہ فوراً ہی میرے لئے ایک الاؤنس مقرر کرنا چاہتے ہیں کہ جسکا فرمان ان کے دستخطوں کے ساتھ جلد ہی مجھے دے دیا جائے گا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ انہیں جیسے ہی اپنے دشمنوں سے یعنی برطانوی حکومت سے نجات ملے گی وہ میری ترقی کے لئے بھی سوچیں گے۔ انہوں نے اس موقع پر مجھے دو خوبصورت شال تحفے میں دیئے۔ ان کو قبول کرنے کے بعد میں اپنی نشست سے اٹھا اور تسلیمات بجا لایا۔

جب میں واپس گھر پہنچا تو دیکھا کہ نواب کے ملازم' گرز بردار' اور موسیقار مجھے مبارکباد دینے کے لئے جمع ہیں۔ میں نے انہیں تحفے تحائف دے کر رخصت کیا۔ جب مجھے

فرصت ملی تو میں نے نواب کا فرمان پڑھا:

منشی لطف اللہ صاحب کے ماہانہ مشاہرہ، منجانب ہزہائی نس قمرالدولہ، حشمت جنگ، بہادر، نواب آف سورت، پچاس روپیہ نقد، مفت کھانا، خاندان کے لئے کھانے کا راشن، ایک گھوڑا معہ دو سائسوں اور دو ملازموں کے ساتھ۔ سال میں کپڑوں کے دو جوڑے۔

میں نے اس تنخواہ کو کافی اچھا پایا، کیونکہ اس رقم میں ایک شریف آدمی اچھی طرح سے گزارا کر سکتا ہے اور پھر نواب نے میری ترقی کا بھی وعدہ کیا تھا۔ میں نواب صاحب کے دربار میں پابندی سے حاضری دیا کرتا تھا اور وہ مجھے ہر موقع پر تحفے تحائف سے نوازتے رہتے تھے۔

نواب صاحب شریف آدمی تھے، ان کی عمر ترپن سال کی ہوگی۔ قد اگرچہ چھوٹا تھا، مگر فربہ اور بارعب تھے۔ انکی رنگت گندمی تھی مگر ان کی گفتگو اور چال ڈھال میں رئیسانہ شان تھی۔ ذات کے وہ سید تھے اور ان کے دادا برہانپور کے ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو 1732ء میں سورت بحیثیت مہم جو کے آئے تھے۔ ان کی شادی اس وقت کے گورنر صفدر خاں کی لڑکی سے ہوگئی۔ اس سے ان کو شہرت بھی ملی اور مقبولیت بھی۔ اسی کا سہارا لے کر وہ خود سورت کا نواب بن بیٹھا۔ اس کے جانشینوں نے 13 مئی 1800ء تک حکومت کی۔ اس کے بعد موجودہ نواب کے والد نے یہ شہر 15000 پونڈ سالانہ کی پنشن پر انگریزوں کے حوالہ کردیا۔ اس کے عوض انہوں نے اسے نواب کا خطاب رکھنے اور چند مراعات اٹھانے کی اجازت دے دی۔ اس کے مرنے کے بعد 1821ء میں موجود نواب گدی نشین ہوا اور اس کو بھی سابقہ مراعات رکھنے کی اجازت دے دی۔ اب اس کھوکھلے خطاب رکھنے والے مجبور نواب سے وفاداری کرنا میری ملازمت میں شامل تھا۔ نواب کے وزیر نے مجھے بتایا کہ دو مہینے ہوئے کہ مقامی ایجنٹ نے نواب کے ساتھ انتہائی بدتمیزی کا مظاہرہ کیا۔ یہ اس طرح سے کہ اس نے نواب کے ایک ملازم کو شراب پینے کی وجہ سے مارا پیٹا اور لوگوں کے سامنے اسے گھسیٹتے ہوئے اپنے ہاں لے گیا۔ نواب اس وقت وزیر کے گھر پر تھا۔ اسے جب اپنے ملازم کی بے عزتی کا پتہ چلا تو اس نے پولیس گارڈ کو حکم دیا کہ وہ ملازم کو اس کے پاس لے کر آئیں، جسے اس نے فوراً رہا کروا دیا۔ جب مقامی ایجنٹ کو اس کے بارے میں معلوم ہوا تو اس نے اسے اپنی بے عزتی سمجھی۔ لہٰذا اب نواب کے خلاف سازش میں مصروف ہے اور مسٹر لس ڈین کے کہ جو انگریز ایجنٹ بھی ہے، جج بھی اور مجسٹریٹ بھی، اس کے کان بھر رہا ہے۔

اب میرا کام یہ تھا کہ مقامی ایجنٹ نے جو گیارہ الزامات لگائے تھے ان کا جواب دوں۔ نواب صاحب نے اس ڈرافت کو جو میں نے لکھا تھا اس کے پڑھنے میں تین دن لگائے اور پھر اسے پاس کرتے ہوئے اس کی زبان' اسلوب' اور دلائل کی تعریف کی۔ اس خط کو فارسی میں مجھے ہی صاف کر کے لکھنا پڑا' کیونکہ ہندو کلرک نہ تو صحیح طریقے سے فارسی لکھ سکتا تھا اور نہ ہی سمجھ سکتا تھا۔

بہرحال حکومت اور نواب کے درمیان جو اختلافات تھے وہ اس کے بعد ختم ہو گئے۔ مقامی ایجنٹ نے نواب صاحب سے معاہدہ کر کے دوبارہ سے ان کی سرپرستی حاصل کر لی۔ نواب صاحب نے حسب معمول ہر رات کو اس کو اہم معاملات کی تفصیلات بھیجنی شروع کردیں۔ کبھی کبھی میں بھی اس کے پاس چلا جاتا تھا اور وہ جو کچھ کہتا اس رپورٹ نواب صاحب کو دیتا تھا۔

کوئی ساڑھے پانچ ہفتہ تک میں نواب صاحب کا پسندیدہ مصاحب رہا' جلد ہی میں نے دیکھا کہ مقامی ایجنٹ کے ساتھ کچھ خفیہ بات جیت ہو رہی ہے کہ جس سے مجھے بے خبر رکھا جارہا ہے۔ اس کے نتائج جلد ہی مجھ پر ظاہر ہو گئے۔ چھ مہینے کی رفاقت کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ غریب نواب دوسروں کے ہاتھ میں محض ایک کھلونہ ہے۔ وہ اس قابل ہی نہیں ہے کہ خود سے کوئی فیصلہ کر سکے۔ وہ خراب صحبت میں رہتا ہے اور شراب و افیم کا رسیا ہے۔ اب نواب کو اس کے کمینہ اور بدخصلت وزیر نے مقامی ایجنٹ کے ساتھ مل کر اس بات پر اکسایا کہ وہ اپنے سابق وزیر کی جائیداد پر زبردستی قبضہ کر لے۔ اس کا یہ موجودہ وزیر ایک ان پڑھ' لچر اور انتہائی خبیث طبیعت کا مالک ہے۔ اس سے پہلے یہ کیپٹن رانکن کا انتہائی معمولی ملازم رہ چکا تھا۔ مقامی ایجنٹ نے اس سازش میں وزیر کا ساتھ دیا تاکہ وہ اپنے بدترین دشمن کو تباہ کر سکے۔ لیکن اس سازش میں ساتھ دینے کی شرط یہ تھی کہ نواب اس کی پسند کے آدمیوں کو اہم عہدوں پر تقرر کریں گے۔ یہ وہ خفیہ بات چیت تھی کہ جس پر عمل کرتے ہوئے انہوں نے دیوان ہردی رام کو اس کے عہدے سے علیحدہ کر کے اس کے آفس کو گھیر لیا اور وہاں سے تمام خزانہ اور ریکارڈ اٹھا کر لے گئے۔ اس سے کہا گیا کہ اسے ملازمت سے اس لئے علیحدہ کیا جارہا ہے کیونکہ وہ سابق وزیر سے خفیہ طور پر رابطہ رکھتا ہے۔ غریب ہردی رام نے بڑی جرات سے جواب دیا کہ اس کے سابق وزیر سے کوئی رابطے نہیں ہیں' بلکہ اس کا جھگڑا مقامی ایجنٹ سے ہے۔ اسے توقع تھی کہ مقامی ایجنٹ سے سمجھوتے کے بعد اس کے ساتھ یہی سلوک ہوگا کہ جو اب ہو رہا ہے۔ "خدا عظیم و برتر

ہے۔ میں بے گناہ ہوں' سچائی یقیناً ایک دن ضرور ظاہر ہوگی' اور خطا واروں کو ضرور سزا ملے گی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے چابیاں حوالے کیں اور خود وہاں سے چلا گیا۔

دوسرے دن وزیر اور مجھے یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ ہم آتما رام کے پاس جاکر اسے نواب کی طرف سے دیوان کے عہدے کی پیشکش کریں' آتما رام کیپارام کالڑکا ہے کہ جس نے نواب کے والد کے زمانہ میں 1800ء کے معاہدے کو مسٹر جوناتھن ڈنکن سے بات چیت کرکے طے کردیا تھا۔ اس کے عوض اسے اور اس کے جانشینوں کو حکومت برطانیہ سے تین سو روپیہ ماہوار کی دائمی پنشن مل گئی تھی۔ اس معاہدے کے بعد سے کیپارام کا خاندان مرحوم نواب' اور موجودہ نواب کی نظروں میں قابل نفرت تھا' کیونکہ معاہدے کے وقت غداری کی تھی اور اپنے آقا کے مفادات کو قربان کرکے اپنی ذاتی مفادات کو ان پر ترجیح دی تھی۔ اس وجہ سے نواب نے اسے اپنی ملازمت سے نکال دیا تھا۔ کیپا رام کی وفات کے بعد اس کا لڑکا آتما رام جو کہ سنسکرت اور فارسی زبانوں میں مہارت رکھتا تھا' مقامی ایجنٹ کی خوشامد میں مصروف ہوگیا تاکہ اس کی سفارش سے کوئی اچھا عہدہ حاصل کرلے۔ اس کو تین سو روپیہ ماہوار کی جو پنشن ملتی تھی' اس نے اس سے بڑھ کر اپنے اخراجات کو لئے نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے قرض لیا وہ تیس ہزار کے قریب قریب پہنچ گیا۔ آخرکار مقامی ایجنٹ کی مدد سے اسے دیوان کے عہدے کی پیشکش ہوئی۔ اس کی تنخواہ تو بہت معمولی تھی' یعنی پچاس روپیہ ماہانہ' مگر اس کا فائدہ یہ تھا کہ نواب میں ملازمت میں آنے کے بعد وہ عدالتی اختیارات سے باہر ہو جاتا تھا اور کوئی قرض خواہ اس پر اپنے روپیوں کی واپسی کے لئے عدالت میں نالش نہیں کرسکتا تھا۔

آتما رام کے ساتھ ایک دوسرا چالاک ہندو مستی رام بحیثیت اکاؤنٹنٹ مقرر ہوا۔ یہ تمام کچھ کرنے بعد' دوسری چیز یہ تھی کہ سابق وزیر کو نواب کے سامنے ذلیل کیا جائے' اس مقصد کے لئے اس کو پیغام بھیجا گیا کہ وہ دربار میں حاضری دے۔

یہ شخص اگرچہ ان پڑھ و لچر تھا' اور روٹی فروخت کرنے والے سے ترقی کرتے ہوئے وزیر کے عہدے تک جا پہنچا تھا' وہ اپنی عقل مندی اور تجربہ سے سمجھتا کہ اسے نواب کے ہاں کیوں حاضری کے لئے بلایا جارہا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ نواب مکمل طور پر اس جانشین اور مقامی ایجنٹ کے اثر میں ہے۔ لہٰذا وہ نواب کے پاس آنے کے بجائے مسٹر لس ڈین کے پاس چلا گیا اور اس سے کہا کہ وہ ایک برطانوی شہری ہے۔ اسے سابق وزیر نے اس بہانہ کے ساتھ نواب کے دربار میں بلایا ہے۔ تاکہ وہ حساب کتاب کی جواب دہی

کرے۔ لیکن اس دل یہ کہتا ہے کہ ایک جال ہے کہ جو اس کے دشمنوں نے اسے پھانسنے کے لئے پھیلایا ہے۔ جہاں تک نواب کا تعلق ہے تو وہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں محض کھلونہ ہے۔ مسٹر لس ڈین نے اسے مقامی ایجنٹ سے ملنے کے لئے کہا اور ساتھ ہی میں یہ یقین دلایا کہ نواب صاحب اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ سابق وزیر ایک سمجھدار شخص تھا' لہٰذا اس نے مناسب نہیں سمجھا کہ برطانوی نمائندے کی کسی بات کو رد کرے یا اس سے بحث کرے' اس لئے اس کو مطمئن کرنے کی خاطر اس نے خاموشی سے اسے آداب کیا اور وہاں سے چلا آیا۔

دوسری صبح وہ مقامی ایجنٹ کے دربار میں گیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ اس سے تنہائی میں کچھ کہنا چاہتا ہے۔ جب دوسرے لوگ وہاں سے چلے گئے' تو سابق وزیر نے یہی بہتر سمجھا کہ وہ مقامی ایجنٹ سے معافی مانگ لے۔ اس لئے اس نے اپنی پگڑی اتار کر اس کے قدموں پر رکھ دی' قدرت کے یہ عجیب اتفاقات ہیں کہ یہ اس شخص سے معافی کا خواست گار تھا کہ جس کی وہ کچھ مہینے پہلے بے عزتی کرتا تھا۔ پگڑی رکھنے کے بعد اس نے بڑی عاجزی سے کہا کہ : "میں نے اپنے آقا کی پندرہ سال تک وفاداری کے ساتھ خدمت کی' اور اسے قرض کی مصیبتوں سے نجات دلائی۔ اس کے تمام معاملات کو اس کی مرضی کے مطابق چلایا اور ایک مرتبہ سے زیادہ میرا ذکر اس خط و کتابت میں ہے کہ جو نواب صاحب اور برطانوی حکومت میں ہوئی۔ میری اس وفاداری اور اطاعت گزاری کے نتیجہ میں' میں نے دولت و جائیداد حاصل کی۔ لیکن اب سازشوں کی وجہ سے میں اپنے آقا کے دربار میں شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جارہا ہوں۔ وہ میرے خلاف گٹھ جوڑ کر کے میری تباہی کے پیچھے ہیں۔ مجھے اس کا کوئی ڈر نہیں کہ مجھ سے روپیہ پیسے کا حساب کتاب لیا جائے کیونکہ میں نے جو بھی اخراجات کئے ہیں وہ نواب صاحب سے پوچھ کر کئے ہیں اور کاغذات پر ان کے دستخط ہیں۔ اس لئے اس غلط فہمی میں آپ سے معافی کا خواست گار ہوں کہ جو آپ اور آپ کے مرحوم بھائی اور میرے درمیان بلاوجہ پیدا ہوئی۔ میں قسم کھا کر یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اس غلطی کی پوری پوری تلافی کروں گا۔" یہ کہہ کر وہ اس کے سامنے جھک گیا۔ مقامی ایجنٹ یہ سب کچھ بڑے غور سے سنا' پھر اپنے مہمان کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور اپنے برابر بٹھایا' ان نے اسے پوری طرح سے اطمینان دلایا ایسے ہی جیسے کہ ایک سیاستدان میٹھی زبان استعمال کر کے کرتا ہے اور اس نے کہا کہ اسے اس بارے میں کچھ پتہ نہیں کہ اس کے اور اس کے مرحوم بھائی کے درمیان کیا ہوا تھا اور وہ بڑی خوشی سے اس

کو معاف کرنے پر تیار ہے۔

دوسری صبح مجھے اور موجودہ وزیر کو کہا گیا ہم مقامی ایجنٹ کے پاس جاکر اس سے ہدایات لیں۔ جب ہم اس کے ہاں پہنچے تو اس نے ان تمام لوگوں کو جو وہاں موجود تھے وہاں سے ہٹا دیا تاکہ ہم سے تنہائی میں بات کرے۔ اس کے بعد اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مجھ سے مخاطب ہوکر کہا کہ "نواب ایک ناشکرا آدمی ہے' میں نے اس کے ساتھ ہمیشہ مہربانی کا سلوک کیا' اور اس کی بہت سی غلطیوں پر پردہ ڈالا۔ لیکن اس نے ہمیشہ نچلے و رذیل کمینے لوگوں کا ساتھ دیا' جس کی ایک مثال یہ خبیث ہے جو آپ کے قریب سونے کا ہار پہنے بیٹھا ہے۔ (اس کا مطلب وزیر کی طرف تھا کہ جس کو انگریزی کا ایک لفظ بھی نہیں آتا تھا) میں نے اسے انگریزی میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ چونکہ میں نواب کا نیا ملازم ہوں اس لئے مجھے اس کی عادات و اطوار کے بارے میں کچھ زیادہ علم نہیں ہے۔ لیکن میں ایک بات ضرور جانتا ہوں اور وہ یہ کہ جو نیک کام کرے گا' اسے ایک نہ ایک دن اس کا صلہ ضرور ملے گا۔ اس کے بعد اس نے مہذب طریقہ سے وزیر سے ہندوستانی میں کہا: آپ نواب سے کہئے کہ اس کے مخالف نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں' میں نے اس سے کہا ہے کہ وہ نواب صاحب کی خدمت حاضر ہوکر معافی کا خواستگار ہو۔ اب یہ ان کی مرضی ہے کہ جو چاہیں ان کے ساتھ سلوک کریں لیکن میری خواہش ہے کہ اس کے ساتھ برا سلوک نہیں کیا جائے۔" اس کے بعد وہ مڑا اور مجھ سے مخاطب ہوکر کہنے لگا کہ' مسئلہ صرف یہ ہے کہ ہمیں اس سے حساب کتاب لینا ہے اور دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس نے اخراجات ٹھیک کرئے ہیں یا نہیں۔ اس کے بعد ہم نے اس سے مختلف موضوعات پر بات چیت کی اور پھر رخصت ہوکر محل میں آئے کہ جہاں نواب کو اپنے مشن کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔

جس وقت کے یہ معاملات ہو رہے تھے' میں ایک صدمہ سے دوچار ہوا وہ یہ کہ میرا لڑکا دو سال کی عمر میں مجھے داغ مفارقت دے گیا۔ افسوس ہے کہ اس غریب بچے نے اس کمسنی میں بخار اور کھانسی کی تکلیف کو برداشت کیا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ یہ سب اس نے بالغ مرد کی طرح برداشت کیا۔ اس نے صبر و شکر کے ساتھ دوا پی مگر افسوس کہ اس کا اس کی صحت پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اگرچہ غم کے نشتر نے میرے دل کو چھید دیا' مگر میرے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ میں صبر کروں' کیونکہ جو کچھ ہوا یہ سب خدا کے حکم سے ہوا اور اس کے حکم میں دخل دینا بندے کا حق نہیں۔

اس صدمہ کے بعد دس دن تک میں اکیلا رہا۔ اس کے بعد مجھے حکم دیا گیا کہ میں دد

آدمیوں کو ساتھ لے کر جاؤں اور سابق وزیر سے حساب کتاب لوں۔ مجھے کہا گیا تھا کہ میں اس کے ساتھ سختی ضرور کروں مگر بدتمیزی نہیں اور یہ کہ میں کسی نہ کسی طرح اس شخص کو بدعنوانی میں ملوث کروں۔ جب میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس کے پاس گیا تو وہ بیٹھا ہمارا انتظار کررہا تھا۔ میں نے دس دن تک اس سے حساب کتاب کے سلسلہ میں سوالات پوچھے اور اس نے ہر سوال کا تشفی بخش جواب دیا۔ اس نے جو بھی خرچ کیا تھا اس کی رسید پر نواب کے دستخط موجود تھے۔ کبھی کبھی موجودہ وزیر نے بھی اس تفتیش میں حصہ لیا۔ ہم نے ان تاجروں کے رجسٹروں سے بھی اس رقم کا مقابلہ کیا کہ جو انہیں دی گئیں تھیں، لیکن اس میں بھی کسی قسم کی بدعنوانی نہیں پائی گئی۔ اس پر میں نے وزیر سے کہا کہ جہاں تک بدعنوانی کا تعلق ہے، تو یہ شخص اس میں ملوث نہیں ہے۔ اگر وہ اسے کسی نہ کسی طریقہ سے سزا دینا ہی چاہتا ہے تو بہتر یہ ہے کہ وہ اور کوئی دوسری ترکیب آزمائے۔ اس پر اس نے مجھ سے کہا کہ "کیا تم رجسٹر میں کوئی ردوبدل نہیں کرسکتے؟"

اس پر میں نے اسے جواب دیا کہ میرے لئے میرا ضمیر نواب صاحب کی ملازمت سے زیادہ قیمتی ہے۔ میں اس قسم کا ظالمانہ عمل کسی صورت میں کرنے پر تیار نہیں۔ "ظالمانہ بکواس" اس نے جواب دیتے ہوئے کہا "کیا تم اپنے آقا کے وفادار نہیں ہو، اور کیا ان کی خاطر تم یہ سب کچھ کرنے پر تیار نہیں ہو۔؟" میں نے جواب میں کہا کہ "مجھ سے یہ توقع مت رکھو کہ میں اپنے ضمیر کے خلاف کچھ کروں۔"

اس موقع پر ہمارے درمیان چند تلخ جملوں کا تبادلہ ہوا۔ اس کے بعد سے نواب صاحب کا رویہ میری جانب سے معاندانہ ہوگیا، اگر میرے نزدیک اس کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اس دوران جب میں تفتیش کے لئے گیا تو اس وقت میری تعجب کی انتہا نہیں رہی کہ جب میرے نائب موتی رام نے میری بات کاٹنا شروع کردی اور میرے بجائے اس نے سابق وزیر سے بڑے رعب و بدتمیزی سے سوالات پوچھنا شروع کردیئے۔ اس نے بلاوجہ اس سے جھگڑنا شروع کردیا۔ یہاں تک کہ اس کی گفتگو میں گھٹیا پن آگیا۔ وہ کہنے لگا کہ وہ رسیدوں پر نواب صاحب کے دستخطوں کو اصلی نہیں مانتا ہے، اس کا خیال ہے کہ یہ دستخط اس وقت لئے گئے کہ جس وقت نواب صاحب یا تو نشہ میں تھے یا نیند کی حالت میں۔ میرے نائب نے جس انداز میں تفتیش کی اسے نواب اور وزیر نے بہت سراہا۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ نواب نے مجھے ایک ایسے کام کے لئے استعمال کرنا چاہا تھا کہ جس کا میں

اہل نہ تھا۔

یہ دیکھ کر میں نے وزیر سے کہا اس تفتیش میں میرا حصہ لینا بیکار ہے. کیونکہ موتی رام اس کام کو مجھ سے بہتر طریقہ سے سرانجام دے رہا ہے۔ میں اس سے بھی بے خبر نہیں ہوں کہ پچھلے کچھ دنوں سے نواب صاحب کا رویہ میری طرف سے بدل گیا ہے اور آپ خود بھی اب اکھڑے اکھڑے رہنے لگے ہیں۔ لہٰذا اگر یہ اسی طرح سے رہا تو میں اگلے ہفتہ استعفیٰ دے دوں گا۔

میری گفتگو کو اس نے بڑی خاموشی سے سنا اور اس پورے عرصہ میں کچھ نہیں بولا۔ بعد میں مجھے بتایا گیا کہ میرے رخصت ہونے کے بعد وہ فوراً نواب صاحب سے ملا اور انہیں پوری صورت حال سے آگاہ کیا۔ نواب نے اسے ہدایت کی کہ وہ مقامی ایجنٹ سے ملے۔ جب میں نے دیکھا کہ ایک ہفتہ تک صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تو میں سات مہینے دس دن کی ملازمت کے بعد نواب صاحب کو اپنا استعفیٰ بھیج دیا۔ پھر میں سیدھا برٹش ایجنٹ کے پاس گیا. جس کو اس معاملہ کی پوری تفصیلات بتائیں اور کہا کہ اب استعفیٰ کے بعد میں دوبارہ سے برطانوی رعایا ہوگیا ہوں۔ مسٹر لسن ڈین نے اس پر کہا کہ نواب صاحب کی ملازمت کو اس طرح سے چھوڑ دینا غلطی ہے۔ کیونکہ نواب کے تمام مصاحب انتہائی بدعنوان' بدمعاش اور غنڈے ہیں اور یہ یقیناً اسے تباہ و برباد کردیں گے۔

میں نے اسے جواب دیا کہ میں اس سلسلہ میں نواب کی کوئی مدد نہیں کرسکتا تھا اور میں نہیں چاہتا کہ بلاوجہ میں اپنی اور اپنے خاندان کی زندگی خطرے میں ڈالوں۔ یہ کہہ کر میں اس سے رخصت ہوا' اور نیچے آکر مقامی ایجنٹ سے ملنے چلا گیا جو مجھ سے بڑی گرمجوشی سے ملا۔ اس نے کہا کہ وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتا ہے کہ میں کیوں انگریز ایجنٹ سے ملا۔ اور یہ اچھا ہوا کہ میں نے نواب کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ یہ بوڑھا شخص اس نے کہا نچلے' کمینہ اور بدتمیز لوگوں کی سرپرستی کر رہا ہے اور قابل و باصلاحیت لوگوں کو اپنے سے دور کررہا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ اس طرح سے وہ مجھے اکسا رہا ہے کہ میں نواب کے خلاف بولوں' مگر میں نے اس کو بڑا شستہ اور مختصر جواب دیا کہ ملازمت اور زندگی دونوں خطرات سے پر ہوتی ہیں' ان میں سے کسی کے بارے میں پتہ نہیں ہوتا ہے کہ ان کی قسمت میں کیا ہے۔ اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ میں نے استعفیٰ دے کر صحیح کیا یا غلط۔ یہ کہہ کر میں اس سے رخصت ہوا اور سیدھا گھر چلا آیا۔

میرے استعفیٰ کے بعد نواب صاحب نے مجھے کئی پیغامات بھیجے اور درخواست کی کہ میں اپنا استعفیٰ واپس لے لوں۔ اس نے کچھ عرصہ ان دو ملازموں کو میرے گھر پر رہنے دیا کہ جو ملازمت کے دوران مجھے ملے تھے، مگر جب اس نے دیکھا کہ میں اپنا فیصلہ بدلنے پر تیار نہیں ہوں تو مجبوراً ان ملازموں کو واپس بلا لیا گیا، اسی دوران، میں نے دوبارہ سے انگریزوں کو پڑھانے کا اپنا پیشہ اختیار کرلیا۔ اور مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ اس پیشہ میں، میں نواب کی ملازمت کے مقابلہ میں زیادہ خوش رہا۔

نواں باب

نواب کی ملازمت سے میں نے فروری میں استعفیٰ دیا تھا۔ ابھی مجھے اپنے شاگردوں کو پڑھاتے ہوئے اٹھارہ دن ہی ہوئے تھے کہ سورت ضلع کے کلکٹر مسٹر ویبرٹ کی معرفت مجھے کاٹھیا واڑ کے پولیٹکل ایجنٹ جے ارسکن کا دعوت نامہ ملا۔ لہٰذا ان کی دعوت پر میں راجکوٹ روانہ ہوگیا اور مارچ کے مہینہ میں پولٹیکل ایجنٹ سے ملا۔ راجکوٹ میں تھوڑے دن رہنے کے بعد مجھے بابریا واڑ کے ہمسایہ میں ایک سو روپیہ ماہوار تنخواہ پر سپرنٹنڈنٹ لگا دیا گیا۔ لیکن ہوا یہ کہ مجھے اپنے عہدے کا چارج لینے ہی نہیں دیا گیا اور اس کے بجائے مجھے پولٹیکل ایجنٹ کے آفس میں چند مقامی عہدیداروں کی بدعنوانیوں کی تحقیق پر لگا دیا گیا۔ یہ ملزم ناگر برہمن تھے۔ انہوں نے اپنا مقدمہ اس قدر عمدگی سے لڑا کہ سارا الزام ان کے بجائے ان لوگوں پر آگیا کہ جنہوں نے انہیں بدعنوانی میں ملوث کرنے کی کوشش کی تھی۔ کاٹھیا واڑ کی صورت حال مجھے اپنے لائق نظر نہیں آئی۔ اس لئے میں موقع کی تلاش میں رہا کہ کب اس سے چھٹکارا پاؤں۔

میں اس پریشانی میں تھا کہ مجھے یہ خوش خبری ملی کہ میرا عزیز آقا کیپٹن ایسٹ وک انگلستان سے واپس آگیا ہے۔ اتفاق سے اس کی رجمنٹ اس وقت یہیں پر تھی۔ اس لئے جیسے ہی وہ آیا مجھے یہ موقع مل گیا کہ اس سے ملاقات کروں۔ اس سے ملنے پر میں نے اسے اسی طرح سے دوست و مہربان پایا۔

وہ چند ہفتہ اپنی رجمنٹ کے ساتھ رہا' پھر اس کی خدمات گورنر جنرل کے حوالہ کردی گئیں۔ جہاں سے اسے حکم ملا کہ وہ سندھ میں جاکر سر ایچ پوٹنگر کی ماتحتی میں بطور اسسٹنٹ ریذیڈنٹ کام کرلے۔ جہاں تک پوٹنگر کے بارے میں میری معلومات ہیں وہ انتہائی سمجھدار شخص ہیں' یہ کہنا مناسب ہوگا کہ سلیمان کی طرح دانش مند اور سکندر کی طرح مہم جو ہیں۔

میں نے جب مسٹر ایسٹ وک کے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا تو اپنا استعفیٰ مسٹر ارسکن کی خدمت میں پیش کردیا۔ ان کی جانب سے مجھے یہ مندرجہ ذیل سرٹیفکیٹ دیا گیا:

آفس پولٹیکل ایجنٹ راجکوٹ۔ کاٹھیا واڑ۔
یکم جولائی 1838ء

اس کی تصدیق کی جاتی ہے کہ میں منشی لطف اللہ کو کئی سال سے جانتا ہوں۔ 1936ء کی ابتداء سے لے کر اب تک اس نے آنریبل ایسٹ کمپنی کی ملازمت کرتے ہوئے مختلف فرائض سرانجام دیئے۔ ان میں خصوصیت سے مشرقی زبانوں کے مترجم کی حیثیت سے اس کی خدمات قابل فخر ہیں۔

اس کو ہندوستانی، فارسی، مرہٹی اور گجراتی زبانوں پر عبور ہے۔ اس کے علاوہ یہ انگریزی زبان کی گرامر، ضرب الامثال اور اس کی خوبیوں سے بخوبی واقف ہے۔ میری معلومات کی بنا پر انگریزی زبان کی یہ صلاحیت اب تک کسی ہندوستانی نے حاصل نہیں کی ہے۔ مشرقی زبانوں کی تعلیم کے سلسلہ میں اس نے جو خدمات سرانجام دی ہیں وہ قابل تعریف ہیں۔ یہ یورپی عادات و خصلتوں سے بخوبی واقف ہے اور ساتھ ہی میں مقامی لوگوں کی پسماندگی سے نفرت کرتا ہے، اس لئے یہ برطانوی حکومت کے لئے انتہائی اہم شخصیت ہے۔

میں اس کی تصدیق کرتا ہوں کہ یہ ایماندار، سچا اور قابل شخص ہے۔ میں سچائی کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان خوبیوں کے کسی مشرقی شخص سے میں آج تک نہیں ملا ہوں۔

یہ سند میں منشی لطف اللہ کو اس کے کردار، اخلاق اور محنت و ایمانداری کو مدنظر رکھتے ہوئے دے رہا ہوں۔ کیونکہ ان خوبیوں کا میں ذاتی طور پر گواہ ہوں۔

جیمس ارسکن (دستخط)
پولٹیکل ایجنٹ کاٹھیا واڑ۔

بروز جمعہ 23 نومبر کو میں پولٹیکل ایجنٹ کے آفس میں گیا تاکہ دوستوں سے رخصت ہو سکوں۔ وہاں کے تمام لوگوں نے میرے جانے پر بے انتہا افسوس کا اظہار کیا۔ ہم نے ایک دوسرے سے جدا ہونے پر آنسو بہائے۔ میرے آفس کے تمام دوستوں نے مل کر چندہ جمع کیا اور رخصت ہوتے وقت بطور یادگاہ مجھے خلعت دیا۔ مسٹر ارسکن نے اپنی جانب سے ایک کشمیری شال بطور تحفہ دیا۔ ڈاکٹر گراہم نے دواؤں کا ایک صندوقچہ دیا۔

جب تحفہ تحائف سے لدا ہوا اور دوستوں کی دعاؤں کے ساتھ میں گھر آیا ہوں تو ایک طرف تو میں اس بات پر خوش تھا کہ میرے سامنے نئے مواقع ہیں۔ مگر دوسری طرف میں اپنے دوستوں کی جدائی سے غم زدہ بھی تھا کہ جن کے ساتھ میں تین سال کا طویل عرصہ گزارا تھا۔

میں گھر آیا تو میں نے دیکھا کہ پرشوتم ٹکرسی، کہ اس نام سے راجکوٹ میں ایک فرم تھی، وہ میرا انتظار کر رہا ہے۔ جب میں نے اس کے آنے کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ وہ اور اس کا خاندان کہ جس کی تعداد پینسٹھ کے قریب ہے، وہ سب میرے احسان مند ہیں کیونکہ میں نے ان کی دس ہزار کی ملکیت کو واپس لایا جو کہ ڈاکوؤں کا ایک گروہ لے گیا تھا اور جنہوں نے ان کے خاندان کے تین آدمیوں کو قتل کر ڈالا تھا۔ انہیں میرے جانے کا انتہائی افسوس ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ وہ مجھے بغیر تحفہ کے قبول کئے جانے نہیں دیں گے۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے تھیلے سے دو سو روپیہ نکالے اور مجھ سے عاجزانہ طور پر درخواست کی کہ میں انہیں قبول کرلوں۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا کہ وہ میرے بارے میں اچھے خیالات رکھتا ہے، مگر یہ کہ مجھے اس کے الفاظ سکوں سے زیادہ عزیز ہیں۔ یہ کہہ کر میں نے اسے جانے کی رخصت دے دی۔ میرا خیال ہے کہ اس نے یہ سوچا ہوگا کہ تحفہ میں دی جانے والی رقم کم تھی اور شاید اس لئے میں نے اسے لینے سے انکار کردیا، لہٰذا آدھ گھنٹے میں وہ دوبارہ واپس آیا اور اس مرتبہ پانچ سو روپیہ کی مالیت کا ایک سونے کا ہار لایا اور مجھ سے درخواست کی کہ میں اسے ضرور قبول کرلوں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچاؤں۔ اس لئے میں نے اس سے وہ ہار لیا اور اس سے پوچھا کہ کیا وہ اب مطمئن ہے کہ میں نے اس کا تحفہ قبول کرلیا ہے۔ اس نے اس سوال کا جواب اثبات میں دیا اور جانے لگا۔ اس وقت میں نے وہ ہار اس کے گلے میں ڈال دیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ اسے میری طرف سے بطور تحفہ قبول کرلے۔ اس پر بوڑھے آدمی کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور کہنے لگا کہ وہ اس صورتحال سے بڑا مایوس ہوا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اس سے مٹھائی قبول کرنے پر تیار ہوں تاکہ تم بھی خوش ہو جاؤ اور میں یہاں سے سندھ جاتے ہوئے راستہ میں تمہیں یاد کرتا جاؤں۔

شام کو مجھ سے تین اشخاص ملاقات کرنے آئے۔ یہ ایک بوڑھی خاتون اور اس کی دو بیٹیاں تھیں۔ ان میں سے بڑی لڑکی تو اپنی دلکشی کھو چکی تھی، مگر چھوٹی والی کہ جس کا نام سارا تھا، انتہائی خوبصورت تھی، اگرچہ اس کی رنگت تو گندمی تھی مگر اس کا ناک، نقشہ اس قدر دلکش تھا کہ محسوس ہوتا تھا کہ قدرت اسے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ ان تینوں کی حالت انتہائی غریبانہ تھی۔ انہوں نے مجھ سے درخواست کی کہ وہ جوڑیا تک میرے ساتھ جانا چاہتی ہیں۔ میں نے نہ صرف ان کی درخواست قبول کرلی بلکہ اپنے ملازموں کو حکم دیا

کہ ان کا سامان میری گاڑی میں رکھ دیں۔ میری اس مہربانی پر انہوں نے شکریہ ادا کیا۔
اس کے بعد بوڑھی خاتون نے اس طرح سے اپنی کہانی سنائی:
"ہم مسلمان کاشتکار ہیں کہ جن کا تعلق میمن برادری سے ہے جو کہ بھوج میں آباد ہے۔ میرا شوہر اس علاقہ کے مالدار کسانوں میں سے تھا۔ ہماری شادی کے بعد یہ دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ ہمارے کوئی لڑکا نہیں ہوا۔ میری چھوٹی لڑکی کی عمر جس وقت دو سال کی تھی کہ میرا شوہر وفات پا گیا۔ اس کی وفات پر حکومت نے اس کی تمام جائیداد پر قبضہ کرلیا اور بہانہ یہ کیا کہ وہ حکومت کا مقروض تھا۔ میرے شوہر کی وفات کے کچھ مہینہ بعد ہی میرا داماد بھی انتقال کرگیا اور اس طرح سے ہم اکیلے و تنہا رہ گئے۔ ہمارے پاس کوئی جائے پناہ نہ تھی اور نہ گزارے کے لئے کوئی روپیہ پیسہ۔ اس حالت میں کچھ عرصہ ہم نے دوسروں کے کھیتوں میں کام کرکے بسر اوقات کی۔ اس عرصہ میں میری بڑی لڑکی کو ایک انگریز نے ورغلایا اور اسے بھگا کر لے گیا جس کی وجہ سے ہماری حالت پہلے سے بھی زیادہ خراب ہوگئی۔ ہمیں ایک عرصہ تک اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلا۔ مگر پچھلے دنوں ہی اس نے ہمیں خط لکھا اور بتایا کہ اس کا محبوب اچانک ہیضہ کی بیماری سے انتقال کرگیا اور اس کے لئے کچھ بھی نہیں چھوڑا کہ جس پر وہ گزر اوقات کرسکے۔ اس کے پاس صرف تین یا چار سو روپیہ قیمت کے زیورات تھے جس کو فروخت کرکے ہم نے کچھ دن گزارے۔ اب بھی ہمارے پاس یہ تھوڑی سی رقم باقی ہے۔ اور ہم چاہتے ہیں اس کو کہیں زراعت میں لگائیں تاکہ روزی کا بندوبست ہوسکے۔

چھوٹی لڑکی سارا کی قسمت دوسری سے بھی زیادہ خراب ہے۔ میں اس کی شادی ڈرانگرا کے ایک نوجوان مالی سے کردی تھی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ تقریباً دو سال رہی ہوگی کہ اس کی بھی وفات ہوگئی۔ اس کے بعد وہ کچھ عرصہ اپنی نند کے پاس رہی، جس نے اسے اس لئے منحوس سمجھا کہ اس کا شوہر شادی کے بعد انتقال کرگیا۔ اس کی نند نے اس کے ساتھ انتہائی برا سلوک کیا۔ یہاں تک کہ اسے خفیہ طور پر لمری کے ایک بوڑھے مالی کے ہاتھوں پچیس روپیہ میں بیچ دیا۔ جب مجھے اس بارے میں پتہ چلا تو میں اس جگہ گئی اور اس کو خفیہ طور پر پیغام بھجوایا کہ وہ بھاگ کر میرے پاس آجائے۔ ابھی چھ ہفتے ہوئے ہوں گے کہ یہ میرے پاس آئی ہے۔ وہ مالی کہ جو اس کا غیر قانونی طور پر مالک بنا ہوا ہے وہ بھی اپنے چند غنڈوں کے ساتھ یہاں ہے اور موقع کی تلاش میں ہے کہ اسے زبردستی اپنے ساتھ لے جائے۔ اس لئے جب ہم نے یہ سنا کہ آپ جوڑیا بندر جارہے ہیں۔ تو ہم نے

آپ کی حفاظت میں آنے کا سوچا تاکہ وہاں تک بغیر کسی ڈر اور خوف کے سفر کر سکیں۔ ہم اپنی پہلی فرصت میں اپنے وطن واپس چلے جائیں گے اور آپ کی اس حفاظت کے عوض ہمیشہ آپ کے لئے دعاگو رہیں گے۔"

جب وہ اپنی دکھ بھری کہانی سنا چکیں تو میں نے اس سے کہا کہ اب وہ اور اس کی دونوں لڑکیاں خود کو میری حفاظت میں سمجھیں کیونکہ میں ایک برطانوی رعایا ہوں اس لئے ان کو چھیڑنے کی کسی کو ہمت نہیں ہوگی۔ انہیں حفاظت کے ساتھ نہ صرف جوڑیا پہنچا دیا جائے گا (مگر وہاں بھی مقامی ریاستوں کی جوڑتوڑ کی سازش میں وہ شاید محفوظ نہ ہوں) بلکہ ان کو وطن تک لے جایا جائے گا اور اس کے کوئی اخراجات نہیں لئے جائیں گے۔

ان لوگوں نے یہ سن کر دل سے میرا شکریہ ادا کیا اور صبح صبح وہ میرے ساتھ سفر پر روانہ ہو گئیں۔

24 نومبر 1837ء میں، میں نے راجکوٹ چھوڑا اور نو بجے کے قریب میں پر دھاری پہنچ گیا کہ جو گیارہ میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہاں پر میرا استقبال زمیندار کے آدمیوں نے کیا۔ پردھاری اگرچہ چھوٹا سا قصبہ ہے مگر یہ ان گیارہ گاؤں سے تعلق رکھتا ہے جو جام نوانگر کی ملکیت میں سے ہے۔

ہزہائی نس جام اگرچہ ان پڑھ ہے، مگر ایک عالی دماغ شہزادہ ہے۔ اس کا نام "رن مل جی" یعنی "میدان جنگ کا سورما" ہے یہ خطاب اس کے کردار سے میل کھاتا ہے۔ جب میں پولٹیکل ایجنٹ کے ہاں کام کرتا تھا تو کئی بار جام سے ملاقات ہوئی تھی اور اس سے برطانوی سرحدوں کے تعین اور اس علاقہ میں بچوں کو مار ڈالنے کے موضوعات پر گفتگو رہی تھی۔ میں ہمیشہ اس کے انداز، سوچ اور عقلمندانہ گفتگو سے متاثر رہا تھا۔ اگرچہ وہ جاریجہ قبیلہ سے تھا مگر اس نے اپنی لڑکی کو مارا نہیں تھا بلکہ اس کی پرورش کر رہا تھا۔

25 تاریخ کو میں پردھاری سے روانہ ہو کر دھرال پہنچا جو کہ جاریجہ قبیلہ کے بھوپت سنگھ جی کی ملکیت میں تھا۔ یہاں پر بھی میرا استقبال گرم جوشی سے ہوا۔ قبیلہ کا سردار بذات خود مجھ سے ملنے کے لئے شہر سے باہر میرے کیمپ میں آیا۔ اس کے ساتھ اس کا ہونہار لڑکا، چھ سال کی خوبصورت بیٹی، اس کا ایک مہمان جو امران کا چیف تھا، اور دوسرے لوگ تھے۔ وہ میرے ساتھ تین گھنٹے رہا اور اس دوران اس نے روس کے ساتھ ہونے والی جنگ کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی۔ جب میں نے اسے روسی امپائر کے بارے میں بتایا تو یہ اس نے بڑی دلچسپی کے ساتھ سنا۔ میں نے کوشش کی کہ میں اسے روسی رسم و رواج،

اور ان کی عادتوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ بتا سکوں۔

26 تاریخ کی صبح کو میں دھرول چھوڑ دیا۔ یہ ایک کہرآلود صبح تھی۔ ساڑھے آٹھ بجے ہم جوڑیا پہنچ گئے جوکہ ایک بڑا اور آباد شہر ہے۔ یہاں پر میرا استقبال اس قدر شاندار طریقہ سے ہوا کہ جس کی توقع میں کاٹھیا واڑ میں نہیں کرسکتا تھا۔ یہاں کے گورنر احمد خواص نے کمال مہربانی سے میرے استقبال کے لئے اپنے خاص آدمی بھیجے۔ وہ مجھے ایک آرام دہ جگہ لے گئے کہ جہاں میں نے رہائش اختیار کی۔ یہاں پر میرے اور میرے ساتھیوں کے لئے لذیذ ناشتہ تیار کیا گیا۔ اس کے لئے میں نے اور سب نے مل کر اپنے میزبان کا شکریہ ادا کیا۔ اگرچہ اس کا خطاب خواص ہے۔ جس کا کاٹھیاواڑ میں مطلب غلام ہے، مگر درحقیقت وہ شہزادوں اور آقاؤں سے زیادہ عمدہ عادات رکھتا ہے۔

27 تاریخ کو، میں نے یہیں قیام کیا کیونکہ مجھے اپنے دوستوں اور گھر والوں کو خطوط لکھنے تھے۔ یہ میرے سفر کی آخری اسٹیج تھی اور یہاں سے میرے خطوط کے گم ہونے کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ میں نے اپنے گیکواڑ کے گھڑسواروں کو جو یہاں تک میری حفاظت کے لئے آئے تھے واپس کردیا۔ اس کے بعد میں بندرگاہ پر گیا کہ جو یہاں سے دو میل کے فاصلہ پر تھی۔ میں چاہتا تھا کہ میں سندھ کے سفر کے لئے مناسب کشتی کا بندوبست کروں۔ بندرگاہ کی حالت انتہائی خراب تھی۔ یہاں پر میں نے ایک کشتی کا انتخاب کیا جوکہ میرے لئے مناسب تھی۔

چھ بجے میں نے گورنر کے ساتھ کھانا کھایا۔ میرے بے فکر میزبان نے کھانے سے ایک گھنٹہ پہلے برانڈی سے شوق شروع کردیا تھا۔ اس نے مجھے بھی اس شغل میں شریک ہونے کو کہا مگر میں نے ادب کے ساتھ معذرت کرلی۔ شراب پینے کی وجہ سے وہ ڈنر تک سرور کی حالت میں آچکا تھا۔ ہماری شام بڑے مزے سے گزری۔ کھانے کے بعد اس نے مجھے دو شاندار محلات دکھائے کہ اس کی حکومت کی ملکیت تھے۔ اگرچہ ان میں اچھا فرنیچر تو نہیں تھا مگر ان کا طرز تعمیر بہت خوبصورت تھا۔ میرے رخصت ہونے پر اس نے مجھے اپنے آقا کی جانب سے خلعت دیا کہ جس میں ایک خوبصورت رومال اور پگڑی تھی۔ جس کی قیمت اندازاً سو روپیہ ہوگی۔ میں نے اس تحفہ کو قبول کرنے سے انکار کیا، لیکن اس نے شدید اصرار کرکے مجبور کیا کہ میں اسے قبول کرلوں۔ اس نے کہا کہ میرے آنے سے چھ دن قبل ہزہائی نس کا یہ حکم آیا تھا کہ میں یہ خلعت آپ کی خدمت میں پیش کروں، اگر آپ نے انکار کیا تو اس سے ہزہائی نس ناراض ہو جائیں گے۔ مختصراً یہ کہ میں بوڑھے شخص کے

دباؤ میں اس قدر آیا کہ اس تحفہ کو قبول کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہا۔

یہ دیکھتے ہوئے کہ وہ چائے کا بڑا شوقین ہے' میں نے اس کو اپنی چائے کا آدھا حصہ' ایک مقامی طور پر بنی ہوئی گھوڑے کی زین کہ جس کی اس نے تعریف کی تھی اور جس کی اب مجھے اس لئے ضرورت نہ تھی کہ میں نے گھوڑا فروخت کردیا تھا' یہ اس کو بطور تحفہ دے دیں۔

28 تاریخ کو گیارہ بجے میں جوڑیا سے بندرگاہ کے لئے روانہ ہوا۔ گورنر مجھے رخصت کرنے کے لئے میرے ساتھ آیا تاکہ وہ اطمینان کرسکے کہ میں معہ سامان کے حفاظت سے کشتی پر سوار ہوگیا ہوں۔ وہاں میری ملاقات ایک یورپی پادری سے ہوئی جوکہ بھوج سے آیا تھا۔ اس سے راجکوٹ کے سفر کے بارے میں بات چیت ہوئی۔ میرے لوگوں نے کہا کہ ایک مسافر کے لئے سفر کے شروع میں کسی پادری کو دیکھنا نیک شگون نہیں ہے اور میرے معاملہ میں ہوا بھی یہی۔ جس کشتی میں میرا سامان تھا وہ سمندر میں چڑھاؤ کی وجہ سے لہروں کے ساتھ ساحل سے دور چلی گئی۔ اس کی واپسی کے لئے ہمیں رات کو نو بجے تک انتظار کرنا پڑا۔ اس دوران میں تے اپنے دوست گورنر کو رخصت کیا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرے ساتھ اس پریشانی میں مزید شریک ہو۔ رخصت کے وقت ہم نے ایک دوسرے کے لئے نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔ بالاخر میں رات کو کشتی پر سوار ہوا اور جاہلوں' افیم کھانے والوں اور بچوں کو مار ڈالنے والوں کی زمین سے رخصت ہوا کہ جس کی دس لاکھ چھ سو ہزار آبادی میں سے دو سو چوالیس سردار تھے۔ اس کی مثال ایسی تھی کہ جیسے ایک اسکاٹ لینڈ کے کاشتکار نے کہا تھا:

الوداع میرے دوستو! الوداع میرے دشمنو!
پہلے والوں سے محبت' دوسروں سے امن

جب ہماری کشتی نے ساحل چھوڑا ہے تو رات اور دن خاموش اور سکون سے گزر گئے۔ ہوا میں تازگی اور ٹھنڈک تھی۔ کشتی بغیر ہچکولوں کے رواں دواں تھی۔ اس ماحول نے مجھے ایک نئی توانائی کا احساس دیا۔ میری بھوک بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ کشتی پر کوئی گوشت نہیں تھا اور یہ جوڑیا بھی حاصل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ گورنر اپنے کھانے کے لئے خفیہ طور سے بھیڑ کو ذبح کرا لیتا تھا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی ہندو رعایا کے جذبات مجروح ہوں۔

30 تاریخ کو جب صبح میری آنکھ کھلی تو میں منڈاوی کی بندرگاہ پر تھا۔ یہاں پہنچ کر

انیس سال پہلے کا سارا منظر میری آنکھوں میں گھوم گیا۔ وہ تمام یادیں کہ جب پہلی مرتبہ میں نے یہاں کھڑے ہو کر سمندر کی لامحدود وسعت کو دیکھا تھا' اور پھر کسی طرح کتے نے خاموشی سے آکر مجھے کاٹ لیا تھا۔ مجھے ایسے محسوس ہوا کہ یہ سب کچھ جیسے کل ہی ہوا تھا۔

اسی دوران کشتی کا مالک جسکا نام جمعہ تھا اور جس کا تعلق میانی قبیلہ یا سمندر لٹیروں سے تھا' وہ میرے پاس آیا۔ اس کو دیکھ کر میں نے کہا' "جمعہ' خیر تو ہے۔ کیا بات ہے؟" غریب ملاح نے کوشش کرکے مہذب الفاظ میں کچھ کہنے کی کوشش کی۔ اس کے ان الفاظ کا ذخیرہ مشکل سے پانچ ہو گا' بہرحال اس نے اپنی دانست میں عاجزی و ادب سے کہا کہ وہ یہاں پر ایک دن قیام کرنا چاہتا ہے۔ تاکہ اسے سندھ لے جانے کے لئے کچھ سامان مل جائے۔ اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں ساحل پر چلا جاؤں ساتھ ہی میرے ملازموں سے کہا کہ وہ پانچ دن کے لئے کھانے پینے کا سامان خرید لیں۔ خاص طور سے گوشت تاکہ میں سفر میں اس سے محروم نہیں رہوں۔

میں نے اس نیک آدمی کا اس مہربانی پر شکریہ ادا کیا اور اس کی درخواست کو قبول کرلیا کہ وہ یہاں ٹھہر جائے اور اس کو اجازت دے دی کہ اگر اسے ضرورت ہو تو میرے ملازموں کی خدمات حاصل کرسکتا ہے۔ ساتھ ہی میں نے انتظام کیا کہ تینوں خواتین کو بھی ساحل تک پہنچایا جائے۔ جہاں تک میرا تعلق تھا تو میں خود کشتی پر ہی رہا کیونکہ میری ایڑھی میں زخم تھا جس کی وجہ سے میں چل نہیں سکتا تھا۔ کشتی پر میں نے اپنا وقت پڑھنے میں گزارا جبکہ میرے دوسرے ساتھی شہر چلے گئے۔

یکم دسمبر کو آدھی رات ہماری کشتی روانہ ہوئی۔ ہمارے ساتھ میں کئی جہاز بھی چلے کہ جن میں ایک انگلش رجمنٹ سوار تھی۔ خدا کی مہربانی سے تین دسمبر کو ہم نے ایک جزیرہ جو "گھوڑی کیچر" کے نام سے تھا' اس سے گزرے۔ اس دوران انتہائی خطرناک شارک مچھلیاں کہ جو سائز میں ہاتھی کے برابر ہوں گی ہماری کشتی کے قریب آئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ آپس میں چھیڑخانی کررہی ہیں' کیونکہ کبھی ایک سیدھی لیٹ جاتی تھی اور دوسری اس کے اوپر سوار ہو جاتی تھی' کبھی وہ ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ لگاتی تھیں' کبھی ہماری کشتی کے نیچے سے گزرتی تھیں جس کی وجہ سے وہ ہچکولے کھانے لگتی تھی' یہ دیکھ کر ہمیں سب کو ڈر لگنے لگا اور طبیعت گھبرانے لگی۔ یہ دیکھ کر کشتی کا کپتان ترنگ میں آگیا اور مجھ سے کہنے لگا کہ: "یہ صحیح ہے کہ یہ جانور کبھی کبھی خطرناک ہو جاتے ہیں' لیکن ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے' اندر سے یہ اتنے ہی بزدل ہیں کہ جتنا ان کا حجم ہے۔ بہرحال میں اس

کا حل نکالتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ کشتی کے ایک کونے میں آیا کہ جہاں وہ تیر رہیں تھیں۔ اس نے اس طرح سے احتجاج کرنا شروع کردیا جیسے کہ وہ اس کی زبان سمجھتی ہوں۔ "تم سمندر کی حکمران ہو' خدا اوراس کے پیغمبر حضرت سلیمان کے صدقے ہمارا پیچھا کرنا چھوڑ دو' ہم غریب لوگ ہیں' ہماری کشتی میں زیادہ مسافر نہیں ہیں' اس لئے براہ مہربانی دوسرے جہاز کی طرف جائے' وہاں آنریبل کمپنی کے سپاہی بھرے ہوئے ہیں۔" بوڑھے جمعہ کے الفاظ بجائے اس کے کہ ان کو مطمئن کرتے وہ پہلے سے زیادہ جوشیلی اور پھرتیلی ہوگئیں۔ انہوں نے اپنے نتھنوں سے پانی کی پھوار ہماری کشتی پر پھینکنی شروع کردی اور اس کے اردگرد جوش و جذبہ کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنی شروع کردی۔ یہ سلسلہ سات بجے سے سوا آٹھ بجے صبح تک جاری رہا۔ ہمارا نیک کپتان اس صورتحال کو زیادہ دیر برداشت نہیں کرسکا اور جہاز سے ایک بھاری پتھر اٹھایا کہ جو ایک طرف سے نوک دار تھا' اسے خدا کا نام لے کر پوری قوت ایک شارک کے سر پر دے مارا کہ جو ان سب میں سب سے زیادہ بڑی تھی' اس کی ضرب سے اس کے سر پر شدید چوٹ آئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی ساتھی مچھلیوں کے ساتھ پانی کے اندر چلی گئیں اور دوبارہ سطح آب پر نہیں آئیں۔ اس پر ہم سب نے خدا کا شکرہ ادا کیا کہ اس نے ہمیں موت کے منہ سے بچایا۔ مجھے اس موقع پر افسوس بھی ہوا کہ میں اپنی بندوق ساتھ میں کیوں نہیں لایا۔

گھوڑی کیچر اب ریت کا ڈھیر ہوکر رہ گئی ہے۔ آج سے بیس سال پہلے یہاں گھوڑی بندر ہوا کرتی تھی جوکہ اب ریت کے جمع ہونے کی وجہ سے غائب ہوگئی ہے۔

جب ہم گھوڑی کیچر کے ریتیلے جزیرے کی طرف چلے تو جمعہ نے مجھ سے کہا کہ میں یہاں سمندر کا پانی چکھ کر دیکھوں' میری حیرانی کی انتہا نہیں رہی کہ جب میں نے پانی پیا تو کشتی کی ایک جانب یہ انتہائی میٹھا تھا' جبکہ دوسری جانب انتہائی نمک والا۔ میرے سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ یہاں دریائے سندھ کی ایک طاقتور پانی کی لہر سمندر کے پانی کے اثر کو قبول کئے بغیر بہتی ہے۔ رات کو نو بجے کے قریب ہم وکربر پہنچے۔

یہاں ہم نے دیکھا کہ بارہ برطانوی فوجی اور دو اسٹیمر تھے۔ اس کے علاوہ کئی سو کشتیاں تھیں کہ جن پر برطانوی جھنڈا لہرا رہا تھا۔ ان میں برطانوی فوجی اور ان کا سامان بھرا ہوا تھا۔ جب ہماری کشتی ایک جہاز کے قریب سے گزری کہ جو ریت کے ٹیلے سے ٹکرا گیا تھا' تو میں نے اپنے کپتان کو تنبیہہ کی کہ وہ ذرا دور رہتے ہوئے چلے تاکہ ہم اس حادثہ سے بچ

سکیں کہ جسکا شکار یہ جہاز ہو چکا ہے۔ اس پر اس نے کہا کہ اگر کشتی ریت کے ٹیلوں سے ٹکراتی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ یا تو کپتان اندھا ہے یا اس کی نیت خراب ہے' ورنہ یہاں پر ہر ٹیلے کے بارے میں بچے بچے کو پتہ ہے۔ ہم بندرگاہ پر رات کو رکے۔

5 تاریخ کو ہم دریائے سندھ کے دھانے میں داخل ہوئے اور چھ تاریخ کو ہم وکر کے قریب سات میل کے دائرے میں پہنچے۔ اس کے بائیں جانب ایک گاؤں تھا جس کو دیکھنے کے لئے میں وہاں چلا گیا۔ یہاں میں نے گاؤں کے سردار سے ملاقات کی اور کپتان کے ذریعہ سے اس سے سندھی زبان میں بات چیت کی۔

بوڑھے نے ہمارے سوالوں کا جواب اس قدر چیخ کر دیا کہ جس سے یہ خیال ہوا کہ شاید وہ ہمیں بہرا سمجھ رہا ہے اور یا ہماری دخل اندازی پر ناراض ہے۔ جب میں نے جمعہ سے اس کا سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے بلکہ یہ اس ملک کا رواج ہے۔ ان لوگوں کی حالت انتہائی افسوسناک تھی' وہ اس قسم کی جھونپڑیوں میں رہ رہے تھے کہ جیسی ہندوستان میں کسان اپنے مویشیوں کے بناتے ہیں۔ گھر کے سارے افراد' میاں' بیوی' لڑکا' بہو یہ سب ایک ہی جگہ اور ایک ہی بستر پر سوتے ہیں۔ بستر کی حالت یہ ہے کہ گھاس پر ایک پتلی سی چادر پڑی ہوئی ہے وہی ان کے آرام کی جگہ ہے۔ گھر میں تنہائی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ان کے کھانے میں گھٹیا درجے کے چاول کی روٹی ہوتی ہے جسے وہ تازہ یا سوکھی ہوئی مچھلی سے کھاتے ہیں۔ وہ تمباکو اور پیاز کے بڑے شوقین ہیں' ان دونوں چیزوں کے لئے ان کے سردار نے ہم سے فرمائش کرڈالی۔ میں نے ان کے ملک میں ٹیکسوں کے نظام کے بارے میں دریافت کیا' اس پر اس نے کہا کہ ٹیکس جنس کی صورت میں لئے جاتے ہیں۔ چاول کی کاشت ہوتی ہے' جو بھتات کے ساتھ ہوتا ہے' اس میں سے کاشتکار کو 1/5 ملتا ہے۔ باقی میں سے دو حصے لئے جاتے ہیں' ایک حکومت کو چلا جاتا ہے اور دوسرا زمیندار لے لیتا ہے۔

سات تاریخ جب ہم وکر پر لنگرانداز ہوئے تو یہاں میرے آقا و دوست کیپٹن ایسٹ وک نے خوش دلی سے میرا خیرمقدم کیا۔

آٹھ تاریخ میں نے وکر کے گاؤں کی سیر میں گزارا۔ یہاں پر دو درجن انتہائی فلاکت زدہ جھونپڑیاں ہیں۔ شام کو یہاں کرنل پوٹنگر حیدر آباد سے آیا۔

آٹھ تاریخ کی شام کو ہم نے اپنے خیمے فوجی کیمپ سے ہٹا کر ریذیڈنٹ کے قریب لگا لئے۔ اس دن سے میں نے بڑی پابندی سے اپنے فرائض انجام دینا شروع کردیئے۔ یہاں مجھے دوبارہ سے اپنے تلسی شام کے دوست سکندر خاں سے مل کر بے انتہا خوشی ہوئی' یہ اب فوج میں صوبیدار میجر ہے۔ کسی مقامی شخص کے لئے اس سے آگے اور کوئی عہدہ نہیں ہوتا ہے۔ اس نے میرا تعارف مرزا علی اکبر سے کرایا کہ جو کیپٹن ایس پاول کا فارسی کا استاد تھا۔ یہ نوجوان مجھے ہونہار معلوم ہوا۔

میں نے یہاں سندھی گرامر کا مطالعہ شروع کردیا کہ جو مجھے آسان معلوم ہوئی۔ جس شخص کو مشرقی زبانوں کی ذرا بھی سدھ بدھ ہو' اس کے لئے سندھی زبان سیکھنا کوئی زیادہ مشکل نہیں ہے۔

14 تاریخ کو اپنے فرائض سرانجام دینے کے بعد' مجھے یہ مشکل کام سونپا گیا کہ میں حکومت کے خزانے کے صندوق جن کی تعداد ایکسو اٹھتر تھی اور جو بمبئی سے آئے تھے' ان کی گنتی کروں۔ اسی شام کو ایک افسوسناک واقعہ پیش آیا۔ ڈراگون کے ایک افسر نے خود کو گولی مار کر ہلاک کرلیا۔ خودکشی کی وجہ معلوم نہیں ہوسکی۔

15 تاریخ کو مجھے کرنل پوٹنگر سے متعارف کرایا گیا۔ میں نے پہلی ہی نظر میں ان صلاحیتوں اور کردار کی پختگی کا اندازہ لگا لیا۔

اب میں نے سندھیوں سے میل جول بڑھانا شروع کردیا اور ان کے ساتھ بات کرکے ان کی روزمرہ کی زبان سیکھنی شروع کردی۔ سندھیوں کے کردار کے مطالعہ کے دوران میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان میں سستی و کاہلی بہت ہے۔ سندھی ملاحوں کو میں نے دیکھا کہ وہ سارا سارا دن میرے خیمہ کے آگے بیٹھے ہوئے آپس میں بحث و مباحثہ کرتے رہتے یا لڑائی جھگڑے میں مصروف رہتے۔ ان کی گفتگو کا محور حکومت کے معاملات ہوا کرتا تھا۔ ان میں سے ایک جماعت کا خیال تھا کہ ان کا ملک ختم ہوگیا ہے اور جلد ہی اس پر انگریز قبضہ کرنے والے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ "تالپر' خاص طور سے میر صوبدار اس کا ذمہ دار ہے کہ اس نے ان منحوس انگریزوں سے اس قدر تعلقات کیوں بڑھا دیئے۔ وہ پورے ہندوستان پر قبضہ کرچکے ہیں' اب اس طرح سے وہ ہمارا ملک لے لیں گے۔"

اس کے جواب میں دوسری جماعت کہتی تھی کہ "تم غلطی پر ہو' حیدرآباد کے تالپروں

کو عیسائی ہو جانے دو' لیکن ہمیں اس وقت تک ڈرنے کی ضرورت نہیں جب تک کہ ہماری جانب میرپور کا شیر محمد ہے۔ ہزہائی نس میرکرم علی کی بیوہ نے اب تک اس کی مالی مدد کی ہے اور آئندہ بھی وہ اس سے گریز نہیں کرے گی اور اس کو اس قدر روپیہ و پیسہ دے گی کہ وہ انگریزوں سے مستقل طور پر طویل عرصہ تک جنگ کر سکتا ہے۔ اگر خدا کی مرضی شامل ہوئی تو یہ تمام سونا اور جنگ کا سازوسامان جو یہ اپنے ہمراہ لے کر آئے ہیں' ایک دن یہ ہمارا ہوگا۔ کیا تمہیں پتہ نہیں کہ قرآن شریف میں کیا آیا ہے؟ ایک مومن دس کافروں پر بھاری ہے۔"

ایک سندھی نے کہ جس کی داڑھی سفید ہو چکی تھی' ایک آہ بھر کے کہا "میرے دوستو! تمہاری باتیں بس خواب ہیں۔ شاید تم نے یہ منظر نہیں دیکھا کہ سفید' براؤن اور کالے رنگ کے لوگ متحد ہو کر میدان جنگ میں لڑتے ہیں۔ میں جب پیشوا کی ملازمت میں تھا تو میں نے یہ خون ریز جنگیں دکن میں دیکھی ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی آستین کو الٹا اور بازو پر زخم کے نشان کو دکھایا جو کہ گولی کی وجہ سے آیا تھا۔ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی بات ختم کی: "اگر مقابلہ تلوار کے ذریعہ ہو تو ایک بہادر شخص دو یا تین لوگوں پر قابو پا سکتا ہے۔ لیکن ان بزدل شیطانوں کے پاس کوئی تلوار نہیں ہے' اور اگر ہے تو بھی تو اس قدر کند ہے' جیساکہ تمہارا بید۔ وہ تمہیں اپنی گولی کے ذریعہ اس وقت قتل کرتے ہیں کہ جب تم ایک میل کے فاصلہ پر ہوتے ہو۔ تو اب تمہیں بتاؤ کہ اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے؟"

جب میں خیمہ کے قریب اس قسم کی بات چیت اور بحث ہوتی تھی تو میں اس سے کافی لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ کبھی کبھی میں اپنی جگہ سے اٹھ کر جاتا اور ان کی گفتگو میں حصہ لیتا تھا۔ میں ان سے اپنی ٹوٹی پھوٹی سندھی میں کہا کرتا تھا کہ انگریز ان کے مفلوک الحال ملک پر قبضہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے ہیں کیونکہ یہاں پر سوائے چاول اور مچھلی کے اور کچھ پیدا ہی نہیں ہوتا ہے۔ اگر وہ اس پر قبضہ کرنے پر مجبور ہی ہوئے تو یہ ان کے لئے زیادہ مفید نہیں ہوگا کیونکہ ان کے پاس پہلے ہی سے ہندوستان کے مالدار علاقے ہیں۔ جن پر حکومت کرنا اور ان کا انتظام کرنا ان کے لئے کافی ہے۔ اس کے علاوہ وہ میروں کے گہرے دوست ہیں۔ ان کی فوجیں سندھ سے محض اس لئے گزر رہی ہیں۔ تاکہ وہ اپنے ہندوستانی مقبوضات کی حفاظت کر سکیں اور ساتھ ہی بیرونی حملہ سے میروں کے علاقے کا دفاع کر سکیں۔ میری اس بات پر وہ سب کے سب مل کر ہنسنے لگتے۔ "آپ جو کچھ کہتے ہیں' شاید

یہ سچ ہو' ہم تو غریب لوگ ہیں' اور حکومت کی پالیسیوں کی سمجھنے سے قاصر ہیں۔"

میں نے اپنے افسر کے کہنے کے مطابق کراچی کے ایک ہندو تاجر ناؤمل سے دوستی کی جس نے سندھ میں برطانوی مفادات کے لئے بہت اعلیٰ خدمات سرانجام دی تھیں۔ وہ اکثر میرے پاس آتا رہتا تھا اور فوج کی ضروریات کو پوری کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ وہ ایک دولت مند شخص تھا کہ جس کا خاندان بہت بڑا تھا۔ اس میں اس کا باپ' چھ بھائی اور عورتیں و بچے شامل تھے۔ زیریں سندھ میں اس کا کافی اثرورسوخ تھا۔

19 دسمبر کو عیدالفطر کا تہوار تھا۔ یہ مسلمانوں کے لئے خوشی کا تہوار ہے کہ جو رمضان کے بعد آتا ہے۔ چونکہ فوج میں کوئی مسلمان مولوی نہیں تھا اس لئے دوستوں کے اصرار پر میں نے نماز عید پڑھائی اور خطبہ دیا۔ عید کے موقع پر کمپنی میں جو مسلمان فوجی اور ملازم تھے انہیں رومال اور پگڑی بطور تحفہ دی گئیں۔ ان کی قیمت چالیس روپیہ ہوگی جس کی کچھ رقم کمیشنڈ افسروں سے لی جاتی ہے۔

ان دنوں میں اکثر ہمیں شیر محمد کے شب خوں کی وجہ سے چوکنا رہنا پڑتا تھا۔ 20 تاریخ کی رات کو پورے کیمپ میں لوگ چوکس رہے جبکہ آفیسر حضرات باری باری کیمپ کا دورہ کرتے رہے۔ میں نے یہ نوٹس کیا کہ اس علاقہ کے مرغ بھی ضرورت سے زیادہ مذہبی تھے۔ صبح و شام بانگ دینے کے علاوہ وہ رات کو دومرتبہ اور زور سے بانگ دیا کرتے تھے۔ ہندوستان اور ایران میں مرغوں کی بلا وقت کی یہ بانگ منحوس سمجھی جاتی ہے وہاں اگر کوئی مرغا اپنی حدود سے تجاوز کر جائے تو اس کی قیمت اسے جان دے کر دینی پڑتی ہے۔ لیکن سندھ کے لوگ اس معاملہ میں بھی لاپرواہ ہیں۔

یہاں سے میں گھوڑا باری گاؤں دیکھنے چلا گیا۔ اس کو بڑا گاؤں اس لئے سمجھا جاتا ہے کہ اس میں ایک سو گھٹیا قسم کی جھونپڑیاں ہیں۔ صوبہ کے اس حصہ میں' سردی کے موسم میں دریا کا پانی کافی کم ہو جاتا ہے۔ اس کا پانی مٹیالا اور ریتیلا ہے۔

23 تاریخ کو ہمیں یہ خوش خبری ملی کہ دوسرے دن ہمیں ٹھٹھہ کی جانب سفر کرنا ہے۔ لہٰذا ہم نے اپنا سامان فوج کے ہمراہ روانہ کردیا۔ دوسرے دن صبح کو ہم اپنے خیمہ اٹھا کر گھوڑوں پر سوار ہونے والے تھے کہ ریذیڈنٹ نے میرے آقا کو کہلوایا کہ وہ فی الحال وہیں ٹھہرا رہے کہ جہاں ہے کیونکہ انہیں سامان اٹھانے کے لئے اور اونٹوں کی ضرورت ہے۔ 24 تاریخ اونٹوں کے انتظام میں گزر گئی۔ اس رات میں کیپٹن ایسٹ وک کے خیمہ میں سویا۔ رات سخت سردی تھی' میں نے ہندوستان میں رہتے ہوئے اس قدر سخت سردی

کا تجربہ نہیں کیا تھا۔ یہاں رک کر ہمیں اپنی تنہائی کا شدید احساس ہوا کہ کل تک ہم دس ہزار فوجیوں کے ساتھ تھے اور آج دو چپڑاسی اور دو سندھی سائس ہمارے ساتھ ہیں۔ ہم نے ان چاروں ملازموں پر کہ جو باہر سردی میں کانپ رہے تھے' ترس کھا کر انہیں بھی خیمہ میں سونے کی پیش کش کی۔ لیکن احترام کی وجہ سے وہ اس پر بالکل تیار نہیں ہوئے اور خیمہ کی دیواروں کے ساتھ سوئے۔

دوسرے دن کام کے بعد نہ تو ہمارے پاس ملازم تھے اور نہ کھانے کا سامان کہ ہم اپنی اشتہا مٹا سکتے۔ میری خوش قسمتی کہ میں کچھ کھجوریں اور بدمزہ سندھی روٹی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ ہمارا ڈنر ہوا۔ میرے آقا کے لئے یہ بڑا مزیدار کھانا تھا' اور میرے لئے بھی یہ ان خوش ذائقہ غذا سے بہتر تھا کہ جو بعد میں میں نے لندن کی سیوارٹ ہوٹل میں کھائی تھیں۔ مسٹر ایسٹ وک نے ایک عیسائی کی طرح کھانے کے بعد دعا مانگی اور میں نے اس قادر مطلق کا شکریہ ادا کیا کہ جو رزق دینے والا ہے ہمارے گناہوں کو معاف کرنے والا اور ہماری ضرورتوں کو پورا کرنے والا ہے۔

میں نے اپنے ساتھی کا امتحان لینے کی غرض سے کہا کہ: "ہمیں اس خراب کھانے کی وجہ سے خدا کا شکر ادا نہیں کرنا چاہئے' اگر ہم نے یہ کیا تو پھر وہ کبھی ہمیں اچھا کھانا نہیں دے گا۔"

اس پر وہ مسکرایا اور کہنے لگا: "پہلے تو ہم یہ فیصلہ کریں کہ ہم نے جو کچھ کھایا کیا یہ برا تھا؟ اس کے بعد اور گفتگو کی جاسکے گی۔"

اس طرح ہم نے اپنا وقت ان باتوں میں گزارا یہاں تک کہ وہ گہری نیند سو گیا۔ میں نے تھوڑی دیر حقہ پیا اور پھر میں بھی سونے چلا گیا۔

25 دسمبر کو حضرت عیسیٰ کا یوم پیدائش تمام عیسائیوں کے لئے باعث مسرت و خوش ہوتا ہے۔ اس دن صبح صبح ہمیں مسٹر جینکنس اور کیپٹن وارڈ نے سوتے سے اٹھایا۔ یہ دونوں منڈاوی سے آئے تھے۔ انہوں نے کیپٹن ایسٹ وک سے درخواست کی یہ انہیں فوج تک پہنچائے۔ لیکن اس کے ذمہ ابھی تک کیمپ کے بقایا سامان کو لے جانا اور اس کے لئے اونٹوں کا انتظام کرنا تھا' اس لئے اس نے مجھ سے کہا کہ میں ان کے ہمراہ جاؤں جبکہ وہ خود بقایا کام کو اکیلا ہی پورا کرلے گا۔

ہم گھوڑوں پر سوار سومریا پہنچے جو کہ تیس جھونپڑیوں کا ایک قابل نفرت گاؤں ہے' یہاں سے تھوڑی دور چل کر ہم نے فوج کو جا لیا۔ کیپٹن ایسٹ وک بھی کام پورا کرکے

دوپہر کو پہنچ گیا۔ اس کے بعد ہمارا سفر کرم پور کے لئے تھا۔ جوکہ دریائے سندھ کی ایک برانچ پر واقع ہے۔ اس کی آبادی تقریباً پچاس جھونپڑیوں پر ہے۔ اس کی دوسری جانب اسی سائز کا دوسرا گاؤں غلام جوگوٹھ ہے۔

27 تاریخ کو ہم نے آرام کیا' اور 28 کو قدیم شہر ٹھٹھہ پہنچ گئے۔ ہم صبح روانہ ہوئے اور نوبجے ٹھٹھہ شہر سے دو میل کے فاصلہ پر مکلی پہنچ گئے۔ ہم جس راستہ سے گئے یہ کچھ ریتیلا' کچھ پتھریلا اور غیرہموار تھا۔ یہ راستہ کلان کوٹ کے قدیم آثار سے ہو کے گزرتا تھا۔ اس قدیم شہر کی فصیلیں اگرچہ پرانی ہیں' مگر بہت مضبوط ہیں۔ تعمیر میں جو مواد استعمال ہوا ہے اس میں چونا اور پکی ہوئی اینٹیں ہیں جو کہ اتنا وقت گزرنے کے بعد بھی بالکل نئی نظر آتی ہیں۔ اب تک یہ اس قدر مضبوط ہیں۔ جیسے کہ پتھر۔ ان آثاروں کے ڈھیر میں لوگوں کو قیمتی اشیاء جیسے پرانے سکے وغیرہ ملتے رہتے ہیں۔ یہاں جولوگ آباد ہیں وہ ان چیزوں کو فروخت کرکے اچھے پیسے کما لیتے ہیں۔

30 تاریخ کا دن ابر آلود' طوفانی' اور سرد تھا۔ صبح کو جب میں سو کر اٹھا اور وضو کی غرض سے پانی لینے لگا تو وہ برتن میں جما ہوا تھا۔ اس لئے میں نے وضو کے بجائے تیمم سے کام چلایا۔ چونکہ یہ اتوار کا دن تھا اور میری چھٹی تھی' اس لئے میں شہر دیکھنے کی غرض سے چل دیا۔

ٹھٹھہ شہر کے گرد کوئی فصیل نہیں ہے۔ اس کا اکثر حصہ شکستہ اور ویران ہے۔ آباد گھروں کی تعداد دس ہزار کے قریب ہوگی۔ بازار انتہائی تنگ ہیں اور گلیاں بے انتہا غلیظ۔ یہاں کے باشندوں کی اکثریت جو لاہوں کی ہے' یہاں کی بنائی ہوئی لنگیاں اور کمبل بالائی سندھ کے مقابلے میں زیادہ عمدہ ہوتے ہیں۔ اس شہر کی عورتیں' اور باقی باشندے بھی شکل وصورت کے اعتبار سے معمولی ہیں اور بہت ہی گھٹیا قسم کا لباس پہنے ہوئے تھے۔ غلہ پیسنے اور تیل نکالنے کا کام اونٹوں سے لیا جاتا ہے۔ شہر میں چار سو مسجدیں ہیں۔ لیکن تقریباً سب کی سب خستہ حالت میں ہیں۔

میں یہاں جامع مسجد دیکھنے گیا کہ جو شاہ جہاں کے زمانہ میں 1647ء میں تعمیر ہونا شروع ہوئی تھی' اور اورنگ زیب کے زمانے میں 1661ء میں یہ مکمل ہوئی۔ تفصیلات اس کے کتبہ پر لکھی ہوئی ہیں۔ یہ شاندار عمارت ہے کہ جو چونے اور پکی اینٹوں سے بنائی گئی ہے۔ اس کے اندر سفید اور نیلے رنگ کی اینٹیں لگی ہوئی ہیں۔ چھت کے اوپر سو کے قریب گنبد ہیں' جن میں سے ہر ایک کو مختلف انداز سے پینٹ کیا گیا ہے۔ کتبہ پتھر کی ایک بڑی سل پر لکھا

گیا ہے۔ وہ دو پتھر کہ جن پر تاریخیں درج ہیں۔ ان پر بڑے بڑے حروف میں خطاطی کی گئی ہے۔ مختصراً یہ کہ پورا منظر دیکھنے والے کو خوبصورتی اور تقدس کا تاثر دیتا ہے۔

اس شہر کی اینٹیں اور مٹی کے برتن بہت پائیدار ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کی وجہ یہاں کی مٹی ہے جو کہ ریت اور سفید چکنی مٹی سے مل کر بنی ہے۔

عام طور سے یہاں کے مکانات ایک منزلہ ہیں۔ انہیں مٹی اور کمزور لکڑی سے بنایا گیا ہے۔ ان کی چھتیں سپاٹ و ہموار ہیں۔ دیواروں پر گارے کا پلاسٹر کردیا گیا ہے۔ صرف چند دو منزلہ مکانات ہیں کہ جو اینٹوں سے تعمیر ہوئے ہیں جو یہ یہاں کے دولت مند لوگوں کے ہیں۔

بازار میں اتفاق سے میری ملاقات ایک خوبصورت عرب نوجوان سے ہوگئی جس کا نام سید محمد تھا جو کہ یہاں مدینہ سے آیا تھا۔ اس سے دوستی ہونے کے بعد ایک دن میں اس کے ساتھ شہر کے بڑے عالم مخدوم شیخ عبداللہ سے ملنے گیا۔ ان دونوں حضرات کی شہر میں بڑی عزت ہے۔ عرب نوجوان کی اس لئے کہ اس کا تعلق اعلیٰ سید خاندان سے ہے' اور شیخ کا اس لئے وہ عالم ہے۔ میں نے دو گھنٹے ان حضرات کی صحبت میں گزارے۔ سید محمد شاہ نے تین سال کا عرصہ بغداد اور ایران کی سیاحت میں گزارا۔ اس عرصہ میں اس کا خمس جمع ہوتا رہا۔ شیعوں میں یہ دستور ہے کہ وہ اپنی جائیداد کا 1/5 اپنے عالم کو دیتے ہیں' اس طرح سے اس نے یہودیوں کی طرح خود کو مالدار بنا لیا۔ اگرچہ عرب دوسری زبانیں سیکھنے کے معاملہ میں نالائق ہیں۔ مگر یہ اچھی فارسی بول لیتا ہے۔ میرا میزبان ایک عالم اور شریف گھرانے سے تعلق رکھنے والا ہے۔ اس کے پاس نایاب کتابوں کی ایک خوبصورت لائبریری ہے جس میں عربی و فارسی کی اہم کتابیں ہیں۔

یکم جنوری 1838ء کو چار یا پانچ افراد پر مشتمل ایک وفد حیدر آباد سے ہمارے کیمپ میں آیا۔ اس کا استقبال ریذیڈنٹ کے خیمہ میں سر جان کین اور کرنل پونگر نے کیا۔ وفد نے ان کے ساتھ دونوں حکومتوں کے تعلقات پر گفتگو کی اور میران سندھ کی جانب سے جو اعتراضات تھے انہیں بھی سامنے لایا گیا۔ اس کے بعد یہ میٹنگ برخواست ہوگئی۔ انہوں نے یہ وعدہ کیا کہ جب برطانوی فوج سندھ سے گزرے گی تو جو کچھ ان کے پاس ہوگا وہ اس کو مہیا کریں گے۔

چار تاریخ کو میں نے اس غرض سے چھٹی لی کہ مکلی کے پہاڑی کی سیر کروں۔ میں صبح جلدی روانہ ہوگیا اور وہاں شام کو چار بجے تک رہا۔ یہ مشہور پہاڑی ٹھٹھہ سے ایک میل

کے فاصلہ پر ہے۔ اس کا حجم شہر کے مغربی حصہ سے لے کر شمال تک پھیلا ہوا ہے۔ لمبائی میں یہ آٹھ میل ہے اور چوڑائی میں ایک۔ اس کی اوسطاً بلندی 55 فٹ ہے۔ کہا جاتا ہے یہ نام ایک مچھلی فروش عورت سے منسوب ہے کہ جس کی یہاں پر اچھے دنوں میں دکان تھی۔ اس پہاڑی پر تقریباً پانچ سو گنبد والے مقبرے اور لاتعداد بغیر چھت کے مقبرے ہیں۔ یہ خاموشی کا پر آباد شہر ہے۔ مجھے صرف اتنا وقت ملا کہ میں چودہ یادگاروں کو دیکھ سکا جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

1- عید گاہ: یہ ایک خوبصورت مسجد ہے کہ جہاں مسلمان سال میں دو مرتبہ جمع ہوتے ہیں اور عید کی نماز پڑھتے ہیں۔ یہ مسجد سندھ کے گورنر یوسف خاں کی تعمیر کردہ ہے۔ اس کا کتبہ خوبصورت نستعلیق خط میں لکھا ہوا ہے جو اس طرح سے ہے:

یوسف خاں بہادر نے اس عبادت گاہ کی تعمیر اپنی قسمت کی طرح بلند و بالا کی ہے۔ اس کے سال تعمیر کی تاریخ 1043ھ ہے۔

2- مرزا جان اور مرزا غازی کے مقبرے۔ سال تعمیر 1683ء۔

3- طغرل کی بنائی ہوئی بڑی مسجد - (1679)

4- مرزا عیسیٰ اور مرزا عنایت اللہ، جو ٹھٹھہ کے دو گورنر تھے، ان کے مقبرے۔ یہ پیلے رنگ کے پتھر سے بنائے ہوئے ہیں۔ ان پر خوبصورت نقاشی ہے۔ پتھروں پر ابھرے ہوئے پھول ہیں۔ ان خوبیوں کی وجہ سے یہ عمارت دوسری تمام عمارتوں سے ممتاز ہے۔ کتبہ میں اس کی تعمیر کی تاریخ 1058ھ یعنی 1648ء ہے۔

5- ایک وزیر کا مقبرہ۔ تعمیر کی تاریخ 1638ء

6- نواب کا مقبرہ۔ تعمیر کی تاریخ 1558ء

7- پیر اسد، جو قاضی تھا، اس کا مقبرہ، اس پر تاریخ تعمیر نہیں پڑھی جا سکی۔

8- سید عبداللہ، بغداد کے مشہور بزرگ عبدالقادر جیلانی کے لڑکے کا مزار۔

9- میرک محمد کا مقبرہ۔ سال تعمیر 1649ء

10- شیخ ضیا کا مزار۔ سال تعمیر 1619ء

11- ایک بادشاہ کا مقبرہ کہ جس کا نام نہیں پڑھا جا سکا۔ سال تعمیر 1697ء

12- جام نندا اور تماچی کے مقبرے۔ یہ سمہ قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ پیلے رنگ کے پتھر کے بنے ہوئے ہیں۔ اس عمارت میں تین مقبرے ہیں۔ سال تعمیر

1519ء۔

13- بابا عیسیٰ لنگوٹی بند کا مزار، سال تعمیر 1512ء

14- سید علی شیرازی کا مزار، جو سندھ کے جوکھیہ قبیلہ کا پیر تھا۔ سال تعمیر 1776ء۔

اپنے سرکاری فرائض میں میں نے میران سندھ سے معاہدے کی تیرہ دفعات کا ترجمہ کیا۔ کہ جو ان پر نافذ ہونے والا تھا۔ اس کام کو میں نے دس گھنٹہ میں پوری رات بیٹھ کر پوا کیا۔ صبح میں اس ترجمہ کو لے کر ریذیڈنٹ کے پاس گیا۔ اس نے انگریزی کے ڈرافٹ کو ہاتھ میں لیا (یہ اسی کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا اور اس کو پڑھنے میں دقت پیش آتی تھی) اور مجھ سے کہا کہ میں ترجمہ پڑھوں۔ اس نے ترجمہ کو اپنے ڈرافٹ کے مطابق پایا اور اس اچھے ترجمہ کو سراہتے ہوئے اسے سرکاری طور پر تسلیم کرلیا۔ کیپٹن ایسٹ وک نے خوش ہوکر اپنی جیب سے پانچ سو روپیہ کا انعام دیا اور میری خدمات کی تعریف کی۔ ریذیڈنٹ نے بھی وعدہ کیا کہ وہ مجھے مزید اعلیٰ انعام سے نوازے گا۔

پانچ تاریخ کو پانچ بجے شام کو، ہمارے گارڈ نے ایک بلوچ کو قتل کردیا۔ اسے کیمپ میں شراب بیچنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اس جرم میں اسے کوڑوں کی سزا دی گئی۔ اس غریب شخص کو پتہ نہیں تھا کہ اس کے جرم کی سزا اتنی سخت ہوگی، اس لئے جب اسے کوارٹر گارڈ میں لے جایا گیا تو اس نے اپنی تلوار اور ڈھال اٹھالی (گرفتاری کے بعد اس سے یہ دونوں چیزیں لے لینی چاہئیں تھیں) اور سنتری کو تین جگہ سے زخمی کردیا۔ اس کے بعد اس نے فرار ہونے کی کوشش کی۔ وہ ننگی تلوار اور ڈھال لئے ہوئے سنتری سے بھڑ گیا۔ جس وقت وہ سر جان کین اور کرنل میکڈونلڈ کے خیموں کے درمیان سے گزر رہا تھا اس وقت اس پر تین مرتبہ فائر کئے گئے۔ ایک گولی کے لگنے سے وہ وہیں گر کر ڈھیر ہوگیا اور اس طرح وہ کوڑے کھانے کی سزا سے بچ گیا۔

ہمارے کیمپ میں ایکبار پھر یہ افواہیں گردش کرنے لگیں کہ شب خون پڑنے والا ہے۔ اس دوران ہمارے کیمپ کے کچھ لوگوں کو لکپر کے نزدیک پچیس مسلح سندھیوں نے لوٹ بھی لیا۔

16 تاریخ کو کیپٹن ایسٹ وک کو حیدرآباد جانے کا حکم دیا گیا۔ للذا ہم نے سفر کی تیاریاں شروع کردیں۔ دوسرے دن ہم گھاٹ پر روانہ ہوئے جو کہ یہاں سے دو میل کے فاصلہ پر تھا۔ یہاں سے ہم اسنیک نامی ایک اسٹیمر میں سوار ہوئے۔ یہاں پر کیپٹن جے اوٹ

رم ہمارے ساتھ آکر ملے۔ چونکہ رات کو بارش ہوئی تھی اس لئے صبح سخت سردی تھی۔ ہم نے دن میں بیس میل کا سفر کیا اور پھر ایک چھوٹے سے گاؤں میں لنگرانداز ہوئے۔ ہمارے راستہ میں میروں کی کئی شکارگاہیں آئیں۔ یہ دریا کے کنارے جنگلوں کے علاقے ہیں۔ جن کے اردگرد باڑھ لگا کر انہیں میروں نے اپنی شکار گاہیں بنا لیا ہے۔ ان میں ہر قسم کا شکار موجود ہے۔

چار دن کے سفر کے بعد ہم 20 تاریخ کی صبح حیدر آباد پہنچے۔ دریا کے دونوں جانب میدانی علاقوں اور پہاڑیوں کا منظر بڑا دلفریب ہے۔ پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ جن کے پر خوشنما گلابی رنگ کے تھے' پانی پر ہر طرف اڑتے نظر آتے تھے۔ 18 تاریخ کو ہم نے ایک بڑے مگرمچھ کو دریا کے ساحل پر سوتے ہوئے دیکھا۔ کیپٹن اوٹ رم نے اس پر بندوق سے چند وار کئے' مگر گولیاں اس کی چکنی جلد سے اچھل کر نیچے گر گئیں۔ ہاں اتنا اثر ضرور ہوا کہ اس کی نیند خراب ہوگئی اور وہ ساحل سے کھسک کر پانی میں غڑاپ ہوگیا۔

ایک نوجوان امیر' دوست علی خاں' جو میروں کے قریبی رشتہ دار خلیل اللہ خاں کا بیٹا ہے' وہ ہمارے استقبال کے لئے آیا۔ ہماری خیروعافیت دریافت کرنے کے بعد وہ چلا گیا اور ہم ریذیڈنسی کی عمارت میں منتقل ہوگئے۔ مقامی ایجنٹ منشی جیٹھ آنند کو یہ ذمہ داری سپرد کی گئی کہ یہ معلوم کرے کہ میران سندھ کب اور کس وقت برطانوی نمائندوں سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ 21 تاریخ کو وہ جواب لے کر آیا کہ آج کے دن میران سندھ برطانوی وفد سے اس لئے نہیں مل سکتے کہ اس دن انہیں کو اپنے بال کٹوانے ہیں۔

22 تاریخ کو میر صوبدار خاں نے دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے اپنے معتمد نمائندے بدرالدین کو کیپٹن ایسٹ وک کے پاس بھیجا۔ اسکا یہ خفیہ پیغام تھا کہ وہ ابتداء ہی سے برطانوی مفادات کی حفاظت کررہا ہے اور آئندہ بھی وہ برطانوی حکومت کا وفادار رہے گا۔ اس لئے دوسرے میر اگر مفادات کے خلاف کچھ کرتے ہیں تو وہ اس کا ذمہ دار نہیں ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کیپٹن ایسٹ وک سے ملاقات سے قبل اسے یہ ضمانت دے دی جائے کہ اس کی مراعات اسی طرح سے باقی رہیں گی۔ یہ پیغام ملنے کے فوراً بعد مجھے یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ میں بدرالدین کے ہمراہ جاکر اس ضمانت کی یقین دہانی کراؤں۔

کوئی تین میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم حیدر آباد کے قلعہ پہنچے۔ اس کے بارے میں پہلے ہی سے بہت کچھ سن چکا تھا۔ لیکن جب میں نے اسے قریب سے دیکھا تو سخت مایوس ہوا۔ یہ مخمس شکل کی عمارت ہے جو کہ پکی اینٹوں اور چونے سے بنائی گئی ہے کہ جس

میں جگہ جگہ برج نظر آتے ہیں۔ اس کے سامنے کوئی خندق نہیں ہے۔ قلعہ میں میروں کا خاندان، ان کے رشتہ دار اور متوسلین رہتے ہیں۔ جب ہم شہر سے گزرے تو میں نے دیکھا کہ جگہ جگہ کچھ بلوچ جماعتوں میں بیٹھے حقہ پی رہے ہیں اور وہیں پر بھنگ گھوٹی جارہی تھی۔ مجھ دیکھ کر کچھ نے ناک بھوں چڑھائی اور کچھ نے اپنی زبان میں برا بھلا کہا۔

"تمہارا اس کے بارے میں کیا خیال ہے" میں نے اپنے دوست بدرالدین سے پوچھا۔ "کیا تمہارے ملک میں اجنبیوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا جاتا ہے؟"

"کیا تمہیں معلوم نہیں" اس نے جواب میں کہا: "برتن میں جو رکھا ہوتا ہے وہی اس سے نکلتا ہے۔ یہ اس ملک کے بدمعاش سپاہی ہیں۔ یہ فرنگیوں کو پسند نہیں کرتے ہیں۔ تمہیں ان ہی میں سے سمجھ کر یہ گند اچھال رہے ہیں۔ لہٰذا ان کی باتوں کی طرف توجہ دینے کی قطعی ضرورت نہیں۔ یہی رویہ ریذیڈنٹ کا ہے۔"

اپنے دوست کی اس نصیحت پر عمل کرتے ہوئے میں نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ ہم میر صوبدار کے محل میں داخل ہوئے اور اس کی خدمت میں حاضری دی۔ اس وقت وہ اپنے لڑکے فتح علی کے ساتھ، جوکہ دس سال کا خوبصورت لڑکا ہے، مسہری پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا سیکرٹری اور ایک غلام حاضری میں تھے۔ یہ ایک کشادہ اور بڑا کمرہ تھا، مگر اس میں کوئی فرنیچر نہیں تھا۔ جب میں نے اسے مسلمانوں کے طریقہ اسلام علیکم کیا، تو اس نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ اس کے بعد میں بھی دوسرے حاضرین کی طرح فرش پر بیٹھنے والا تھا کہ اس نے کہا کہ میں کرسی پر بیٹھوں، جوکہ خاص طور پر میرے لئے لائی گئی تھی۔ خیروعافیت پوچھنے کے بعد میں نے ہزہائی نس کو وہ پیغام پہنچایا کہ جس کی ذمہ داری میرے اوپر ڈالی گئی تھی۔ اس نے اسے غور سے سنا اور اپنے اطمینان کا اظہار کیا۔ اس کے بعد یورپی لوگوں کی عادات و اطوار پر گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد میں نے جانے کی اجازت چاہی۔ اس موقع پر چند سندھی گھڑسواروں کا دستہ میرے ساتھ کیا گیا کہ وہ ریذیڈنسی تک میرے ساتھ جائیں تاکہ وہ راستہ میں بلوچوں کی بدتمیزی سے میری حفاظت کی جاسکے۔ ابھی میں آدھے راستے ہی میں تھا کہ اچانک کچھ سوار گھوڑے دوڑاتے میری طرف آئے اور مجھ سے درخواست کی میر صاحب مجھ سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتے ہیں، اس لئے مناسب ہوگا کہ آپ واپس چلیں۔ میں دوبارہ سے میر کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے پیغام کو دھرایا۔ اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ میر، ان میں سے کچھ الفاظ کو پوری طرح سے نہیں سمجھ سکا تھا۔

اس کام کو پورا کر کے میں اپنے سندھی دستہ کے ساتھ واپس ہو رہا تھا کہ میں نے اپنے آقا کو کیپٹن آوٹ رم اور لیکی کے ساتھ دیکھا کہ جو دوسرے تین میروں سے ملنے جا رہے تھے۔ انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ اگر میں بھی ساتھ چلوں تو اچھا رہے گا۔ لہٰذا میں بھی اس طرح برطانوی نمائندوں میں شامل ہو گیا۔ میرے لئے یہ دن سخت محنت اور بھوکے رہنے کا تھا۔ صبح جب میں روانہ ہوا تھا' اس وقت میں نے روٹی کے ایک ٹکڑے اور چائے سے ناشتہ کیا تھا۔ اب دن ختم ہونے والا تھا' مگر میرا کام ابھی بھی ختم نہیں ہوا تھا۔

جب ہم دربار میں پہنچے تو وہاں بلوچیوں' فوجیوں اور ملازموں کا اس قدر اژدھام تھا کہ میں نے سوچا کہ ان میں سے گزرنا ناممکن ہے۔ لیکن انہوں نے یورپی لوگوں کے لئے راستہ تو بنا دیا' لیکن اس ہجوم میں' میں پیچھے رہ گیا اور میرے لئے یہ ناممکن ہو گیا کہ میں ذرا بھی آگے بڑھ سکوں۔ اس موقع پر کیپٹن ایسٹ وک کو میرا خیال آیا' جس وقت وہ میروں کے ساتھ تھا تو اس نے مڑ کر مجھے دیکھا اور زور سے کہا:

"لطف اللہ' ان کاغذات کو سنبھال کر رکھو۔" جیسے ہی وہاں لوگوں نے ان الفاظ کو سنا' ملازموں نے مجھ کو ایک طرف کرتے ہوئے میرے لئے راستہ بنایا' اور چند ہی لمحوں میں' میں لوگوں کے سروں پر سے ہوتا ہوا' اپنے آقا کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے قریب بیٹھ کر میں نے اس کانفرنس کے نوٹس لینا شروع کر دیئے۔

تینوں میر' نور محمد' ناصر خاں اور میر محمد اور ان کے ساتھ ایک نوجوان میر شاہ داد' یہ سب ایک چوکور تختہ پر بیٹھے ہوئے تھے جس پر ایک سادہ سا ایرانی قالین بچھا ہوا تھا' یہ ان کا تخت تھا۔ ان کے سامنے ان کی تلواریں اور ڈھالیں رکھی ہوئی تھیں۔ برٹش نمائندے اور ان کے ساتھی ان کرسیوں پر بیٹھے کہ جو ان کے لئے خاص طور سے رکھی گئیں تھیں۔ لیکن ہم سب کو دربار میں داخل ہونے سے پہلے اپنے جوتے اتارنا پڑے۔ باقی لوگ فرش پر قالینوں پر بیٹھ گئے۔ یہاں پر دربار میں کوئی درجہ بندی نہیں تھی۔ مسلح بلوچ اور سندھی جہاں ان کا دل چاہتا تھا اور جہاں جگہ مل جاتی تھی وہاں بیٹھ جاتے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔ کبھی کبھی ہماری طرف دیکھ کر نفرت کا اظہار بھی کر دیتے تھے۔ ہمارے ساتھ ان کا سلوک ایسا تھا کہ جیسے ہم قاتل ہیں۔

ان میں سے نور محمد باصلاحیت اور اعلیٰ خیالات کا مالک تھا۔ یہ بہادر بھی تھا اور جسمانی طور پر خوش شکل بھی۔ اس وقت یہ اڈھیڑ عمر کا تھا۔ اس کا قد بھی درمیانی تھا۔ اس کی بھوؤں کے درمیان لکیر سے ثابت ہوتا تھا کہ یہ جذباتی اور غور و فکر کرنے والا شخص ہے۔

کانفرنس میں یہ واحد شخص تھا جو حکومت و ریاست کے معاملات پر گفتگو کررہا تھا' اور مختلف سوالات کے جوابات دے رہا تھا۔ ناصراور محمد یا تو خاموش رہے یا اگر کچھ بولے بھی تو اس کے حوالہ سے۔ میں اس کی بہادری' جرات' اس کی گفتگو کے انداز جوکہ سچائی' جذبہ اور خطابت کی خوبیوں سے پر تھی' بے انتہا متاثر ہوا۔

ناصر خوبصورت ہے مگر بہت زیادہ موٹا ہے۔ خوش خلقی' نرمی اور فیاضی کی خوبیاں اس کی شخصیت کا حصہ ہیں۔

میر محمد جسمانی طور پر طاقت ور ہے۔ اس میں فوجی جیسی صلاحیتیں ہیں۔ اس کی شکل و صورت تو اچھی ہے مگراس کے ہونٹ خراب ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت جب اس کی شکل تراش رہی تھی تو اس کے ہونٹوں تک آتے آتے چھینی گر گئی اور اس کی شکل نامکمل رہ گئی۔ وہ نور محمد کے بائیں جانب تخت کے کونہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا بائیں ہاتھ اس کی ڈھال پر تھا' اور دایاں ہاتھ تلوار کے دستہ پر۔

یہ غیرمہذب دربار کے سربراہ تھے۔ جب خیروعافیت پوچھنے کا سلسلہ ختم ہوا تو کیپٹن ایسٹ وک نے فورا موقع سے فائدہ اٹھا کر میروں سے اپنے مشن کے بارے میں آگاہ کیا۔ اس نے میرے ہاتھ سے کاغذات لئے جن میں کہ معاہدہ کا ڈرافٹ تھا جس کا فارسی میں' میں نے ہی ترجمہ کیا تھا۔ پھراس نے اس کی تمام دفعات کو عمدہ ایرانی لہجہ میں پڑھ کر سنایا۔ میروں نے اسے خاموشی سے سنا' میرنور محمد کے چہرے پر ناراضگی کے تاثرات ابھر رہے تھے۔ اس کے چہرے کی رنگت یکدم سرخ ہوگئی' اور پھر بالکل پیلی پڑ گئی۔ جب دفعات پڑھی جاچکیں تو بلوچ حاضرین نے اس پر سخت غم و غصہ کا اظہار کیا۔ اس موقع پر میروں کے ذرا سے اشارہ پر ہماری پوری جماعت کی زندگیوں کا خاتمہ ہو سکتا تھا' کیونکہ وہ ہمارے سروں پر ننگی تلواریں لئے ہوئے اس طرح کھڑے تھے جیسے کہ جلاد قتل کرنے کے فرض کو پورا کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔

سب سے پہلے نور محمد نے بلوچی زبان میں اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا کہ : "ان پر لعنت ہوکہ جو فرنگیوں کے وعدوں پر یقین کرتے ہیں۔" اس کے بعد اس نے بڑی سنجیدگی سے فارسی زبان میں برٹش نمائندوں سے کہا کہ "تمہارے معاہدے' جہاں تک میری معلومات ہیں' تمہاری ضروریات اور مفادات کے تحت تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ کیا یہی وہ طریقہ ہے کہ جو تم اپنے دوستوں اور ہمدردوں کے ساتھ اختیار کرتے ہو؟؟" تم نے ہم سے اجازت مانگی تھی کہ تمہاری فوجیں ہمارے علاقے سے گزر کر جائیں۔ ہم نے اس کی

اجازت بغیر کسی جھجک کے تمہیں دے دی تھی اور اس سلسلہ میں تمہاری دوستی اور وعدوں پر بھروسہ کیا تھا۔ لیکن اگر ہمیں یہ معلوم ہوتا کہ تمہاری افواج ہمارے علاقے میں داخل ہونے کے بعد ہمارے وجود کے لئے خطرہ ہوں گی' ہمارے اوپر ایک دوسرا معاہدہ تھوپیں گی' ہم سے تین لاکھ کا سالانہ خراج مانگیں گی اور فوج کے اخراجات کے لئے 21 لاکھ روپیہ کا فوری مطالبہ کریں گی' تو اس صورت میں ہم اپنے ملک اور اپنی حفاظت کے لئے دوسرے طریقے اختیار کرتے۔ تمہیں معلوم ہے کہ ہم بلوچ ہیں۔ تاجر نہیں ہیں کہ جنہیں ڈرایا و دھمکایا جا سکتا ہو۔ ہم اس ملک پر تنہا ہی حکومت نہیں کرتے ہیں بلکہ اس کی حکمرانی میں ہمارا پورا قبیلہ ہمارے ساتھ ہے۔"

کیپٹن ایسٹ وک نے یہ سب کچھ خاموشی سے سنا اور اس کا جواب فارسی و عربی کی ضرب الامثال کے ذریعہ دیا۔ "ہماری حکومت کا ایسا کوئی ارادہ نہیں کہ جس سے آپ کی حکومت کو پریشانی ہو۔ مگر ضرورت کسی قانون کی پابند نہیں ہوتی ہے۔" دوسری مثال کہ " دوستوں کو دوستوں کی مدد کرنی چاہئے۔" مزید یہ کہا کہ : "موجودہ مہم کا مقصد صرف ہندوستان کی ہی حفاظت نہیں بلکہ اس سے آپ کے ملک کی حفاظت بھی مقصود ہے' اور یہ ذمہ داری ہماری ہے کہ آپ کی حفاظت کریں۔"

یہ سن کر میرنور محمد مسکرایا اور اپنے چچازاد بھائیوں سے بلوچی میں کچھ کہا کہ جو ہم نہیں سمجھ سکے۔ اس کے بعد ایک سرد آہ بھر کر وہ ایسٹ وک سے مخاطب ہوا : "میری خواہش ہے تم نے جو "دوست" کا لفظ استعمال کیا ہے' میں اس کے معنی سمجھ سکوں۔ بہرحال' ہم اس وقت تمہارے مطالبات کے بارےمیں کوئی حتمی رائے نہیں دے سکتے ہیں۔ اس معاملہ میں ہمیں صلاح و مشورہ کرنا ہے کیونکہ ہم اپنے مفادات کی خاطر دوسروں کو قربان نہیں کرسکتے ہیں۔ اور ان میں وہ لوگ بھی ہیں کہ جن پر ہمارا کوئی کنٹرول نہیں ہے۔ "

سورج غروب ہونے کے بعد ہم دربار سے گئے۔ رخصتی کے وقت نہ تو عطر لگایا گیا اور نہ ہی عرق گلاب چھڑکا گیا جیساکہ ہندوستانی درباروں کا طریقہ ہے' ہم جب گھر پہنچے ہیں تو اس وقت ساڑھے چھ بج رہے تھے۔ اس پورے دن کے کام کے بعد میں تھک کر چور ہوگیا تھا۔

23 تاریخ کو ہم انتظار کرتے رہے کہ میران سندھ کی جانب سے کوئی جواب آئے' مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ معاملات نے خراب رخ اختیار کرلیا ہے۔ مقامی ایجنٹ نے خفیہ طور

پر ہمیں پیغام بھجوایا کہ ہم ہوشیار رہیں۔ اس کی اس تنبیہہ میں سنجیدگی تھی' کیونکہ ہم نے دو سو کے قریب مسلح بلوچیوں کو پانچ سو گز کے فاصلہ پر ایک گھاٹی میں بے چینی کے عالم میں بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ ان میں کچھ نے آکر ہماری جماعت کا جائزہ بھی لیا تھا' مگر جب انہوں نے ہمیں ہوشیار اور چوکس دیکھا تو وہ واپس چلے گئے۔

24 تاریخ کو جب میران سندھ کے جواب دینے کا وقت ختم ہوگیا تو ہم واپس اپنے کیمپ کی طرف روانہ ہوئے۔ اس موقع پر ہوا اور لہروں نے ہمارا ساتھ دیا اور ہم آرام سے سفر کرتے ہوئے جھرک پہنچ گئے۔ یہ سفر ہم نے تین گھنٹے میں طے کرلیا۔

25 تاریخ کو ہم جھرک میں لنگر انداز ہوئے اور یہاں پر اس فوج میں شامل ہوئے کہ جو اس روز صبح کے وقت پہنچی تھی۔ یہاں پر میں ڈوبنے سے بال بال بچا۔ ہوا یہ کہ میں نے اپنی کتابوں کے بکس کو ایک سندھی کشتی بان کی مدد سے اٹھایا اور اسے دو کشتیوں کے کنارے پر رکھ کر میں نے اپنے پیر ان دونوں کشتیوں پر رکھ لئے تاکہ میں بکس کو سہارا دیئے رکھوں۔ عین اسی وقت' منصوبہ کے تحت وہ سندھی بغیر کہے ہوئے مجھے اس حالت میں چھوڑ کر چلا گیا' اب میں کوئی حرکت کرنے کے قابل نہیں تھا' کیونکہ اگر میں بکس کو چھوڑتا تو وہ پانی میں جا گرتا۔ اس حالت میں میں پندرہ منٹ رہا۔ جب دونوں کشتیاں ایک دوسرے سے علیحدہ ہونے والی تھیں' میں اور کتابوں کا بکس دریا میں گرنے والا تھا' اس وقت وہ کشتی والا میرے پاس آیا اور مجھے اس صورتحال سے نجات دلانے کا وعدہ کرکے اپنے انعام کا مطالبہ کیا۔ ایسا انعام جو میرے مرتبہ کے لائق ہو۔ مجبوراً مجھے اپنے غصہ کو دبانا پڑا اور اس بدمعاش کو کچھ انعام دیا کہ وہ مجھے اور میرے بکس کو بچا سکے۔ انعام میں نے اسے ضرور دیا مگر دل میں' میں نے بددعا کی کہ وہ اپنی اس بدمعاشی کے عوض سیدھا جہنم میں جائے۔

دسواں باب

یہاں پر ہماری افواج آٹھ دن تک مقیم رہیں۔ اس عرصہ میں شب خون کی افواہیں بھی کیمپ میں اڑتی رہیں۔ ایک سپاہی جس کا نام چاند دین تھا اور جس کا تعلق پانچ بمبئی کی نیٹو انفنٹری سے تھا' وہ میرپور خاص کے شیر محمد خاں کی قید سے بھاگ کر آیا تھا۔ اس نے ہمیں یہ خبر دی کہ شیر محمد ہمارے خلاف میران حیدر آباد سے ملنے والا ہے۔ 19 تاریخ کو میر اسماعیل شاہ' اپنے ایک بیٹے کے ہمراہ ہمارے کیمپ میں ملاقات کے لئے آیا تاکہ ارباب اعلیٰ سے بات چیت کرے۔

30 تاریخ کی شام کو تین افسروں کی مردہ لاشیں کیمپ میں لائی گئیں۔ یہ تینوں بغیر اطلاع کے غیر حاضر تھے۔ یہ ایک شکار کی مہم پر گئے تھے کہ جہاں جنگل میں چاروں طرف سے آگ لگ گئی اور یہ وہاں سے نہ بھاگ سکے۔

یکم فروری کو میروں کے سفیر اسماعیل شاہ نے پیغام دیا کہ میران حیدر آباد ان دفعات کو تسلیم کرنے پر تیار ہیں کہ جو معاہدے میں ہیں۔ دوسرے دن اسماعیل شاہ کا لڑکا تقی شاہ حیدر آباد کے لئے روانہ ہوگیا تاکہ میروں سے معاہدہ پر دستخط کرائے۔

تین تاریخ کو ہم نے جھرک چھوڑا' اور اس سے گیارہ میل سے فاصلہ پر ایک گاؤں اسماعیل جو گوٹھ میں قیام کیا۔ اس کے بعد نو میل چلنے کے بعد ہم کوٹری پہنچے۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر حیدر آباد کے مقابل میں واقع ہے۔

سندھ کی فوج جو دوسری طرف دریا کے کنارے مقیم تھی' وہاں سے وہ تین تاریخ کو حیدر آباد چلی گئی' ہم نے اس کے ایک حصہ کو جلدی جلدی وہاں سے جاتے دیکھا۔ یہ فوج دس ہزار پر مشتمل تھی۔ ان کے پاس تیس' توپیں تھیں۔ اس میں سے سات ہزار جوان اور بارہ توپین میرپور کے شیر محمد کی تھیں۔ جس نے اس مقصد کے ساتھ میروں کی فوج سے تعاون کیا تھا تاکہ وہ کافروں سے لڑ سکے۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ انگریز فوج کی تعداد بھی زیادہ ہے اور ان میں ڈسپلن بھی ہے تو وہ مایوس ہوکر اپنے علاقے میں چلا گیا۔ جاتے ہوئے اس نے ریذیڈنٹ کے ایک خط کا کہ جو اسے سخت لہجہ میں لکھا گیا تھا اور جسے میں نے ہی ڈرافٹ کیا تھا اس کا جواب بڑے مہذب انداز میں دیا۔

اس موسم میں دریا چڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ اگرچہ اس کا پانی ہمیشہ مٹی سے گدلا

رہتا ہے، مگر یہ صاف ہو جائے تو صحت بخش ہے۔ اس کی صفائی کا طریقہ بڑا آسان ہے۔ بادام کی گری لے کر اسے مٹکے کے اندرونی حصہ میں مل دیا جائے یہاں تک کہ وہ ختم ہو جائے۔ اس کے بعد مٹکے میں پانی بھر دیا جائے اور اس کو ہلائے بغیر ایک گھنٹہ تک اسی حالت میں رکھا جائے۔ اس کے بعد پانی موتی جیسا چمکتا نظر آئے گا۔ اس کے بعد پانی کو دوسرے مٹکے میں منتقل کردیں اور پھر اسے دل بھر کے پئیں۔ لیکن اگر آپ نے یہ پانی بغیر صفائی کے پی لیا، خاص طور سے لذیذ پلہ مچھلی کھانے کے بعد، تو اس صورت میں پیچش کا ہونا لازمی ہے، اور یہ عام طور سے مہلک ہوتی ہے۔

6 تاریخ کو ریذیڈنٹ کو میران حیدر آباد کی جانب سے مٹھائیوں کے تھال ملے تاکہ وہ کیمپ کے تمام لوگوں کا منہ میٹھا کرائیں۔ اس کے جواب میں ریذیڈنٹ نے اچھی قسم کی آٹھ پاؤنڈ کی شیرینی لے کر ان کی خدمت میں بھیجی۔ انگریز چونکہ گوشت خور ہیں، اس لئے وہ ہماری طرح سے مٹھائی کے ذائقہ سے لطف اندوز نہیں ہوتے ہیں۔ میرے حصہ میں جو زیادہ مٹھائی آئی اس کا سبب یہی تھا۔ میرے دوستوں، ملازموں، اور خود میں نے مٹھائی کے اس تحفے سے خوب لطف اٹھایا اور اس کے لئے ریذیڈنٹ کا شکریہ ادا کیا۔

9 تاریخ کو کیپٹن ایسٹ وک سے کہا گیا ہے کہ وہ فوج کو لے کر شکارپور جائے۔ وہاں جانے کے لئے ہم سب نے تیاریاں شروع کردیں۔ 10 تاریخ کی صبح کو ہم فوج کے ساتھ سفر پر روانہ ہوئے اور پہلی منزل بڑا گاؤں تھا جو کہ کوٹری سے آٹھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ اسماعیل شاہ کا ایک لڑکا صادق شاہ یہاں آکر ہمارے ساتھ شامل ہوا۔ اسے میروں نے بطور ایجنٹ بھیجا تھا تاکہ وہ فوج کی سپلائی کا خیال رکھے۔ ہمیں یہ ہدایت تھی کہ ہم جس قدر ممکن ہو دریا کے دائیں کنارے کیساتھ ساتھ چلیں۔ ایک سوار نے یہ غلطی کی کہ وہ اپنے گھوڑے کو پانی پلانے کے لئے متعین جگہ سے دوسری جگہ لے گیا جہاں وہ اپنے گھوڑے سمیت ڈوب گیا۔ ایک اونٹ اپنی پیاس بجھانے کے بعد گھٹنوں گھٹنوں پانی میں گرمی سے بچاؤ کے لئے بیٹھ گیا۔ جیسے ہی وہ بیٹھا تو اسے انتہائی طاقت کے ساتھ نیچے کی طرف کھینچا گیا اور ایک بہت بڑا مگرمچھ اسے لے گیا۔ یہاں پر 5 پرائیوٹ سپاہیوں نے فوج کے لئے دعا کی اور خاموشی سے چلے گئے۔

ہم نے اس طرح سے سفر کیا:

11 تاریخ کو	دس میل	عمرپور تک
12 تاریخ کو	نو میل	گوپانگ تک

13 تاریخ کو	دس میل	جھنڈ تک
14 تاریخ کو	گیارہ میل	سمہ تک
15 تاریخ کو	بارہ میل	آمری تک
16 تاریخ کو	بارہ میل	لکی تک

لکی ایک بڑا گاؤں ہے کہ جس میں ایک سو کے قریب کچے مکانات ہیں۔ یہاں پر سندھ کے سید رہتے ہیں۔ یہاں میں نے شاہ صدر کی درگاہ کی زیارت کی جو کہ سیوستان کے ایک پہاڑ کے دامن میں ہے۔ گاؤں سے اس کا فاصلہ تین سو گز ہے۔ یہ مشہور بزرگ عربؓ سے یہاں آئے تھے اور ان کی وجہ سے سندھ کے ہزاروں کافر مسلمان ہوئے۔ ان کا مقبرہ 1155ھ میں نادر شاہ' شاہ ایران' کے حکم سے تعمیر ہوا۔ روایت یہ ہے کہ ان بزرگ نے نادر شاہ کو خواب میں کہا کہ وہ عمرکوٹ جائے کے جہاں اس کو بڑا خزانہ ملے گا۔ بادشاہ نے اس خواب کے حکم پر عمل کرتے ہوئے عمرکوٹ کا سفر کیا کہ جہاں اس نے قیمتی خزانہ کو دریافت کیا۔ ساتھ ہی میں اس وقت کے میر سندھ نے اسے ایک خطیر رقم بطور خراج دی۔ اس خوشی میں اس نے سیدوں کے اس گاؤں کو ایک اچھی رقم بطور عطیہ دی اور ان کو ہدایت دی کہ بزرگ کی قبر پر ایک شاندار مقبرہ تعمیر کیا جائے۔ اس حکم پر انہوں نے فوری طور پر عمل کیا۔ اس بزرگ کے مقبرہ پر جو کتبہ نصب ہے اس سے تعمیر کی تاریخ کا پتہ چل جاتا ہے جو 1742ء ہے۔ (1155ھ)

سندھ کے لکی سید' جیسا کہ مجھے بتایا گیا' اسی بزرگ کی اولاد ہیں۔ ان کا سلسلہ نسب امام علی نقی سے جاکر ملتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ لفظ لکی شاید نقی کی بگڑی ہوئی شکل ہو' جو کہ دسویں امام کا نام ہے۔

یہاں سے ان پہاڑوں کا منظر جو ایک میل کے فاصلہ پر ہیں' بڑا خوبصورت ہے۔ قریبی پہاڑی کے پاس دو چشمے ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ ان میں سے ایک کا پانی ٹھنڈا اور صاف ہے' جبکہ دوسرے کا بہت گرم ہے۔

ایک بنیا جو کہ فوج سے پیچھے رہ گیا تھا' اس کو بلوچ لٹیروں نے پکڑ لیا' اس کے کپڑے وغیرہ لوٹنے کے بعد انہوں نے اس کے بازوؤں کو بھی تلوار کی ضرب سے زخمی کردیا۔ جب وہ غریب آیا ہے تو خون میں نہایا ہوا تھا۔ اس عرصہ میں کچھ اونٹوں کی بھی چوری ہوئی۔ یہ جرم کرنے والے بھرگڑی' مری اور لغاری بلوچ قبائل تھے۔ یہ لوگ ان پہاڑوں میں اپنے گدھو' بکریوں اور بھیڑوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ یہ لوگ بہت کم قریبی گاؤں میں جاتے

ہیں۔

17، 18 اور 19۔ فوج نے قیام کیا اور بھاری اسلحہ کو آگے روانہ کیا۔ اونٹوں کے تین چوروں کو گرفتار کرلیا گیا۔ 18 تاریخ کو ان کے کوڑے مارے گئے، اور سزا کے طور پر ان کے سروں اور داڑھیوں کو مونڈھ دیا گیا۔ ایک یورپی سپاہی جو میرے پاس کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا، مجھ سے کہنے لگا کہ وہ ہر روز ان سزاؤں کو دیکھ کر مسرت محسوس کرے گا، مگر یہ کہ کوڑوں کی سزا اس کو پسند نہیں۔

20 تاریخ کو ہم نے صبح سفر شروع کیا اور دس بجے سہون درہ پہنچ گئے۔ صبح کہر آلود تھی، رات کو سخت گرج و چمک کے ساتھ بارش ہوئی تھی۔ ہندوستان میں اس مہینہ میں بارش ہونا غیر معمولی واقعہ ہوتا ہے۔ یہ درہ سہون اور لکی کے درمیان میں ہے اور اس کا رقبہ دو سو گز لمبا ہوگا۔ یہاں پر دریا نے پہاڑ کے نچلے حصہ کو کاٹ دیا ہے۔ اس راستہ پر چلتے ہوئے آپ کے بائیں جانب اونچا و بلند و بالا پہاڑ اور اس کی ڈھلوان ہے تو دائیں جانب گہری کھاڑی ہے کہ جس کے نیچے دریا شور کرتا، موجیں مارتا ہوا جارہا ہے۔ ہمارے انجینئروں نے جہاں ضروری سمجھا وہاں سے راستہ کو دس فٹ اور چوڑا کردیا جس کی وجہ سے پرخطر نہیں رہا اور چلنے کے قابل ہوگیا۔ اس وجہ سے ہماری پوری فوج بغیر کسی حادثہ کے یہاں سے گزر گئی۔ سوائے ایک غریب عورت کے کہ جس کی ٹانگ کی ہڈی ہنگامہ کی وجہ سے ٹوٹ گئی۔

21 تاریخ کو ہم نے قیام کیا۔ اس موقع پر سرایچ فین، ہمارے کیمپ میں آیا اور نواب محمد خاں لغاری سے گفتگو کی۔ اس کو سندھ کی حکومت نے اسی مقصد کے لئے بھیجا تھا کہ وہ اس سے ملاقات کرے۔ اس موقع پر کسی کو بیٹھنے کی اجازت نہیں ملی۔ سوائے سرفین اور نواب کے۔ جب میں اجمیر میں تھا تو میں نے گورنر جنرل کے بہت سے درباروں میں شرکت کی، لیکن کسی موقع پر میں نے سفید یا کالے شریف لوگوں کو اس طرح سے بے عزت ہوتے نہیں دیکھا۔

کیپٹن ان نمائندوں کے درمیان بحیثیت مترجم کے کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے میں تھا اور بیچ میں کبھی کبھی اس کے فارسی جملوں کو بہتر صورت میں نواب تک پہنچا رہا تھا۔ جب سرفین نے مجھے بولتے ہوئے سنا تو پوچھنے لگا "جناب! آپ کون ہیں؟" اس پر کیپٹن ایسٹ وک نے جواب دیا "یہ میرا منشی ہے۔"

سرفین ایک لمبا تڑنگا، ذہین ادھیڑ عمر کا شخص ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس نے

ادب آداب بالکل نہیں سیکھے۔ جب اہم معاملات پر گفتگو ختم ہوئی تو بلوچ نواب اور بھی ٹھہرنا چاہتا تھا' مگر وہ بغیر کسی لحاظ کے اٹھ کھڑا ہوا اور اس مجلس کو ختم کردیا۔

22 تاریخ کی صبح کہر آلود اور سرد تھی۔ میں سہون شہر تفریح کی غرض سے گیا۔ یہاں پانچ ہزار مکانات ہیں' یا یوں کہئے کہ پندرہ ہزار کی آبادی ہے۔ اس جگہ لال شہباز قلندہ کی درگاہ مشہور ہے۔ یہ 1148ھ میں تعمیر ہوئی تھی۔ اس درگاہ میں صرف شہباز قلندر کی قبر ہے۔ اس کے دروازے پر ایک بڑے سائز کے چیتے کو گاڑی کے ایک پنجرہ میں بند کئے رکھا ہوا ہے۔

23 تاریخ کو ترتی کے گاؤں کی جانب پیش قدمی کی۔ ہماری فوجوں کو دریائے سندھ کی شاخ ارال کو سہون کے نزدیک عبور کرنا پڑا۔ ہمارے انجینئر نے دریا پر کشتیوں کا ایک پل بنایا۔ جس پر سے کہ فوج اور سامان کو لے جایا گیا۔ ترتی ایک بڑا قصبہ ہے کہ جس میں دو ہزار مکانات ہیں' یہ تازہ پانی کی ایک بڑی جھیل کے کنارے واقع ہے۔

24 تاریخ کو ہمارا سفر تکلیف دہ رہا' اس کی وجہ یہ تھی کہ جنرل نے بالکل آخری وقت میں فوج کے مارچ کرنے کے بارے میں اپنا فیصلہ بدل دیا تھا۔

25 تاریخ کو مجھے واجی گھورپے سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ اس کا تعلق ایک امیر گھرانہ سے ہے اور پہلے یہ پیشوا کی ملازمت میں تھا۔ اب یہ پونا کی اررگولر ہارس میں ایک افسر ہے۔ یہ ایک شریف آدمی ہے اور اچھے جذبات و اعلیٰ خیالات کا مالک ہے۔

کل کی افراتفری میں ڈاکٹر ردک کا کچھ سامان چوری ہوگیا۔ آج عیدالاضحیٰ کی وجہ سے چھٹی تھی۔ میرے مسلمان ساتھیوں نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اس موقع پر وعظ کہوں' مگر بے انتہا تھکے ہونے کی وجہ سے میں نے انکار کردیا۔ رد کن کے گاؤں میں' کہ جہاں ہم پہنچے' یہ ایک خاصا بڑا گاؤں ہے اور سہون سے تیس میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس گاؤں کا ملا ایک جاہل سندھی ہے۔ اس کی وجہ سے زندگی میں پہلی مرتبہ میری عیدالاضحیٰ کی نماز قضا ہوگئی۔

26 تاریخ کی صبح بے انتہا سرد تھی یہاں تک کہ ہمارے برتنوں میں پانی جم گیا۔ یہاں سے دس میل کے فاصلہ پر گاؤں گملو تک ہم نے مارچ کیا۔ اپنے قیام کے تین مقامات تک ہم نے دیکھا کہ زمین شور زدہ ہے۔ اس علاقہ میں نمک بڑی تعداد میں بنایا جاتا ہے۔ انہیں ڈھیر کی شکل میں ریت سے ڈھک دیا جاتا جیساکہ دوسرے ملکوں میں دستور ہے اسے جلایا نہیں جاتا ہے۔ جب میں نے اسے چکھا تو اس میں ہندوستان کے نمک کے مقابلہ میں شورہ

کا ذائقہ زیادہ پایا۔

27 تاریخ کو گھرا گاؤں پہنچا۔ یہ گاؤں پیر پنج کی درگاہ سے چھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ ان بزرگ کا تعلق صوفیوں کے اس سلسلہ سے ہے کہ جس کے ماننے والے صرف کالا کمبل پہنتے ہیں۔ ہمارا یہ سفر طویل اور تھکا دینے والا تھا۔ اس سفر میں ہم ایک جنگل سے بھی گزرے کہ جو بہت زیادہ گھنا نہیں تھا۔ میں نے یہ مشاہدہ کیا کہ ٹوپی اوڑھنے کا رواج سہون تک آتے آتے کم ہوا اور پھر اس کے بعد سے ٹوپی بالکل غائب ہوگئی۔ اس کی جگہ سندھی پگڑی باندھے نظر آئے۔

28 تاریخ کو پینہ گاؤں پہنچے۔ راستے اچھا تھا' اور پورا علاقہ زرخیز ہے۔ سردی کی شدت میں بھی کمی ہوگئی۔

یکم مارچ کو جنرل نے ایک بار پھر ہمارے قیام کرنے کے پلان کو تبدیل کردیا جس کی وجہ سے افراتفری ہوگئی۔ پہلے کمروری کا گاؤں قیام کے لئے چنا گیا۔ لیکن پھر اس کے بجائے فتح پوری کا انتخاب ہوا۔ اس پریشانی میں کچھ راستہ بھول گئے اور کچھ کمروری جاکر پھر فتح پور آئے۔

2 تاریخ کو بکرانی پہنچے۔ یہاں ہم نے تین تاریخ کو بھی قیام کیا۔ یہاں فوج نے دریائے سندھ کی ایک شاخ کو آہستہ آہستہ عبور کیا۔ یہ درمیان سے صرف سات فٹ گہری تھی۔

چار تاریخ کو ہم نے صبح صبح اس چشمہ کو پار کیا اور لاڑکانہ پہنچے۔ لاڑکانہ ایک بڑا قصبہ ہے۔ جوکہ مٹی کی دیواروں میں گھرا ہوا ہے۔ اس کا گورنر ایک جاہل بوڑھا بنام پیر عبدالرحیم ہے۔ یہاں پر فوج نے گیارہ تاریخ تک کے لئے قیام کیا تاکہ اس دوران پرخطر سفر کے لئے تیاری کی جائے جوکہ درۂ بولان سے ہوکر پورا ہونا تھا۔ یہاں پر سخت سردی ہوتی ہے جوکہ ہندوستانیوں کے لئے ناقابل برداشت ہے۔

بہت سے شتربانوں نے کہ جن کا تعلق کچھ سے تھا انہوں نے سردی کی وجہ سے سفر کرنے سے انکار کردیا۔ لیکن جب ان کو بطور سزا کوڑے مارے گئے اور ڈرایا دھمکایا گیا تو ان غریبوں کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی دوسرا راستہ نہ تھا کہ یا تو وہ سفر پر اپنی آمادگی ظاہر کریں یا فوج سے بھاگ جائیں۔ اس آخری راستے کو بہت سوں نے اختیار کیا اور اونٹوں کو چھوڑ کر گھر چلے گئے۔

یہاں آکر کیپٹن ایسٹ وک کا کام ختم ہوا' کیونکہ یہاں تک فوج کے ساتھ آنا اس کے فرائض میں سے تھا۔ یہاں پر ایک نوجوان افسر جس کا نام میجر ٹوڈ تھا' اس نے آکر پولٹیکل

آفیسر کا چارج لیا۔ اس موقع پر ایسٹ وک نے کیمپ چھوڑ دیا اور خود شکارپور چلا گیا جہاں پر اسے مسٹر ڈبلیو ایچ میکنائن سے ملنا تھا کہ جو سفیر اور وزیر کا عہدہ رکھتا تھا۔ جاتے وقت اس نے مجھے ہدایت دی کہ میں مسٹر ٹوڈ کے ساتھ رہوں اور اگر وہ آمادگی ظاہر کرے تو اس کو معلومات بہم پہنچاتا رہوں۔

9 تاریخ کو کیپٹن ایسٹ وک شکار پور سے واپس کیمپ میں آیا۔ اسے بالائی سندھ کا وقتی طور پر پولٹیکل ایجنٹ مقرر کردیا گیا تھا۔ اس نے مجھ سے مشورہ کیا کہ کیا وہ بالائی سندھ کا پولٹیکل ایجنٹ بننا قبول کرے یا سفیر کے ساتھ افغانستان جائے۔ کیونکہ اس فیصلہ کا حق اسے دیا گیا ہے۔ اس لئے وہ اس سلسلہ میں میرا مشورہ چاہتا ہے۔ ویسے وہ چاہتا ہے کہ افغانستان جائے کیونکہ اس صورت میں اسے یہ موقع ملے گا کہ وہ ایک نیا ملک دیکھ سکے گا۔ متوقع جنگ میں حصہ لے کر تجربہ حاصل کرسکے گا اور اس طرح وہ خود کو دوسروں سے ممتاز کر سکے گا۔

میں نے اس کو بتایا کہ میں انگریزوں سے زیادہ افغانوں کے کردار اور ان کی عادات و اطوار کے بارے میں جانتا ہوں۔ اس لئے میں خود نہ تو پیسے کے لئے اور نہ کسی جذبہ کے تحت اپنی زندگی خطرے میں ڈالنا پسند کروں گا۔ جہاں تک اس مہم کا تعلق ہے تو اس کی کامیابی کے امکانات مجھے بہت کم نظر آتے ہیں۔ اس لئے میری یہ عاجزانہ درخواست ہے کہ وہ اس وقت افغانستان نہ جائے جب تک کہ اسے حکم نہ دیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ افغانستان گیا تو اپنے جذبہ' اور بہادری کی وجہ وہ پہلا قربانی دینے والا ہوگا۔

یہ سن کر وہ استہزا کے ساتھ مسکرایا اور کہنے لگا: "میرے دوست زندگی ایک لاٹری ہے۔ ایسے زندہ رہنے کا کیا فائدہ کہ جب تم اپنی موت سے خود کو اور درسروں کو فائدہ پہنچا سکو۔"

اگرچہ اس سوال کا بہترین جواب میری زبان پر تھا' لیکن میں نے مزید بحث کرنا مناسب نہیں سمجھی۔ اس لئے میں نے اس کو وہیں ختم کرتے ہوئے' دوسری باتیں شروع کردیں۔ بہرحال یہ ہم دونوں کی خوش قسمتی تھی کہ اس کی خدمات کی بالائے سندھ میں اشد ضرورت تھی' اس لئے اس نے افغانستان جانے کے بارے میں پھر نہیں سوچا۔

12 تاریخ کو فوج کی ایک ڈویژن سرجان کین کی سربراہی میں قندھار کی طرف روانہ ہوئی جبکہ دوسری ڈویژن اس وقت رکی رہی کہ جب تک سامان کے لئے گاڑیوں کا بندوبست نہ ہو جائے۔

اسی شام کو ہم بھی فوج کے رخصت ہوئے اور شکارپور جاتے ہوئے راستے میں جوہرپور کے گاؤں میں رات گزاری۔ ہماری حفاظت کے لئے ایک ہندوستانی افسر کی معیت میں گارڈ تھا کہ جس میں تئیس سپاہی تھے۔

13 تاریخ کی صبح ہم نوڈیرو پہنچے۔ راستہ اچھا ہے اور تمام علاقہ زرخیز ہے۔ گاؤں کے اردگرد کھجور اور آم کے درخت ہیں۔ جن کی وجہ سے منظر بڑا خوبصورت لگتا ہے۔ ہم ایک چھوٹے باغ والے گھر میں ٹھہرے۔ نوڈیرو ایک بڑا گاؤں ہے اور یہ میر' میر محمد کی ملکیت میں ہے۔ اس کا انتظام محمد خاں سیال (گیڈر) کے ذمہ ہے کہ جو ایک بوڑھا پرمذاق شخص ہے۔ ان لوگوں کو کھجور کے درخت سے تیل نکالنے کا فن نہیں آتا ہے۔ یہاں پر کھانے پینے کی اشیاء بہت سستی ہیں۔ میں نے دو مرغیاں صرف چار پیسوں میں خریدیں۔ اس قسم کی مرغیاں آپ کو لندن میں دو شلنگ کی ملیں گی اسی طرح سے دوسری چیزیں بھی مقابلتاً" سستی تھیں۔

14 تاریخ کی صبح کو ہم گوہج پہنچے جوکہ میر نصیر خاں کی جاگیر ہے۔ یہ گاؤں نوڈیرو سے زیادہ بڑا ہے۔ اس گاؤں کے کافی لوگ یہاں سے اس لئے چلے گئے کہ بنگالی فوج کا گزر اس طرف سے ہوا تھا۔ لیکن ہمیں یہاں بھی جس چیز کی ضرورت تھی وہ نوڈیرو کی طرح سستی مل گئی۔

15 تاریخ کو سولہ میل چلنے کے بعد ہم نو بجے صبح شکارپور پہنچے۔ یہ سندھ کا سب سے بڑا شہر ہے۔ ان میں تقریباً پندرہ ہزار مکانات ہیں۔ ان میں سے کچھ دو منزلہ ہیں' اور باقی ہموار چھتوں والے۔ شہر کے گرد مٹی کی فصیلیں ہیں۔ شہر کے باہر ایک قلعہ ہے۔ اس کے اردگرد کا ماحول بڑا خوبصورت ہے کیونکہ اس کے چاروں طرف کھجور اور آم کے درخت ہیں۔ پانی کنوؤں سے آتا ہے۔ اس کی زمین پوست اور سن کی کاشت کے لئے بہترین معلوم ہوتی ہے کیونکہ ہم نے ان کے کھیت چاروں طرف عمدہ حالت میں دیکھے۔ اس کی آدھی آبادی کا تعلق ہندوؤں سے ہے جو کھتری یا لوہانہ ذاتوں کے ہیں۔ آدھی آبادی مسلمانوں کی ہے۔

شکارپور کی مارکیٹ بڑی خوبصورت ہے۔ سورج کی گرمی سے بچنے کے لئے اس پر چھت پڑی ہوئی ہے۔ اس جگہ کے ہندو تاجر اپنی سندھی زبان کے علاوہ فارسی اور پشتو بھی خوب بوتے ہیں۔ ہم نے اپنے خیمے شہر کے نزدیک لگائے۔ فوج کے ساتھ جانے کی وجہ سے جو تھکن ہوگئی' اس کو یہاں پر تنہائی اور خاموشی میں آرام کرتے اور لطف اٹھاتے ہوئے

ختم کیا۔

16 تاریخ کی صبح کو میں کیپٹن ایسٹ وک کی معیت میں شہر گیا۔ اس نے شہر کا دورہ کیا۔ مارکیٹ اور قلعہ کی اچھی طرح سے جانچ پڑتال کی۔ اس کے بعد وہ ایک جرمن قیدی کو دیکھنے چلا۔ یہاں میں نے پہلی مرتبہ کسی کو فرانسیسی زبان بولتے ہوئے سنا۔

17 تاریخ کی صبح کو میں نے بنگال رجمنٹ کی بقیہ دو دستوں کو دیکھا اور یہاں کے خاص بازار' صدری بازار کی سیر کی۔ یہاں پر یہ سن کر افسوس ہوا کہ کافی لوگ اور جانور صحرا میں پانی نہ ہونے کی وجہ سے مر گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کے ہر شعبہ میں بے ترتیبی اور افراتفری تھی۔ سر' اے برنز' بالائی سندھ کے سابق پولٹیکل ایجنٹ نے حکومت کی ایک بڑی رقم بغیر کسی حساب کتاب کے خرچ کردی۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا تھا کہ جب ہمارے لوگ مارے نہ جائیں یا زخمی نہ ہوں۔ بلوچ لٹیرے جب بھی موقع ملتا تو ہمارے اونٹ بھگا لے جاتے تھے۔

اس صبح کو دو بااثر ہندو سیٹھوں نے' جن کے نام چترومل اور جیٹھ سنگھ تھے' کیپٹن ایسٹ وک سے ملاقات کی۔ ثانی الذکر بڑا خوبصورت' حالات سے واقف اور بڑا مہذب شخص تھا۔ اس کی بہن' جو سندھ کی سب سے زیادہ خوبصورت عورت ہے' اسے شاہ شجاع نے زبردستی اٹھوا لیا۔ اس وجہ سے وہ اور اس کا پورا قبیلہ اس کے نام سے نفرت کرتا ہے۔

18 مارچ کو ہمارا ارادہ آگے جانے کا تھا' مگر رات کو اس قدر سخت بارش ہوئی کہ ہمارے خیمے بھیگ گئے۔ اس لئے مجبوراً ہمیں اس وقت تک انتظار کرنا پڑا کہ جب تک یہ خشک ہو جائیں۔

ایک معمولی سی لڑائی بنگال کی اس رجمنٹ اور بلوچی لٹیروں سے ہوئی کہ جن کے ذمہ اونٹوں کی رکھوالی تھی۔ ان کی مدد لکی گاؤں کا ایک شخص عبدالصمد خاں کررہا تھا۔ بلوچوں نے حسب دستور اونٹوں کو بھگانے کی کوشش کی۔ اس لڑائی میں ' تین ڈاکو زخمی ہوئے' ایک مارا گیا۔ اس کا سر کاٹ کر کیپٹن ایسٹ وک کے سامنے لایا گیا تاکہ ہماری فوج کی بہادری کا عمل ثابت ہو۔

کسی انسان کے چہرے کو خون و گرد میں آلودہ دیکھنا انتہائی بھیانک اور قابل نفرت چیز تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کس طرح سے اپنے دنیاوی اور مادی فوائد کی خاطر قانون فطرت کو توڑتا ہے اور اس قسم کے ظالمانہ فعل سے خود کو انسانیت سے گراتا ہے۔

19 تاریخ کو ہم شکار پور سے سکھر کے لئے روانہ ہوئے اور چھ میل چلنے کے بعد

محبوب جوگوٹھ پہنچے۔ راستہ میں ہم لکی گاؤں سے گزرے۔ یہ ایک بڑا گاؤں ہے اور میر نور محمد کی جاگیر میں ہے۔ گھنے جنگل میں راستہ اچھا بنا ہوا ہے' راستہ بھولنے کا اس لئے سوال پیدا نہیں ہوا' کیونکہ اس کی دونوں جانب مرے ہوئے اونٹ پڑے ہوئے تھے لہٰذا اس صورت محال میں بہترین رہنمائی ان کی بدبو تھی۔

20 تاریخ کو ہم سکھر پہنچے جو کہ محبوب جوگوٹھ سے بیس میل کے فاصلہ پر ہے۔ ہم صبح چھ بجے روانہ ہوئے تھے اور آٹھ بجے یہاں پہنچ گئے۔ سکھر ایک بڑا شہر تھا مگر اب یہ ویران ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ اس کی بربادی کی وجہ وہ آخری لڑائی تھی جو شاہ شجاع اور خیرپور کے میروں کے درمیان لڑی گئی۔ اس کے نتیجہ میں اس شہر کو جو نقصان پہنچا اس کی تلافی اب تک نہیں ہو سکی۔ ہے۔ سکھر کا شہر دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر ہے۔ روہڑی جو کہ ایک آباد شہر ہے وہ بائیں کنارے پر ہے۔ بھکر کا قلعہ دریا کے بیچ میں ایک چھوٹے سے جزیرے پر ہے۔ اس قلعہ کے ناقابل تسخیر ہونے کے بارے میں فارسی و سندھی مورخوں نے بڑی تعریف کی ہے۔ اسی وجہ سے یہ برطانوی حکومت کے حوالہ کردیا گیا تھا کہ وہ یہاں افغانستان کی مہم کے خاتمہ تک اپنا سامان رکھیں۔ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے ہی اندازہ لگا لیا تھا' اس سامان کو دوبارہ سے حاصل کرنا مشکل ہو گیا۔

21 تاریخ کو مجھے یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ میں خیرپور کے وزیر فتح محمد خاں غوری سے ملاقات کروں۔ جو کہ روہڑی کے قریب آکر خیمہ زن ہوا تھا۔ اس کو میران خیرپور کی جانب سے کہا گیا تھا کہ وہ سکھر اور شکارپور کے درمیان جو بلوچ ڈاکو ہیں ان کا قلع قمع کرے۔

وہ اسی سال کا بوڑھا ہے' لیکن اس کا جذبہ و جوش و توانائی نوجوانوں سے زیادہ ہے۔ مقامی معاملات میں اس کا ذہن صاف ہے۔ وہ بڑا تجربہ کار ہے اور ملک کا انتظام انتہائی خوش اسلوبی سے کر رکھا ہے۔ اس لئے حکمران اور رعیت دونوں اس سے خوش ہیں۔ اس نے میرا خوش دلی سے استقبال کیا۔ خیروعافیت پوچھنے کے بعد میں نے اس سے بلوچ ڈاکوؤں کے بارمیں بات چیت کی۔ اس نے کہا کہ بلوچوں کی لوٹ مار غیرملکیوں سے زیادہ خود مقامی باشندوں کے لئے پریشانی کا باعث ہے۔ اس لئے اس نے فیصلہ کیا ہے کہ ان کی سرکوبی کرے۔ تاکہ ڈکیتیوں کا بالکل خاتمہ ہو سکے۔ میں نے اس سے کہا کہ میرے آقا کی سفارش ہے کہ ان لوگوں کو سزا دی جائے مگر ان کا قتل عام نہ کیا جائے۔

جب میں نے اس کی فوج کے بارے میں سنا تو میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا' کیونکہ یہ فوج پینتالیس پیدل اور ایک سو پچاس سواروں پر مشتمل تھی۔ گھوڑے انتہائی لاغر اور مریل

تھے۔ بوڑھے آدمی نے میری مسکراہٹ کا مطلب سمجھ لیا اسی لئے کہنے لگا: ”میرے سپاہیوں اور گھوڑوں کو حقارت سے مت دیکھو۔ وہ موٹے نہیں ہیں، مگر اس ملک میں جنگ لڑنے کے لئے بہترین ہیں۔ یہ تین دن تک بھوک و پیاس کو برداشت کرسکتے ہیں۔ تمہارے صحت مند فوجیوں اور موٹے گھوڑوں میں یہ خوبی نہیں ہے۔ وہ اتنی تیزی سے ڈاکوؤں کا مقابلہ پہاڑیوں، وادیوں اور میدانوں میں نہیں کرسکتے ہیں، جس قدر کہ میرے آدمی۔“

میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ اس بوڑھے شخص کے جذبات کو مجروح کروں کہ جس کا پوتا بھی مجھ سے زیادہ عمر والا تھا۔ میں نے اس کو یقین دلایا کہ میں اس کے سپاہیوں کی بہادری اور شجاعت پر پورا پورا بھروسہ رکھتا ہوں اور میں معافی چاہتا ہوں اگر میری مسکراہٹ سے اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچی ہو۔ میں نے کہا کہ میری یہ عادت اس وجہ سے ہوگئی ہے کیونکہ میں ایک طویل عرصہ سے انگریزوں کی صحبت میں رہا ہوں۔ اس کے بعد ہم دو دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔ اس نے وعدہ کیا کہ جب کل وہ کیپٹن ایسٹ وک سے ملاقات کے لئے آئے گا تو مجھ سے دوبارہ ملے گا۔

23 کو وہ ہمارے کیمپ میں آیا پولیٹیکل ایجنٹ اس کی ملاقات سے بہت خوش ہوا۔

دریا کے کناروں پر اناج کے ڈھیر دس یا بارہ دن سے پڑے ہوئے تھے جن کو وقت پر وہاں سے نہیں ہٹایا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رات دریا میں اس قدر زوردار سیلاب آیا کہ وہ اس ڈھیر کو بہا لے گیا۔ سیلاب کی شدت کی وجہ سے سکھر اور روہڑی کے درمیان کشتیوں کا پل بھی ٹوٹ گیا۔ جب کیپٹن ایسٹ وک فتح غوری سے ملا تو اس کے وزیر سے ازراہ مذاق کہا کہ یہاں کا دریا بھی بلوچی لٹیروں کی طرح ہے۔ اس نے بھی رات کو اناج کے ڈھیر کو غائب کردیا۔ اس پر وزیر نے برجستہ جواب دیا کہ اس کے برعکس دریا نے ہمیں دوستانہ پیغام دیا ہے اور تنبیہہ کی ہے کہ جب ہم غیرملک میں ہوں تو قطعی لاپروائی اختیار نہ کریں اور ہمیشہ چوکس رہیں۔

25 تاریخ کو ہم دریا عبور کرکے روہڑی میں داخل ہوئے۔ ہمارا کیمپ ایک باغ میں تھا کہ جہاں سے ہم دریا کے دونوں کناروں اور بیچ دریا میں قلعہ کے خوبصورت منظر کو دیکھ سکتے تھے۔

28 تاریخ کو ہم روہڑی سے خیرپور کے لئے روانہ ہوئے۔ صبح ہم جلدی چلے اور آٹھ بجے وہاں پہنچ گئے۔ یہ فاصلہ کوئی پندرہ میل کا ہوگا۔ علی محمد نام کا ایک افسر شہر سے تین میل کے فاصلہ پر ہمارے استقبال کے لئے آیا۔ ہم نے اپنا کیمپ ایک احاطہ میں لگایا جس

میں کہ ایک چھوٹا گھر تھا۔ مستقبل میں یہ ان یورپی لوگوں کی رہائش ہو سکتا ہے کہ جو میر کے دربار میں آئیں گے۔

ابھی پولٹیکل ایجنٹ نے ناشتہ ختم ہی کیا تھا کہ دو اعلیٰ عہدیدار امانند وکیل اور جیٹھ مل دیوان آگئے جنہیں میر نے اس کی خیریت دریافت کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ کیپٹن ایسٹ وک نے ان دونوں کا خوش دلی سے استقبال کیا اورانہیں بتایا کہ وہ یہاں ایک دن سے زیادہ نہیں رہے گا۔ اس لئے اس کی خواہش ہے وہ ہزہائی نس سے جب بھی ان کو فرصت ہو' جلد ہی ملاقات کرلے۔ وہ اس پیغام کو لے کر فوراً چلے گئے۔ شام کو عنایت اللہ خاں' بوڑھے وزیر کا لڑکا' اور جان محمد معہ اپنے حفاظتی دستے کے آئے اور اسے اپنے ساتھ محل لے گئے۔

محل میں پہنچنے پر میر رستم خاں مسند سے اٹھ کر ایشیا کی رسم کے مطابق پولٹیکل ایجنٹ سے بغل گیر ہوا۔ دربار کا ہال حیدر آباد کی طرح سے خالی خالی تھا لیکن یہاں پر لوگوں کا ہجوم کم تھا۔ پولیٹکل ایجنٹ بھی میر کے ساتھ فرش پر بیٹھ گیا۔ دربار میں مندرجہ ذیل امرا تھے۔

میر زنگی خاں' میر کا چچا' میر ناصر خاں' اس کا بھتیجا' میر مبارک' بیس بلوچ سردار' اور دو ہندو عہدیدار جو صبح ملاقات کے لئے آئے تھے۔ اس کانفرنس کا مقصد' جیساکہ مجھے بعد میں معلوم ہوا' یہ تھا کہ ہزہائی نس سے کہا جائے کہ وہ بلوچ ڈاکوؤں کو کچلنے کے لئے جلد ہی کوئی مناسب قدم اٹھائیں۔ میر رستم نے وعدہ کیا کہ وہ جو کچھ کر سکتا ہے وہ کرے گا۔ اس نے خود کو انگریزوں کا ایک ادنیٰ مگر وفادار خادم ثابت کرنے کی کوشش کی۔

امیر کی عمر کافی معلوم ہوتی تھی۔ شاید ساٹھ سال کے قریب کا ہو' وہ ایک خوبصورت شخص تھا اور گفتگو سے معلوم ہوا کہ اسے آنے والے حالات کا اندازہ تھا۔ وہ اونچے خیالات رکھتا تھا' اور پکا مذہبی تھا۔ اس کے لڑکوں کی تعداد آٹھ تھی۔

خیرپور ایک بڑا شہر ہے۔ محل مٹی کے بنے قلعہ درمیان کے میں واقع ہے۔ دوسرے دن دوپہر کو ایک اور دربار منعقد ہوا۔ جہاں پولٹیکل ایجنٹ کا پوری رسومات کے ساتھ استقبال کیا گیا۔ اس دوران میں ہلکی پھلکی گفتگو ہوئی' جس میں اہم معاملات بھی زیرغور آئے۔ یہ سلسلہ ایک گھنٹہ تلک چلا جس کے بعد دربار برخاست ہوگیا۔ رخصت ہوتے وقت جبکہ کیپٹن ایسٹ وک امیر کو خدا حافظ کہنے والا تھا کہ امیر نے اس سے کہا: "اب میں تم سے ایک دوست کی حیثیت سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں تمہاری عزت دوسرے اور

انگریزوں کے مقابلہ میں زیادہ کرتا ہوں کیونکہ تم سے بات کرکے واقعی مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ تم ایک اچھے عیسائی ہو اور تمہارا دل اتنا ہی صاف ہے جیسے کہ آئینہ۔ اس لئے میں تمہیں اپنے لڑکوں میں سے ایک سمجھتا ہوں۔"

یہ سن کر کیپٹن ایسٹ وک نے ادب سے سر جھکایا اور اس کا مناسب جواب دیا۔ اس کے بعد ہم دربار سے کیمپ کے لئے روانہ ہوگئے۔ اس کے ہم جب ہم نے اپنا روزمرہ کا کام ختم کرلیا تو امیر کے پاس ایک بار اور رخصت ہونے گئے۔ آدھ گھنٹے کی بات چیت کے بعد ہم نے نیک تمناؤں کے ساتھ رخصت لی۔

30 تاریخ کو ہم خیرپور سے سکھر کے لئے روانہ ہوئے۔ جہاں صبح کو نو بجے پہنچے۔ چونکہ اس بار ہمیں جلدی نہیں تھی' اس لئے ہم نے آہستہ آہستہ آرام سے سفر کیا۔ راستہ میں میں نے دیکھا کہ سڑک کے دونوں کناروں پر تیز پات کے بے شمار درخت تھے۔ اس کے پھول گہرے پیلے رنگ کے اور خوبصورت تھے۔ یہ درخت سبز پتوں' پیلے پھولوں اور پھلیوں سے لدی شاخوں کی وجہ سے بے انتہا دلکش دکھائی دیتے تھے۔ اس درخت کے اندر میٹھا گودا ہوتا ہے جس کی ایک خاص خوشبو ہوتی ہے۔ ایران و ہندوستان کے حکیم اسے دوا کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اگر اس کے ایک اونس گودہ کو گرم پانی میں ملا کر بادام کے تیل کے ساتھ استعمال کیا جائے تو اس سے معدہ صاف ہو جاتا ہے۔ سندھی اس کی خوبی سے واقف نہیں ہیں ورنہ وہ اس کو بمبئ اور دوسری جگہوں میں برآمد کرکے منافع بخش تجارت کرسکتے تھے۔

2 اپریل 1839ء کو ہمیں حکم ملا کہ ہم شکار پور جانے کی تیاریاں کریں۔ اس دوران میں مجھ پر کام کا اس قدر بوجھ تھا کہ میں سورج نکلنے سے غروب ہونے تک اپنی ڈیسک پر بیٹھا رہتا تھا۔ لہٰذا مجھے ذرا بھی وقت نہیں مل سکا کہ میں باہر نکلتا اور اس علاقہ کی سیر کرتا۔ بڑی مشکل سے میں نے ایک دن ایک گھنٹہ کے لئے خود کو فارغ کیا اور اس جگہ کے مشہور بزرگ شاہ خیرالدین کے مزار کی زیارت کی۔ مقبرہ تعمیر کا بہترین نمونہ ہے' اسے 1029ھ یعنی 1619ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔

تین تاریخ کو ہم نے سکھر چھوڑا اور تین بار ٹھہرنے بعد شکارپور پہنچے۔ یہاں پر ہم نے حالات کو بہت زیادہ خراب دیکھا۔ بلوچ ڈاکوؤں کی اس قدر ہمت بڑھ گئی تھی کہ وہ روز شہر کے اطراف میں آتے اور غریب شتربانوں کو زخمی کرتے یا مار ڈالتے تھے۔ یہی سلوک وہ ان چوکیداروں کے ساتھ کرتے تھے کہ جو چراگاہوں کی حفاظت پر تھے۔ ہمارے سپاہی ان سے

مقابلہ کرنے میں اس لئے ناکام تھے کہ انہیں اس علاقہ کی جغرافیہ کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا۔ لمبے تڑنگے، صحت مند اور خوبصورت بنگالی ظاہر میں تو اچھے تھے، مگر اندرونی طور پر وہ مقابلہ کی صلاحیتوں سے محروم تھے۔

یہاں پر میں ان کی بہادری کی ایک مثال دیتا ہوں۔ اس مہینہ کی چھ تاریخ کو انتالیس اونٹ کہ جن کا تعلق حکومت سے تھا جن کی نگرانی ایک نائک اور پانچ سپاہیوں کے ذمہ تھی، انہیں دس بلوچی ڈاکوؤں نے دوپہر کے وقت آکر پکڑ لیا۔ لڑائی میں دو شتربانوں کو تلوار کے زخم آئے۔ زخموں کے خون کو دیکھ کر بقیہ بھاگ کر ایجنسی پہنچے۔ بعد میں ایک نان کمیشنڈ افسر پولٹیکل ایجنٹ کے سامنے پیش ہو کر کہنے لگا کہ "سر انتالیس اونٹوں کو ابھی ابھی بلوچ ڈاکو لے گئے ہیں، سر، دو شتربان زخمی ہوگئے ہیں۔ اس کے علاوہ سر، سب خیریت سے ہیں۔"

اس رپورٹ کو سن کر مجھ پر ہنسی کا اس قدر زور دار دورہ پڑا کہ کمرے سے اٹھ کر باہر آگیا۔ یہاں میں نے اس گفتگو کو سنا کہ جو نائک اور پولٹیکل ایجنٹ کے درمیان ہوئی تھی:

پولٹیکل ایجنٹ: ڈاکوؤں کی تعداد کتنی تھی؟

نائک: وہ دس تھے۔ لیکن ہم نے ان کے پیچھے گرد کا غبار دیکھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے ساتھ اور لوگ بھی ہیں۔

پولٹیکل ایجنٹ: تم نے ان پر فائر کیوں نہیں کیا؟

نائک: کیونکہ اس وقت ہم درخت کے نیچے کھانا پکانے میں مصروف تھے۔ یہاں سے ہم نے زخمی لوگوں کو بھاگتے ہوئے دیکھا۔ اس لئے ہم بھی بھاگ کر آپ کے پاس آگئے۔

پولٹیکل ایجنٹ: تم بڑے اچھے سپاہی ہو۔

نائک: اس عزت افزائی پر آپ کا شکریہ۔ میں نے اپنا فرض ادا کردیا۔

پولٹیکل ایجنٹ: شکریہ - میرا خیال ہے کہ میں تمہارا اس غیرفوجی رویہ پر کورٹ مارشل کروں۔

نائک: تب میں اپنی بدقسمتی پر روؤں گا کہ میں نے اپنی وفاداری کے بدلہ جناب سے یہ انعام پایا۔

پولٹیکل ایجنٹ: اب یہاں سے ایک لفظ کہے بغیر چلے جاؤ، اور دیکھو دوبارہ سے مجھے اپنی شکل مت دکھانا۔ اپنا چہرہ دوسری طرف کرو، اور مارچ ٹو دی لائنز۔

میں نے دیکھا کہ اس موقع پر کیپٹن ایسٹ وک کو غصہ آگیا۔ بارہ سال کی طویل رفاقت میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے انہیں اس حالت میں دیکھا۔ اس کے بعد انہوں نے فوراً بنگال فوج کے نور بخش رسالدار کو حکم دیا کہ وہ سپاہیوں کو لے کر ڈاکوؤں کا پیچھا کرے۔ باوجود کوشش کے ان کا کوئی نام و نشان نہیں ملا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے انہیں، اونٹوں اور دوسرے سامان کو زمین نے نگل لیا ہے۔ ہماری بدقسمتی میں اس وقت اور اضافہ ہوگیا کہ جب گرمی بڑھی، اور گرم ہوائیں چلنی شروع ہوئیں۔ ہمیں اب یہ احساس ہوگیا کہ اگر کوئی ہمیں تباہ نہیں کرسکے گا تو یہ کام گرمی ضرور کردے گی۔ میری چھوٹی سی رہائش گاہ کا درجہ حرارت دوپہر میں 110 تک پہنچ گیا تھا جوکہ شام کی ٹھنڈک میں جاکر 90 ہوا۔ آدھی رات کے بعد جب ٹھنڈی ہوا چلنی شروع ہوئی تو کچھ سکون ملا، لیکن اس کے علاوہ سارے وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے جہنم کی کھڑکی کھول دی گئی ہو۔ اگر سورج کی تپش میں زیادہ رہا جاتا۔ تو اس کے نتیجہ میں موت قطعی تھی۔ اچھے خاصے صحت مند لوگوں کو ایک دن میں نے رخصت ہوتے دیکھا ہے اور دوسرے روز ان کی موت کی خبر سنی ہے۔ یہاں کے مقامی لوگ اور بلوچ اس گرمی کو برداشت کر لیتے ہیں۔ سورج کی اس تیز روشنی میں وہ صبح سے شام تک بغیر کھائے پیے چلتے ہیں۔ یہ ہم لوگوں کے لئے جو ہندوستان میں رہتے ہیں، ناممکن ہے۔ یورپین کے لئے تو اس کو برداشت کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جب یہ گرمی مجھ سے زیادہ برداشت نہیں ہوئی تو میں نے خس کی ٹٹیاں تیار کرائیں اور ایک بہشتی کو اس کام پر ملازم رکھا کہ وہ اس پر صبح سے شام تک پانی چھڑکتا رہے۔ اس کی وجہ سے مجھے کافی آرام ہوگیا۔

گیارہ تاریخ کو صبح میں، میں نے اپنے ملازم لڑکے سے کہا، وہ میرا بستر جھاڑ کر سورج کی روشنی میں رکھ دے تاکہ بستر میں جو نمی ہو وہ سوکھ جائے۔ جیسے ہی بستر سے کمبل کو اٹھایا گیا تو میں نے دیکھا ایک بڑا بچھو اس کے نیچے سے برآمد ہوا۔ اس سے پہلے میں نے اتنا بڑا بچھو نہیں دیکھا تھا۔ اس کا پورا جسم کالا تھا جس پر بال ہی بال تھے۔ گہرے سبز رنگ کے اس کی دم پر اور سرخ رنگ کے اس کے ڈنک پر۔ اس بھیانک منظر سے میں، اور میرا ملازم دہشت زدہ ہوکر رہ گئے۔ اسی دوران میرا ایک افغان دوست جس کا نام عطا محمد خاں کاکڑ تھا، جو اس شہر کا رہنے والا تھا، وہ مجھ سے ملنے آگیا۔ اس نے اس کو دیکھ کر کہا: ''لطف اللہ تم خوش قسمت ہو کہ تم موت کے منہ سے بچ نکلے۔ یہ خبیث کیڑا جیرارا کہلاتا ہے۔ اسکا ڈنک زندگی کا فوراً خاتمہ کر دیتا ہے۔ لہٰذا تمہیں خدا تعالیٰ کا شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ جس

نے تمہیں بستر کے اس ساتھی کے ہلاکت زدہ ڈنک سے بچایا۔"

"مجھے اس کیڑے کا کوئی ڈر نہیں" میں نے جواب دیا "یہ مجھے اس وقت تک نہیں کاٹ سکتا ہے جب تک کہ میری قسمت میں اسے کاٹنا نہ لکھا ہو۔" یہ کہہ کر میں نے اس کو مٹی کے ایک برتن میں رینگتے ہوئے اندر کیا اور پھر اس کے منہ کو بند کردیا۔ اس کے بعد آگ جلا کر اس پر اس برتن کو ایک گھنٹہ تک رکھا جس سے وہ راکھ میں بدل گیا۔ اس راکھ کو بطور دوا درد قولنج میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ اس کی تکلیف کے لئے آزمودہ نسخہ ہے۔

مجھے بتایا گیا کہ شکار پور اور اس سے متعلقہ علاقوں کا سالانہ ریونیو تقریباً تین لاکھ روپیہ ہے۔ اس کو سات حصوں میں تقسیم کردیا جاتا ہے۔ چار حصے حیدر آباد کے دو میروں کو جاتے ہیں' (میر نور محمد اور میر نصیر محمد) باقی تین خیرپور کے میر لے لیتے ہیں۔ تین میں سے ایک حصہ میر مبارک کا ہے جب کہ باقی دو میر رستم کے۔ میران حیدر آباد نے اپنا حصہ سیٹھ جیٹھ مل کو چودہ ہزار سالانہ کے ٹھیکہ پر دے دیا ہے۔ سیٹھ جیٹھ مل شراب کا کاروبار کرتا تھا۔ اپنی دولت' صلاحیت اور لیاقت کی وجہ سے اس نے ترقی کی اور اس بلندی تک پہنچا۔ یہ ایک لمبا تڑنگا اور موٹا شخص ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شام کے کھانے میں ایک بکری اور ایک برانڈی کی بوتل ہضم کر جاتا ہے۔

خیرپور اور اس کے متعلقہ علاقوں کے ریونیو کے بارے میں میرے بنکر دوست جیٹھ سنگھ نے بتایا کہ یہ پانچ لاکھ سالانہ ہے۔ اس آمدنی کو پانچ حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ تین میر رستم کو جاتے ہیں' ایک میر مبارک کو اور باقی خاندان کے دوسرے اراکین میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

12 تاریخ کی صبح کو کیپٹن ایسٹ وک کو خبر ملی کہ بلوچ ڈاکوؤں کی ایک جماعت تیس میل کے فاصلہ پر گھات میں ہے کہ فوج پر بے خبری میں حملہ کرے۔ یہ سن کر وہ دوپہر کو بیس سواروں کے ساتھ ان کے تعاقب میں روانہ ہوگیا اور جہاں ان کا قیام تھا وہاں دوسرے دن صبح پہنچ گیا۔ یہاں پر اس نے راکھ کے ڈھیر دیکھے' جسکا مطلب تھا کہ انہوں نے رات کو یہاں کھانا پکایا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے گھوڑوں کی لید بھی وہاں پڑی ہوئی تھی۔ چونکہ راکھ ٹھنڈی ہو چکی تھی' اور لید بھی خشک ہوگئی تھی۔ اس سے یہ اندازہ لگایا گیا کہ یہاں سے انہیں گئے ہوئے چھ یا سات گھنٹے ہوئے ہوں گے۔ اپنی اس ناکامی کے بعد وہ شام کو تھکا ہارا واپس آیا۔

ان حالات میں اس نے یہ ضروری سمجھا کہ مقامی لوگوں پر مشتمل ایک فوج تیار کی جائے کہ جو ان ڈاکوؤں سے مقابلہ کرے' اپنے اس منصوبہ کی اطلاع اس نے حکومت کو دی اور اس پر عمل در آمد کے لئے اجازت مانگی۔ چونکہ اس کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا' اس لئے اس نے حکومت کی اجازت کے بغیر ہی' اپنی ذمہ داری پر بلوچیوں کو بھرتی کرنا شروع کردیا۔ اس نے خاص طور سے دو بلوچ قبیلوں کھوسہ اور کاہیری کو اس مقصد کے لئے منتخب کیا کیونکہ ان کے تعلقات ان بلوچ قبائل سے کشیدہ تھے کہ جو ڈکیتیوں میں ملوث تھے۔ وہ قبائل یہ ہیں: ڈومکی' جھکرانی' بگتی' مری' مزاری' لغاری' بروی' رند اور بروہی۔

پہلا سردار جس کو ملازمت میں لیا گیا اس کا نام خیر بخش کھوسہ تھا۔ پچیس سال کا ایک خوبصورت نوجوان جس کے پاس پچاس گھڑسوار تھے۔ اس کو ان تمام کھوسہ اور ان لوگوں کی کمانڈ دی گئی کہ جو اس کے ذریعہ سے بھرتی ہوئے تھے۔ اسموقع پر میرے ذمہ ایک مشکل کام تھا کہ چونکہ مجھے ہر اس وحشی انسان کا نام اور اس کی شکل لکھنی پڑتی تھی' لہٰذا مجھے ان کے چہروں اور شکل و صورت اور ان کے نمایاں نشانات کو غور سے دیکھنا پڑتا تھا' جس کی وجہ سے ان میں سے کچھ میرے اوپر زور زور سے ہنستے تھے۔ ان میں سے کچھ نے تو مجھے جادوگر سمجھنا شروع کردیا اور میرا امتحان لینے کی غرض سے کہ کیا میں ان کا نام اپنے رجسٹر میں دیکھ کر بتا سکتا ہوں یا نہیں' وہ آدھ گھنٹے بعد آتے اور پوچھتے کہ کیا ان کا نام لکھا ہوا ہے یا نہیں۔ جب میں رجسٹر میں دیکھ کر ان کا نام بتاتا تو حیرت سے ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ جاتے تھے۔ ان کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ ان کی عمر کیا ہے؟ وہ لوگ کے جن کی داڑھیوں میں سفید بال آگئے تھے اس پر اصرار کرتے تھے کہ ان کی عمر پچیس یا تیس سال ہے۔ جب ان میں سے ایک سے میں نے پوچھا کہ کیا اسے معلوم ہے کہ آخری کلہوڑہ حکمران کو میر فتح علی خان نے سندھ سے کب نکالا تھا تو اس نے فوراً کہا: "چند سال پہلے کی بات ہے۔ اس وقت میں لڑکا تھا اور مویشیوں کو چرانے کے لئے معہ اپنی غلیل کے چراگاہ میں جاتا تھا۔"

اس کی اس حماقت پر میں اپنی ہنسی ضبط نہیں کرسکا' کیونکہ یہ واقعہ 1799ء میں ہوا تھا۔ اس حساب سے اس وقت اس کو پورے ستر سال کا ہونا چاہئے تھا جبکہ وہ اصرار کررہا تھا کہ اس کی عمر چالیس سال ہے۔ اس کو میری ہنسی پسند نہیں آئی۔ لہٰذا میرے ہاتھ کو پکڑتے ہوئے کہنے لگا کہ:

"میرے دوست! دیکھنے میں تو تم صحیح العقیدہ مسلمان نظر آتے ہو لیکن چونکہ تم ایک

طویل عرصہ سے ان کافر فرنگیوں کے ساتھ ہو' اس لئے تمہارا ضمیر مرچکا ہے اور تم اپنے مسلمان بھائیوں کی بات پر یقین کرنے پر تیار نہیں ہو۔"

میں نے فوراً اس سے معافی مانگی اور کہا کہ اسے میری ہنسی پر ناراض نہیں ہونا چاہئے کیونکہ بدقسمتی سے میری یہ عادت ہے۔ ورنہ جہاں تک میرا تعلق ہے میں اپنے مسلمان بھائی کی ہربات پر یقین کرنے کو تیار ہوں۔

26 تاریخ کو ہمارے جاسوس نے آکر اطلاع دی کہ شہر میں ایک مشتبہ ایرانی آیا ہوا ہے۔ ہم فوراً اس سے ملنے کے لئے گئے اور دیکھا کہ اس کی رہائش گاہ پر دو اونٹ سامان لئے کھڑے ہیں۔ جبکہ اس کے ملازم سفر کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ تفتیش کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ وہ ایک شریف شخص ہے اور اس نے لوگوں سے مختلف موضوعات پر بات کرنا پسند نہیں کیا' اس لئے اس کے بارے میں غلط رائے قائم ہوئی۔ ہمارے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ ایک درویش ہے۔ اس کا نام نور شاہ ہے اور اس کا دنیاوی معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن پولٹیکل ایجنٹ نے ان سے کہا کہ جب تک وہ اس ملک میں آنے کی قابل اطمینان وجوہات نہیں بتائے گا' وہ خود کو ایک قیدی تصور کرے۔ ان الفاظ کو سن کر وہ حیران و ششدر رہ گیا اور ایک ایرانی کی مانند فصیح و بلیغ فارسی میں اس نے احتجاج کرنا شروع کردیا۔ لیکن اس کی خوبصورت زبان کا کوئی اثر نہیں ہوا اور اسے بحیثیت حکومتی قیدی کے ایجنسی لے جایا گیا۔

دوپہر کو مجھے خان پور جانے کی ذمہ داری سونپی گئی جوکہ یہاں سے تیرہ میل کے فاصلہ پر تھا۔ یہاں مجھے کمال خاں سے ملنا تھا جوکہ کاہیری قبیلہ کا سردار تھا۔ مجھے اس کو آمادہ کرنا تھا کہ وہ پولٹیکل ایجنٹ سے ملے اور حکومت کی ملازمت میں آجائے۔ اس کو آمادہ کرنے کے لئے مجھے یہ دلیل دینی تھی کہ اس کو اور اس کے قبیلہ کو جو تکلیف بجار خاں ڈومکی' مشہور ڈاکو سے پہنچی ہے اس کو وہ مدنظر رکھے۔ میں آدھی درجن بلوچوں کے ساتھ اس سے ملنے کے لئے روانہ ہوا۔ میری خوش قسمتی کہ راستہ میں میرا مقابلہ ڈاکوؤں کے کسی گروہ سے نہیں ہوا اور میں بحفاظت آدھی رات کو وہاں پہنچ گیا۔ میرے دستہ میں جو بلوچ تھے وہ بڑے خوش طبع اور ہنسی مذاق والے تھے۔ ہم جیسے ہی کنٹونمنٹ سے نکلے اور باہر کی کھلی فضا میں آئے' ایسے ہی ان کا موڈ بدل گیا اور انہوں نے ہنسنا' گانا اور باتیں کرنا شروع کردیں۔ میں نے بطور تجسس ان سے پوچھا کہ اگر ہم پر ڈاکو حملہ کریں تو کیسا رہے گا؟ اگر ایسا ہو تو پھر جواب میں ہمیں ان پر حملہ کرنا چاہئے۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے تسلی دیتے

ہوئے کہا کہ: "اس سلسلہ میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ کسی ڈاکو کو اس وقت تک تم پر حملہ کرنے کی جرات نہیں ہوگی کہ جب تک ہم چھ لوگوں کے شانوں پر یہ سر ہیں۔"

کامل خاں نے میرا استقبال ایسی ہی گرمجوشی سے کیا کہ جیسے کہ صحراؤں کے قبیلوں میں مہمانوں کی عزت افزائی کی جاتی ہے۔ اس نے دو فربہ بکروں کو دعوت کے لئے روسٹ کروایا اور کچھ پراٹھے پکوائے۔ اس پر تکلف دعوت میں' میں نے اور اس کے کچھ رشتہ داروں نے شرکت کی۔ اس کے بعد ہم نے نماز پڑھی۔ ان لوگوں کے اصرار پر میں نے جماعت کی امامت کی۔

سونے سے پہلے میں نے اپنے مشن کے بارے میں کامل خان سے گفتگو کی اور اس کو بتایا کہ ملازمت کے نتیجہ میں اس کو بے انتہا فوائد حاصل ہوں گے۔ اس نے ملازمت کو قبول کرنے میں اپنی رضامندی کا اظہار کیا اور کہا کہ اسے اور اس کے قبیلہ کو انگریزی مفاد کے لئے کام کرنے میں فخر ہوگا۔ مگر ایک شرط یہ ہوگی کہ مذہبی معاملات میں بالکل دخل نہیں دیا جائے۔ کیونکہ اس کو بتایا گیا تھا کہ انگریزوں کا یہ دستور ہے کہ پہلے وہ ملک پر قبضہ کرتے ہیں اور پھر لوگوں کو مجبور کرتے ہیں کہ ان کا مذہب اختیار کریں۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ اس سلسلہ میں اسے کوئی فکر نہیں کرنی چاہئے اور اسے اس قسم کے قصوں کہانیوں پر یقین نہیں کرنا چاہئے کہ جو دشمنوں کے پھیلائے ہوئے ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ کوئی ایک مثال بھی دے سکتا ہے کہ جس میں انگریزوں نے کسی کو مجبور کیا ہو کہ وہ اپنا مذہب چھوڑ کر ان کا اختیار کرے۔ انگریزوں کی رواداری کے ثبوت میں میں نے اس سے کہا کہ وہ خود فوج کے دستوں کو دیکھے کہ جو انگریزوں کے ماتحت ہیں۔ یہاں پر ہر مذہب اور ذات کے لوگ ہیں اور وہ حکومت کی دخل اندازی کے بغیر اپنے مذہب و عقیدے کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ پھر میں نے پوچھا کہ اس کی رائے میرے بارے میں کیا ہے جوکہ انگریزوں کے ساتھ بائیس سال سے زیادہ رہا ہے۔ یہ سن کر اس نے شہادت کی انگلی اپنی دونوں آنکھوں پر رکھی' جس کا مطلب تھا کہ وہ میری بات کا دل و جان سے یقین کرتا ہے۔

دوسرے دن صبح کو کمال خاں کی ہمراہی میں ہم خان پور سے روانہ ہوئے اور آٹھ بجے صبح شکار پور میں ایجنسی پہنچ گئے۔ میں نے اسے پولٹیکل ایجنٹ کی خدمت میں پیش کیا۔ اس کو اور اس کے ساتھیوں کو آنریبل کمپنی کی ملازمت میں لے لیا گیا۔ ان سے وعدہ لیا گیا کہ وہ برطانوی مفادات کے ساتھ وفادار رہیں گے۔

20 تاریخ کو دوستوں کے اصرار پر میں شہر میں ایک عجیب و غریب صورت کے شخص کو دیکھنے گیا۔ اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوا کہ اس کو بناتے وقت قدرت نے اپنے معمول کے طریقہ کو بدل دیا اور اس کو ہاتھی کی طرح سے ایک سونڈ دے دی۔ یہ سونڈ اس کے ماتھے سے شروع ہوکر اس کی تھوڑی تک آتی تھی۔ وہ صرف اپنی بائیں آنکھ سے دیکھ سکتا تھا کیونکہ اس کی دائیں آنکھ سونڈ کے گوشت سے چھپی ہوئی تھی۔ اس شخص کی عمر تقریباً بیس سال ہوگی۔ ذہنی طور پر وہ بالکل صحت مند تھا۔ کیونکہ جب میں نے اس سے سندھی میں کئی سوالات پوچھے تو ان سب کے اس نے معقول جوابات دیئے۔

ہمارے ڈسپلن رکھنے والے لوگوں کے لئے ایک اور مشکل آئی وہ تھی کہ ان کے لئے یہ مشکل تھا کہ وہ کس طرح سے نئے بلوچ رنگروٹوں اور ڈاکوؤں کے درمیان تمیز کریں؟

جب کبھی وہ ہمارے ملازم بلوچیوں کو کیمپ کے قریب دیکھتے تو اس وقت بیس یا تیس مقامی فوجی بھاگ کر ان کو پکڑ لیتے تھے۔ پھر انہیں بے دردی سے مارتے پیٹتے اور بعض کو تو زخمی حالت میں ہمارے سامنے لاتے۔

ہم نہیں چاہتے تھے کہ یہ نئے نئے شیر جو ہماری ملازمت میں آئے ہیں اور جن کو ہم آہستہ آہستہ سدھار رہے ہیں' اس سلوک سے انہیں ناراض کریں۔ اس لئے ہم نے ان سے کہا کہ وہ بطور شناخت ہماری بیلٹ باندھ لیا کریں۔ اس کے لئے ہم نے بڑی مشکلوں سے انہیں آمادہ کیا اور یوں انہوں نے خود کو ہمارے طوق خدمت میں دے دیا۔

5 مئی کو پولٹیکل ایجنٹ نے حکم دیا کہ میں اس کا گھوڑا کہ جس پر اس نے مجھے سواری کی اجازت دے دی تھی' اسے سرور خاں لوحانی کو دے دوں۔ وہ اس خوبصورت گھوڑے پر سوار ہوکر بلوچیوں کی ایک جماعت کے ساتھ ڈاکوؤں کے تعاقب میں روانہ ہو گیا جس وقت وہ گیا ہے اس کا اپنا گھوڑا اصطبل میں گرمی کی شدت سے دور تھا۔ شام کو وہ واپس آیا اور ظاہر یہ کیا کہ ڈاکوؤں کے خلاف اس کی مہم کامیاب رہی' اس کے ثبوت کے طور پر وہ ایک ڈاکو سر کاٹ لایا تھا تاکہ پولٹیکل ایجنٹ پر اپنی بہادری کا رعب جما سکے۔ وہ غریب گھوڑا کہ جو اس وحشی سوار کو واپس لایا تھا' جیسے ہی اصطبل میں اس پر سے زین اتاری گئی وہ فوراً گر کر مر گیا۔

اس وقت تک گرمی ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔ گرمی کی شدت کو دیکھنے کے لئے میں نے کچھ انڈے دھوپ میں رکھوا دیئے۔ یہ چالیس منٹ کے اندر اندر پک کر سخت ہوگئے۔

سات تاریخ کو ہمارے بلوچوں نے مصری خاں کھوسہ کی رہنمائی میں ڈاکوؤں کی ایک

جماعت پر حملہ کیا۔ لڑائی کے دوران مصری خاں کے دو زخم آئے۔ ایک شانہ پر اور دوسرا ٹانگ پر۔ لیکن اس نے کامیابی کے ساتھ چار ڈاکوؤں کو گرفتار کرلیا۔ جن کا تعلق ڈوکی اور دشتی قبیلوں سے تھا۔ یہ مشہور زمانہ رحمان ڈاکو کے ساتھیوں میں سے تھے۔ پولیٹکل ایجنٹ نے شکارپور کے گورنر دیوان جیٹھ مل سے مشورہ کیا کہ ان کے ساتھ کیا کیا جائے؟ گورنر نے فوراً کہا کہ انہیں سخت اذیت کے بعد سزائے موت دے دینی چاہیے۔ پولیٹکل ایجنٹ اور دوسرے انگریز بھی اس پر متفق ہوگئے مگر بعد میں یہ فیصلہ ہوا کہ ان پر تشدد نہیں کیا جائے بلکہ صرف سزائے موت دی جائے۔ لہٰذا ان کو ایک ایک کرکے ہر روز پھانسی دے دی گئی۔

جب میں نے اس دہشت ناک سزا کے بارے میں انہیں بتایا تو اس وقت میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے خاص طور سے اس شخص کی جانب اشارہ کیا کہ جسے دوسرے دن پھانسی دی جانے والی تھی تو یہ سن کر اس نے بے انتہا لاپروائی سے کہا: "جے کی رضا خدا کی"

جہاں تک مصری خاں کا تعلق ہے تو اس کے زخم کو ہمارے ڈاکٹر نے ٹانکے لگا کر اس پر ڈریسنگ کردی۔ اس عرصہ میں اس نے چہرے سے کسی قسم کی تکلیف کا اظہار نہیں کیا۔ ڈریسنگ کے بعد اس نے ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا اور بغیر کسی کی مدد کے گھر چلا گیا حالانکہ ان زخموں کی وجہ سے اس کے جسم سے کافی خون بہہ چکا تھا جس سے اس کا پورا لباس بھرا ہوا تھا۔ اس کو رخصت کرتے وقت میں نے اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ مجھے اس کے زخمی ہونے کا افسوس ہے کہ اس کی قسمت کی خرابی سے یہ سب کچھ ہوا۔

"اس کو بدقسمتی مت کہو" اس نے غصہ سے جواب دیا: "یہ وہ عزت ہے کہ جو ہر ایک کے حصے میں نہیں آتی ہے۔ ان زخموں کے نشان میرے جسم پر ہمیشہ رہیں گے اور میری بہادری کی یاد دلاتے رہیں گے۔"

اس کے بعد میں نے اس کی جلد صحت یابی کی دعا کی اور اس کو رخصت کیا۔

گیارہواں باب

دوسرے دن صبح کو ہماری رجمنٹ کے ایک دستہ اور گورنر کے مسلح آدمیوں نے ایک قیدی کو ساتھ لیا تاکہ اسے شہر کی دوسری جانب لے کر پھانسی دی جائے۔ لیکن ہوا یہ کہ غلطی سے انہوں نے صحیح قیدی کے بجائے ایک دوسرے قیدی ذرک ڈوکی کو لے لیا۔ لیکن اس سے کوئی زیادہ فرق نہیں پڑا۔ کیونکہ تمام قیدیوں کو سزائے موت کا حکم سنایا جا چکا تھا اور انہیں ایک کے بعد ایک کرکے پھانسی دی جانی تھی لیکن غریب ذرک کی زندگی کے دن دوسروں سے پہلے پورے ہوگئے۔ وہ پھانسی تک بغیر ایک لفظ کہے گیا۔

11 تاریخ کو ہمیں اس لڑائی کے بارے میں اطلاع ملی کہ جو بمبئی کی 5 رجمنٹ، کچھ بلوچ گھڑسواروں اور خان گڑھ کے کھوسوں کے درمیان ہوئی تھی۔ اس کے نتیجہ میں چار آدمی مارے گئے جبکہ ایک صوبیدار اور مسٹر اسٹینلے زخمی ہوئے۔ کھوسوں کے تیس آدمی قتل ہوئے۔ اس لڑائی کی وجہ زبان کا نہ جاننا تھا۔ کھوسہ قبیلہ کے آدمیوں نے قلعہ سے جو دوستانہ اشارے کئے اسے ہمارے آدمیوں نے مخالفانہ رویہ سمجھا۔ جس کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا۔ دوسرے دن زخمیوں اور قیدیوں کو پولٹیکل ایجنٹ کے روبرو لایا گیا۔ اس نے قیدیوں کو فوراً چھوڑ دیا اور جو زخمی تھے ان کا علاج معالجہ یورپین ڈاکٹر سے کرایا۔

دریا کی ایک شاخ پر ایک بڑا سالانہ میلہ منعقد ہوا۔ ہر سال یہ سیلاب کو خراج تحسین دینے کے لئے منایا جاتا ہے۔ میں اس کو دیکھنے گیا۔ میلہ میں عورتوں و مردوں کی ایک بڑی تعداد تھی۔ اس موقع پر میں نے ہندوؤں کی خوبصورت عورتوں کو بغیر نقاب کے دیکھا، مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ ان میں کچھ اتنی ہی خوبصورت تھی کہ جتنی انگلستان کی پریاں۔ ہر طرف لوگ خوشی سے چور تھے کہ میں نے ایک مجلس میں دیکھا کہ ایک بوڑھا شخص کہ جس کی لمبی سفید داڑھی تھی وہ طنبورے پر کہ جسے ایک خوبصورت لڑکی بجا رہی تھی، والہانہ رقص کررہا تھا۔ دونوں مل کر لوک گیت گا رہے تھے جس میں بوڑھے کا پرمسرت رقص اور عورت کی سریلی آواز مل کر عجیب سماں پیدا کررہی تھی۔

18 تاریخ کو میں جیٹھ سنگھ جو بینکر یا ساہو کار ہے اس سے ملنے گیا۔ اس کے پاس جو

زیورات بطور رہن رکھے ہوئے تھے ان میں، میں نے خوبصورت زمرد کی بالیاں دیکھیں۔ یہ دونوں زمرد کبوتر کے انڈے سے بڑے تھے اور ان میں کوئی نقص نہیں تھا۔ ان کی قیمت بیس ہزار روپیہ تھی کہ جنہیں اٹھارہ ہزار میں رہن رکھا گیا تھا۔

شکار پور دو یا تین کے لئے بغیر کسی گورنر کے رہا۔ جیٹھ مل، جو کہ یہاں کا گورنر تھا اس کو کہا گیا کہ اسے اس عہدے سے ہٹایا جاتا ہے، اس لئے وہ روپوش ہوگیا۔ پھر حیدر آباد سے فرمان آیا کہ وقتی طور پر اسے موقوف نہیں کیا جاتا ہے، لہٰذا اس حکم نامہ کو اس کے دوستوں نے اس کے خفیہ مقام پر پہنچایا۔ اس پر وہ دوبارہ سے پبلک میں آیا۔ لیکن ابھی وہ روپوشی سے ظاہر ہی ہوا تھا کہ یہ خبربد آئی کہ اس کا مخالف گورنر ہو کر آرہا ہے۔ یہ سن کر وہ دوبارہ سے روپوش ہوگیا۔

نیا گورنر اسماعیل شاہ کا لڑکا تقی شاہ تھا۔ یہ 26 تاریخ کو شکار پور پہنچا۔ آتے ہی پولیٹکل ایجنٹ سے ملاقات کے لئے آیا۔ ملاقات کے وقت اس نے میران حیدر آباد اور وزیر کی جانب سے ایجنٹ کی خیروعافیت دریافت کی۔ اس نے اس بات کا اظہار افسوس کیا کہ اس کی حکومت کا یہ منصوبہ کہ سابق گورنر کو پھنسایا جائے وہ ناکام ہوگیا ورنہ وہ اپنے اور اپنے آقاؤں کے لئے اس سے خطیر رقم وصول کرتا۔

چھ جون کو مسٹر روس بیل بحیثیت نئے پولیٹکل ایجنٹ کے آیا۔ اس کی ظاہری شکل و صورت تو بڑی دلکش تھی مگر میں نے جلد ہی دیکھ لیا کہ اس خوبصورتی کے پیچھے غرور اور بے جا قسم کی خودپسندی ہے۔ وہ دوسرے تمام لوگوں کو خود سے بے انتہا کم اور حقیر سمجھتا تھا اور حکومت کے ملازمین کے ساتھ ایسا سلوک کرتا تھا جیسے کہ وہ اس کے غلام ہوں۔

مسٹر روس کے کام کرنے کا طریقہ بھی بالکل مختلف تھا۔ اس کا مجھے اس سے پہلے کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اسے اپنے ماتحتوں پر کوئی اعتماد نہ تھا اسی لئے وہ لوگ بھی اس کیساتھ کوئی ہمدردی نہیں رکھتے تھے۔ وہ صوفے پر لیٹ کر اپنے خوشامد منشی کو خطوط لکھواتا تھا۔ اس غریب کی اتنی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ فرش پر یا کرسی پر بیٹھ جائے۔ اسے یہ خطوط حرف بہ حرف لکھنا پڑتے تھے چاہے ان کا کوئی مطلب ہو یا نہ ہو۔ لکھتے وقت وہ کھڑا رہتا تھا اور دوات کو کمربند سے باندھ لیا کرتا تھا۔ اس لئے میں سوچتا تھا کہ کوئی ہے جو اس ذلت کو زیادہ عرصہ برداشت کرے گا؟ اگر مجھے پولٹیکل ایجنٹ کے برابر بھی تنخواہ دی جائے تو میں اس کام کو قبول نہیں کروں گا۔ لیکن میرا دوست تری بنیا سہا اور اس کے ساتھی اس غلامی پر خوش تھے۔

ایک صبح کیپٹن ایسٹ وک نے مجھے اپنی بالائی سندھ کی رپورٹ بھیجی کہ اس کی عبارت کی تصحیح کردوں۔ اس وقت وہ اس کمرے میں تھا کہ جہاں مسٹر روس بیل اپنے منشی کو خط لکھوا رہا تھا۔ میں نے ان سوالات کے جواب دیئے کہ جو مجھ سے پوچھے گئے تھے۔ جب میں کمرے سے باہر جانے والا تھا تو میں نے اسے غلط جملہ لکھواتے ہوئے سنا کہ جو اس کے منشی نے اسی طرح سے لکھ لیا تھا۔ وہ اس کو زور سے پڑھ مزید آگے لکھنے کے لئے تیار تھا۔ یہ سوچ کر کہ اگر یہ جملہ اسی طرح سے غلط لکھا گیا تو اس سے برطانوی مفادات کو نقصان ہوگا۔ میں نے اضطراری طور پر فوراً اس غلطی کو درست کردیا۔ اس پر اس عظیم شخص نے انتہائی خوں خوار نظروں سے مجھے گھورا جیسے کہ وہ مجھے کچا ہی نگل جائے گا۔ لیکن میں نے اس کی کوئی پروا نہ کی اور واپس اپنی ڈیسک پر آگیا۔ شام کو مسٹر ایسٹ وک نے مجھے بتایا کہ مسٹر روس بیل میری دخل اندازی پر سخت غصہ ہوا تھا۔ میں نے جواب میں کہا کہ یہ میرا احساس فرض تھا کہ جس نے مجبور کیا کہ میں اس غلطی کی نشاندہی کروں۔

24 جون کی رات کو بارہ بجے مجھے گہری نیند سے جگایا گیا۔ اس وقت ایجنسی میں میری طلبی ہوئی۔ جب میں وہاں گیا تو دیکھا کہ مسٹر ایسٹ وک اور روس بیل ایک فارسی کا خط لئے بیٹھے ہیں۔ جب میں گیا تو مسٹر بیل نے کچھ فرانسیسی زبان میں کہا' میں اس کا مطلب یہ سمجھا کہ وہ مسٹر ایسٹ وک سے پوچھ رہا ہے کہ کیا ہم اس کو اعتماد میں لیں یا نہیں۔ جب اس کو اس کا مثبت صورت میں جواب ملا تو اس نے یہ کاغذات مجھے دے کر کہا کہ میں پڑھ اس کے متن سے انہیں آگاہ کروں۔ جیساکہ مجھ سے کہا گیا تھا میں نے ویسا ہی کیا۔ میرا خیال ہے کہ یہ خطوط اس عظیم آدمی کی مدد حاصل کرنے کی غرض سے لکھے گئے تھے جب میں نے خطوط پڑھ دیئے اور اُس عظیم آدمی نے اس کے نوٹس لے لئے تو اس نے اس موضوع پر ایسٹ وک سے فرانسیسی زبان میں بات کی۔ پھر مجھے حکم دیا گیا کہ میں فوراً سکھر روانہ ہو جاؤں کہ جہاں مجھے فتح محمد خاں غوری کو ایک اہم پیغام پہنچانا ہے۔

چنانچہ 25 تاریخ کو صبح کے وقت میں شکارپور سے روانہ ہوا' اور گیارہ بجے صبح وزیر کے کیمپ شکارپور پہنچ گیا۔ میں نے اسے پیغام پہنچایا۔ اس کے ساتھ ناشتہ کیا۔ اس کے بعد ایک پرسکون اور ٹھنڈی جگہ ڈھونڈی جہاں میں نے اور میرے گھوڑے نے آرام کیا۔ یہاں سے میں نے اپنے مشن کی رپورٹ لکھ کر اپنے ایک سپاہی کے ہاتھ کیپٹن ایسٹ وک کو روانہ کر دی۔ میں نے چار گھنٹہ آرام کیا۔ اگر اسے آرام کہا جائے کیونکہ جس درخت کے سایہ میں میں تھا وہاں درجہ حرارت 116 ڈگری تھا۔ پھر میں تین بجے شکار پور کے لئے

روانہ ہوا۔ جہاں میں رات کو گیارہ بجے بے انتہا تھکا ہارا پہنچا۔

24 جولائی کو مجھے یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ میں حیدر آباد کے وزیر اسماعیل شاہ سے جاکر ملوں کہ جو اسی روز صبح کلکتہ سے آیا تھا۔ اس کی عمر' پچاس سال کی ہو چکی تھی اور حقیقت میں اب وہ ہوش و حواس کھو چکا تھا۔ اس کے آٹھ لڑکے تھے جو حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے خزانہ میں پانچ لاکھ روپیہ نقد رکھا کرتا تھا۔ اس کی جاگیر میں کئی گاؤں تھے۔

29 تاریخ کو کیپٹن ایسٹ وک کوہدایات ملیں کہ وہ حیدر آباد جائے اور وہاں ریذیڈنٹ کا چارج سنبھالے۔ میں نے اپنے دوست اسسٹنٹ پولیٹکل ایجنٹ کو خطوط لکھے اور واپس حیدر آباد جانے کی تیاریاں شروع کردیں۔

میں نے شہر میں اپنے دوستوں سے رخصت ہوا جن میں عبدالرحمان درانی جو مونوکل کا استعمال کرتا تھا' قابل ذکر ہے۔ اس شریف آدمی نے انگریزی معیار کے مطابق اعلیٰ تہذیبی اقدار کو اپنا لیا تھا۔ اس کی بیوی بغیر برقعہ اوڑھے اب اس کے دوستوں سے ملاقات کرتی تھی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں اس خاتون سے کئی بار ملا اور بات چیت کی۔ اس بار جب مجھے ان سے ملاقات کی دعوت ملی تو میں اس خاتون اور اس کے مہذب شوہر کے ساتھ کھانا کھایا۔ یہ خاتون اپنی خوبصورتی اور دلکشی میں شکارپور کی تمام عورتوں سے بڑھی ہوئی ہے۔ اپنی ذہانت' صلاحیت اور قابلیت میں یہ اپنے سادہ لوح شوہر سے بہت آگے ہے۔ وہ اس کے اشاروں پر ناچتا ہے۔

عورتوں کو مردوں کی سوسائٹی سے دور رکھنا انگریز معیوب خیال کرتے ہیں۔ لیکن ہم جو سچے مسلمان ہیں' عورتوں کو علیحدہ رکھنا پسند کرتے ہیں۔ انگریز اپنی عورتوں کو اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ وہ آزادی کے ساتھ رہیں۔ ان کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ مردوں سے پبلک میں یا نجی طور پر ملیں اور زندگی سے پورا پورا لطف اٹھائیں۔ عورتیں' بیچاری' جو کہ فطرتاً" کمزور ہیں' نہ جانے کتنی' مردوں کی سازشوں کا شکار ہو جاتی ہیں۔ کتنے ایسے شریف خاندان ہیں کہ جو اس غیردانشمندانہ اجازت کی وجہ سے تباہ و برباد ہوگئے۔ صرف لندن میں' اسی ہزار عورتیں ہیں کہ جو خراب کردار کی وجہ سے رجسٹرڈ ہیں۔ اگر تم اس عظیم شہر کی مشہور "ریجنٹ اسٹریٹ" پر شام کی چہل قدمی کے لئے جاؤ تو یہاں تم کئی بے انتہا خوبصورت عورتوں کو کھڑے پاؤ گے کہ جن کے رشتہ داروں اور دوستوں نے انہیں چھوڑ دیا ہے۔ اب یہ عورتیں بدکاری کا پیشہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ میں کس کو

قصوروار ٹھہرایا جائے؟ میں صرف یہی کہوں گا کہ اس کی وجہ یہ نام نہاد تہذیب ہے کہ جس نے انہیں اس بے راہ روی پر مجبور کیا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ تمام مسلمان عورتیں باعفت و عصمت ہیں۔ نیکی اور بدی دو کی طرح ہیں۔ ان میں پہلی صاف رنگ کی ہے جبکہ دوسری کالے رنگ کی۔ اس لئے کوئی ایسا معاشرے نہیں کہ جو اس قسم کی خواتین سے دوچار نہ ہو۔ لیکن مسلمانوں میں جو پابندیاں اور حدود ہیں' اس کی وجہ سے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ شریعت کے ان قوانین سے برائی رکتی ہے اور نیکی پروان چڑھتی ہے۔ مسلمان عورتوں کا زیادہ وقت سینے پرونے' پانچ وقت کی نماز پڑھنے' باورچی خانے میں کھانے پکانے اور گھر کے دوسرے کام کاج میں اس قدر صرف ہوتا ہے کہ انہیں اس بات کی فرصت ہی نہیں ہوتی کہ اپنے چاہنے والوں کے بارے میں کچھ سوچ بھی سکیں۔ ان کی شادی والدین کی مرضی سے ہوتی ہے جو ان کے ہمدرد و دوست ہوتے ہیں اور جن کا دنیاوی معاملات میں تجربہ ان سے زیادہ ہوتا ہے۔ لڑکی کو اپنے ہونے والے شوہر کو دیکھنے کا موقع کسی کھڑکی یا کسی سوراخ سے مشکل ہی سے ملتا ہے جب تک کہ لڑکے و لڑکی کا نکاح نہ ہو جائے' ان کے درمیان کسی قسم کا جنسی تعلق پیدا نہیں ہوتا ہے۔ نکاح کی رسم حکومت کی طرف سے مقرر کئے ہوئے قاضی کے ذریعہ ہوتی ہے۔ اس وجہ سے شادی ہر قسم کی برائیوں سے پاک ہوتی ہے اور میاں بیوی کے جھگڑوں و تلخیوں کو ختم کرکے ان میں انس و محبت پیدا کرتی ہے۔

پردہ عورت کو بہت سے فریبوں سے بچاتا ہے جوکہ ذہن کو اپنی گرفت میں لیتے ہیں اور وقتی لطف اندوزی اپنے پیچھے تلخ پچھتاوا چھوڑ جاتی ہے۔ چونکہ ہماری عورتیں اس فتح اور اقتدار سے واقف نہیں ہوتیں جوکہ یورپ میں خوبصورت عورت حاصل کرلیتی ہے' اس لئے جب اس کی خوبصورتی ختم ہوتی ہے تو اسے اس کی کوئی تکلیف نہیں ہوتی ہے۔

12 اگست 1839ء کو ہم شکار پور سے حیدر آباد آئے۔ ہم نے دریائی سفر کے لئے دو کشتیاں کرائے پر لیں۔ شہر سے دو میل کے فاصلے پر دریا کی ایک شاخ سے ہم ان پر سوار ہوئے۔ رخصت کے موقع پر کیپٹن ایسٹ وک نے بڑی مشکل سے اپنے کئی ملنے والوں سے چھٹکارا حاصل کیا۔ ان میں سے کچھ تو دوڑتے ہوئے ملنے کے لئے شہر سے چھ یا سات میل تک آئے۔ چونکہ اس وقت دریا میں پانی بہت تھا اس لئے اس کا منظر بڑا خوبصورت تھا۔ دریا کے دونوں کناروں کی دلکشی آنکھوں کو لبھا رہی تھی۔

بہرحال کشتی میں ہمیں تین دشمنوں سے نمٹنا تھا۔ سورج کی تپش' کشتی کے چوہے' اور

دریا کے مچھر۔ پہلا پورے دن اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتا تھا۔ دوسرا ہماری نیند میں خلل ڈالتا تھا' تیسرا رات میں ہمارا خون چوستا تھا۔

چار دن کے سفر کے بعد اپنی کشتیوں کو کھینچتے اور گھسیٹتے ہوئے ہم 15 تاریخ کو ایک بار پھر سکھر پہنچ گئے۔ یہاں مجھے کیپٹن ایسٹ وک کے چھوٹے بھائی سے مل کر خوشی ہوئی۔ یہ پولیٹکل ایجنٹ کا اسسٹنٹ ہونے والا تھا۔ یہ کئی مشرقی زبانوں کو جانتا ہے۔ یہاں پر ہم نے ایک ہفتہ قیام کیا۔ یہیں پر ہم نے یہ اچھی خبر سنی کہ سرکین نے غزنی پر قبضہ کرلیا ہے۔

بالائی سندھ کے سیاسی حالات بڑی تیزی سے خراب ہو رہے تھے۔ نیا پولیٹکل ایجنٹ لڑائی جھگڑوں میں مصروف تھا' خصوصیت سے بریگیڈیئر جنرل سے۔ اس قسم کا رویہ ملازمتوں میں ہمیشہ خراب ہوتا ہے۔

ہم سکھر سے 24 کو روانہ ہوئے اور 28 کو خیریت سے حیدر آباد پہنچ گئے۔ ابھی ہم مشکل ہی سے کیپٹن جے ڈی لیکی کی صحبت میں پانچ دن گزارے تھے کہ کیپٹن ایسٹ وک سخت بخاری میں مبتلا ہوگیا۔ اس لئے اسے پہلے ٹھٹھہ اور پھر کراچی جانا پڑا۔ میں معہ سازوسامان کے ٹھٹھہ میں رہ گیا۔ مجھے خود کو بھی کئی بار بخار کا حملہ ہوا' چونکہ مجھے کسی ڈاکٹر سے دوا نہیں مل سکی۔ اس لئے میں نے اپنا علاج خود کیا۔

15 ستمبر کو سخت گرمی تھی۔ لیکن رات بہت حد تک ٹھنڈی تھی۔ آسمان پر خوبصورت تارے جگمگا رہے تھے۔ اچانک آسمان پر بادل آئے اور پھر سخت بارش ہوئی۔ اس سے پہلے میں نے سندھ میں بادوباراں کے تین طوفان دیکھے تھے۔ مگر یہ ان سب کا باپ تھا۔ بہت سے افسران کے خیمہ ٹکڑے ٹکڑے ہوکر ہوا میں اڑ گئے۔ لیکن میرا خیمہ جوکہ کئی رسیوں کے سہارے پتھریلے میدان میں تھا اسی طرح سے کھڑا رہا لیکن پانی اس قدر آگیا کہ میرا بستر اور دوسرا فرنیچر تیرنے لگا۔ یہ سلسلہ دو گھنٹے تک جاری رہا' صبح آٹھ بجے جاکر موسم کی سختی کم ہوئی اور آسمان صاف ہوگیا۔ 20 تاریخ تک موسم طوفانی رہا۔

28 تاریخ کو میں نے ایک بھیانک منظر دیکھا 26 رجمنٹ کی چھ کمپنی کے ایک سپاہی نے بچوں کو مارا' پھر خود خودکشی کرلی۔ یہ ایک مرہٹہ تھا کہ جس کی عمر تیس سال کی تھی۔ اس شخص کی محبوب بیوی کا انتقال دس دن پہلے زچگی کے دوران ہوگیا تھا جس کے بعد اسے اپنے ان بچوں کی دیکھ بھال کرنی تھی۔ ان میں پہلا پانچ سال' دوسرا تین سال اور تیسرا نومولود تھا۔ اس کو بحیثیت سپاہی کے سخت ڈیوٹی بھی دینی تھی۔ ان مصیبتوں میں گھر جانے کے بعد' اس کی عقل جواب دے گئی اور اس کے سامنے سوائے اس کے اور کوئی حل نہیں

رہا کہ معصوم بچوں کو مار کر خود اپنی زندگی کا خاتمہ بھی کر لے۔ چنانچہ دس بجے اس نے اپنے بچوں کے گلے کاٹ کر پہلے انہیں ہلاک کیا اور پھر خود کو گولی مار کر اپنا کام تمام کیا۔ میں ان کی لاشوں کو دیکھ کر اپنے جذبات پر قابو نہیں پا سکا۔ اس حادثہ کی وجہ سے میری پوری رات انتہائی خراب گزری۔

19 اکتوبر کو کیپٹن ایسٹ وک ٹھٹھہ واپس آگئے۔ اس کے بعد 21 تاریخ کو ہم ریذیڈنسی کے کام کے سلسلہ میں حیدر آباد روانہ ہوگئے۔ چونکہ اس بار ہم موجوں کے خلاف تھے اس لئے وہاں پہنچنے میں چار دن لگ گئے۔ وہاں جانے کے بعد یہ دیکھ کر مجھے سخت افسوس ہوا کہ میرا دوست کیپٹن لیکی بخار کی وجہ سے بے انتہا کمزور ہو کر ہڈیوں کا ڈھانچہ ہوگیا تھا۔

29 تاریخ کو مجھ پر بخار کا سخت حملہ ہوا۔ یہ ایک ہفتہ تک بڑھتا رہا۔ جس نے میری توانائی کو چوس لیا اور مجھے اس قدر کمزور کر دیا کہ میں بغیر کسی کی مدد کے بستر سے ہل جل بھی نہیں سکتا تھا۔ کیپٹن ایسٹ وک کی تشویش میرے لئے ایسی ہی تھی جیسی کہ باپ کو بیٹے سے ہوتی ہے۔ خدا اس کو اس مہربانی کا صلہ دے۔ وہاں کوئی حکیم یا ڈاکٹر نہیں تھا کہ جس سے صلاح کی جاتی۔ میرے لئے سنا اوز ایک تلخ جڑی ہی واحد دوا تھی۔ نو دن کے بعد بیماری میں افاقہ ہونا شروع ہوا۔ اس کے بعد شکر کے شربت نے تین دن کے اندر اندر صحت یاب کرنا شروع کردیا لیکن بیماری نے مجھے اس قدر کمزور کردیا تھا کہ کچھ دنوں تک نہ تو میں چل سکتا تھا اور نہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ اسی زمانہ میں رمضان کا مہینہ آگیا۔ میں کمزوری کی وجہ سے روزے نہیں رکھ سکا۔

ایک دن میں ریذیڈنسی کے کمپاؤنڈ کے باہر چہل قدمی کر رہا تھا کہ ایک نوجوان شخص ہاتھ میں ڈنڈا اور کندھوں پر اپنا سامان اٹھائے ہوئے میرے پاس آیا۔ ایک اچھے مسلمان کی طرح سلام کرنے کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا بڑے صاحب اندر ہیں اور کیا وہ ان سے مل سکتا ہے؟ میں نے اسے ایک غیر مہذب خانہ بدوش قسم کا فقیر سمجھا اس لئے اس کو درشتگی سے جواب دے کر وہاں سے ہٹ گیا۔ اس کے بعد وہ ریذیڈنسی کے دروازہ پر گیا کہ جہاں چوکیدار نے اس کی شکستہ حالی کو دیکھ کر اسے اندر جانے سے روک دیا۔ اس کے بعد وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا اور اپنے تھیلے سے روٹی کا ایک ٹکڑا نکال کر اسے کھانے میں مصروف ہوگیا۔ چہل قدمی کے بعد میں اپنی رہائش گاہ پر واپس آگیا۔ ناشتہ کرتے وقت مجھے اس کی مصیبت زدگی کا خیال آیا اور میں نے اپنے ایک ملازم کو کہا کہ وہ اس کے لئے روٹی اور شوربہ لے جائے۔ لیکن جب وہ وہاں پہنچا تو مسافر کا کچھ پتہ نہیں

تھا۔ دوپہر کو جب میں کچھ کاغذات لے کر کیپٹن ایسٹ وک کے کمرہ میں گیا تو یہ دیکھ کر میری حیرانی نہیں رہی کہ وہی شخص انگریزی لباس پہنے وہاں بیٹھا ہے اور کیپٹن ایسٹ وک سے خالص انگریزی میں بات کررہا ہے۔ میرا اس سے تعارف کرایا گیا۔ اس کا نام کرزن تھا۔ میں نے اسے انتہائی تعلیم یافتہ اور باصلاحیت پایا۔ وہ ہندوستانی' فارسی اور عربی زبانیں اس قدر عمدہ بولتا تھا کہ اس صبح جب وہ مجھ سے مخاطب ہوا تو میں نے اسے مقامی شخص ہی سمجھ کر جواب دیا۔ وہ کلکتہ سے اسی حالت میں یہاں تک آیا تھا۔ 21 تاریخ کو اس نے دوبارہ سے وہی بھیس بدلا اور یہاں سے ترکی کے لئے روانہ ہوگیا۔ میں نے دوبارہ اسے 1844ء میں لندن میں دیکھا۔

27 تاریخ کو ہمیں قلات کی جنگ کی خبر ملی۔ اس سے ہمیں پتہ چلا کہ محراب خاں مارا گیا اور قلعہ پر قبضہ ہوگیا۔

دوسری صبح کو میروں کو اس کی سرکاری طور پر اطلاع دی گئی۔ یہ خبر سن کر انہوں نے حکم دیا کہ انیس توپوں کی سلامی دی جائے اور شام کو شہر میں چراغاں کیا جائے۔ نجی طور پر ہمیں معلوم ہوا کہ میروں کو قلات کی فتح کی خبر سے انتہائی افسوس ہوا اور اس کے سردار کی موت سے وہ بے انتہا افسردہ ہوئے کیونکہ اس سے نہ صرف ان کے قریبی تعلقات تھے بلکہ اس سے رشتہ داری بھی تھی۔ میر' میر محمد کے باپ میر غلام علی نے محراب کی ایک بہن سے شادی کی تھی۔ دنیا کے طور طریق یہ ہیں کہ ایک بھتیجا اس بات پر مجبور ہے کہ اپنے چچا کی وفات پر خوشی میں چراغاں کرے۔

یکم دسمبر کو کیپٹن ایسٹ وک کو دوبارہ سے بخار آگیا جس کی وجہ سے ایک بار پھر وہ بستر پر لیٹ گیا۔ ایک ہفتہ تک تو اس نے انتظار کیا کہ اس کی طبیعت بحال ہو جائے' مگر جب ہر روز بخار بڑھتا رہا اور وہ کمزور ہوتا رہا' تو پھر ہم نے کراچی جانے کا فیصلہ کیا۔ 8 تاریخ کی دوپہر ریذیڈنسی کو لیفٹیننٹ وائٹ لاک کی نگرانی میں دینے کے بعد ہم روانہ ہوئے۔ دس تاریخ کو ٹھٹھہ میں قیام کیا اور گیارہ تاریخ کو کراچی پہنچے۔ ہمارے ملازموں کی حالت بھی ہم سے زیادہ خراب تھی۔ میرا ایک ملازم حسن جو لمبا تڑنگا صحت مند نوجوان تھا' اس کو میں نے کبھی چار پونڈ سے کم کھاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ لیکن اب بخار نے اسے کھوکھلا کرکے محض سایہ کر دیا تھا۔ اس کا وطن پوربندر تھا۔ میں نے موقع دیکھ کر اسے ایک سندھی کشتی کے ذریعہ اس کے وطن بھجوا دیا۔

ان حالات میں میرے اندیشے بڑھ گئے تھے۔ اس لئے میں نے کیپٹن ایسٹ وک سے

تین مہینے کی چھٹی کی درخواست دی۔ جو اس نے فوراً منظور کرلی۔ اس نے مجھے مندرجہ ذیل سند دی اور میری دیکھ بھال کے لئے عبدالکریم نامی چپڑاسی دیا۔

میرا منشی لطف اللہ مجھ سے تین مہینے کی رخصت لے کر سورت میں اپنے خاندان سے ملنے جارہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ حالات اس قسم کے ہوں کہ یہ واپس نہیں آسکے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس کی رخصت پر اس کی خدمات کے سلسلہ میں اپنے گہرے جذبات کا اظہار کروں۔ میرے دل میں اس کی بحیثیت ایک دوست اور استاد بڑی عزت ہے۔ مجھے یہ مواقع ملے ہیں کہ گیارہ سال کی رفاقت میں اس کے کردار کو قریب سے دیکھ سکوں۔ اور میں پورے وثوق سے یہ کہتا ہوں کہ اس جیسا مقامی ہندوستانی میری نظر میں اور کوئی نہیں ہے۔ میں بہت کم ایسے لوگوں سے ملا ہوں کہ جو اس کے برابر کے ہوں' اعلیٰ جذبات' احساسات' ادب و آداب جو کہ ایک مہذب و شریف آدمی میں ہوں' علم کا شوق اور اس کے حصول کے لئے بے انتہا محنت' یہ وہ خوبیاں ہیں' جو اس کے علاوہ کسی اور میں' میں نے نہیں دیکھیں۔ اگر ایشائی اور یورپی تعلیم کے فوائد کو مدنظر رکھا جائے تو میں اس کا مقابلہ اپنے بہترین ہم وطن سے کرسکتا ہوں' میں یہ اضافہ اور کرتا ہوں کہ میں اس کے احسانوں کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا ہوں۔ اگر وہ اس کردار کا مالک رہا تو میں ہمیشہ اس کی دوستی پر فخر کروں گا۔ ایک مخلص دوست کی حیثیت سے میری یہ دعا ہے کہ وہ جہاں چاہے جائے' وہ صحت مند' کامیاب او خوش حال رہے۔

ڈبلیو - جے - ایسٹ وک

اسسٹنٹ ریذیڈنٹ سندھ

کراچی - 19 دسمبر 1838ء

اس وقت سورت جانے کے لئے کوئی جہاز نہیں تھا۔ لیکن ایک سندھی کشتی "رحمتی" جس کا کپتان قاسم تھا' وہ خشک مچھلیوں کو لے کر بمبئی جانے والی تھی۔ میری معلومات پر کپتان نے کہا کہ وہ مجھے قریبی بندرگاہ پر چھوڑ دے گا۔ "قاسم" میں نے اس سے مخاطب ہوکر کہا: "میں خوشی سے تمہاری کشتی پر سفر کرنے پر تیار ہوں' مگر مچھلیوں کی بدبو میری صحت کے لئے مفید نہیں ہوگی' بلکہ شاید اور زیادہ بیمار کردے۔"

"میرے دوست اس کی کچھ فکر نہ کرو۔" اس عظیم الجثہ سندھی نے کہا: "میں تمہارے لئے علیحدہ سے ایک کیبن تیار کرا دوں گا۔ جہاں تمہیں کسی قسم کی بو نہیں آئے گی۔ اگر تم سمندر میں بیمار ہو جاتے ہو' تو مجھے یقین ہے کہ سمندری ہوا جلد تمہیں صحت

یاب کردے گی۔"

اس قسم کی خوشامدانہ باتوں کی وجہ سے میں یک دم جانے پر تیار ہوگیا اور 19 دسمبر کو میں نے اپنا سامان، رحمتی کشتی کو دیکھے بغیر، اس میں رکھنے کے لئے روانہ کردیا۔

20 تاریخ کو میں اپنے آقا سے رخصت ہوا۔ میں نے دعا کی کہ وہ زندگی میں کامیابی اور خوشی و مسرت حاصل کرے اور خدا اس کی بھی اسی طرح سے نگہبانی کرے جیسے کہ وہ مجھے حفاظت سے سورت پہنچائے۔ گورنر صادق شاہ اور کراچی کے مشہور تاجر ناؤمل نے مجھے ساحل تک آکر الوداع کیا۔ میں نے انہیں آخری بار خدا حافظ کیا اور ایک کشتی میں بیٹھ کر رحمتی میں سوار ہونے روانہ ہوا۔

جب میں کشتی پر پہنچا تو مجھے یہ دیکھ کر بے انتہا افسوس ہوا کہ یہ اوپر سے نیچے تک مچھلیوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ کیبن بھی کہ جو میرے لئے تھی اسمیں بھی مچھلیوں کے بنڈل ادھر ادھر بے تکے انداز میں پڑے ہوئے تھے۔ کپتان ساحل پر تھا اور کشتی پر کوئی اور ذمہ دار آدمی نہیں تھا کہ جس سے بات کی جاتی۔ میں نے کشتی کے عملہ سے کہا کہ جب تک وہ میری کیبن کو صاف نہیں کریں گے میں اس میں سوار نہیں ہوں گا۔ انہوں نے بڑے مہذب انداز میں جواب دیا کہ وہ میرے آرام اور سہولت کی خاطر سب کچھ کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن مجھے کپتان کی واپسی تک رکنا پڑے گا۔ میں نے جہاز کے عرشہ پر اپنا بستر لگایا، بو دور کرنے کی غرض سے اپنے اردگرد لیونڈر چھڑکا اور جیسے ہی میں نے تکیہ پر سر رکھا فوراً ہی میں گہری نیند میں غرق ہوگیا۔ میری آنکھ دوسرے دن صبح اس وقت کھلی کہ جب ملاح اپنی میٹھی آوازوں میں لنگر اٹھاتے ہوئے اور بادبان کھولتے ہوئے چیخ و پکار کررہے تھے۔ چونکہ ہم سب ایمان والے تھے اس لئے سفر سے پہلے ہم سب نے خدا تعالیٰ سے امن و امان میں رکھنے کی دعا مانگی۔

صبح کی ٹھنڈی ہوا ہمارے جہاز کے اوپر سرسراتے ہوئے گزرنے لگی، اور جلد ہی کراچی ہماری نظروں سے غائب ہوگیا۔ 21 کی شام کو ہم گھوڑاباری کے سامنے تھے۔ 22 تاریخ کو اپنے ٹیلی سکوپ کی مدد سے میں کچھ کے ساحل کو دیکھ سکتا تھا۔ 23 تاریخ کو ہم نے میانی پہاڑیوں اور جگت پوائنٹ سے گزرے۔ 24 تاریخ کو پورا دن بڑا خاموش رہا اور ہم بھی آہستگی کے ساتھ آگے بڑھے۔ کپتان نے میرے لئے کیبن کو مکمل طور پر صاف کرا دیا تھا اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا تھا کہ وہ میری خدمت کے لئے تیار رہیں۔ مچھلیوں کی بو میں آہستہ آہستہ ہر روز کم ہونے لگی، اس کی وجہ یہ تھی کہ میری ناک اس کی عادی ہوگئی

تھی۔

25 دسمبر کو کرسمس کے دن ہم بلول پٹن کے سامنے تھے۔ یہاں پہنچ کر میں نے فیصلہ کیا کہ میں یہ کشتی چھوڑ دوں۔ جب میں نے قاسم سے درخواست کی تو اس نے فوراً میرے احکامات کی تعمیل کی۔ ہم دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔ میں نے اس کو بطور تحفہ کچھ روپیہ پیش کئے جو اس نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لئے۔ میں نے قاسم کو ایک اچھی شخصیت کے طور پر پایا۔ اس کی طبیعت میں کوئی لالچ نہیں تھی۔ اسے اپنی عزت کا بڑا احساس تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ دوسرے سندھیوں کے مقابلہ میں بالکل جدا شخصیت کا مالک تھا۔

نواب آف جوناگڑھ کی جانب سے اس جگہ کا گورنر اب تک میرا پرانا دوست سید عبداللہ جمعدار تھا۔ اس کے بارے میں مسز پوسٹن نے اپنے سفر نامہ میں بڑی تعریف لکھی ہے۔ اس نے میرا گرمجوشی سے استقبال کیا۔

یہاں دو دن میں نے شکار اور شطرنج کھیلنے میں گزارے۔

27 تاریخ کو میں نے سید کو خدا حافظ کہا اور جعفر آباد کے لئے روانہ ہوا۔ چونکہ میں نے کاٹھیاواڑ تین سال گزارے تھے اس لئے میں اس کے ہر حصے سے پوری طرح واقف تھا اور میرے لئے یہاں کسی گائیڈ کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس لئے میں نے مندرجہ ذیل پروگرام کے تحت سفر کیا۔

تاریخ	گاؤں کا نام	میل
27	ڈاملیج	14
28	کوری نار	10
29	اوناہ	12
30	روہیسا	12
31	جعفر آباد	6

میرے لئے مختصر سا سفر صبح کی چہل قدمی کی طرح تھا۔ میں ہر روز کچھ تیتر اور جنگلی کبوتروں کا شکار کرتا تھا۔

میرے جعفر آباد پہنچنے پر میرا استقبال اس جگہ کی ہندوستانی افریقیوں نے کیا۔ یہ جنجرہ کے حبشی سردار کی جانب سے بھیجا ہوا وفد تھا۔ سری محمد، گورنر نے قلعہ میں مجھے بڑی عمدہ جگہ بطور رہائش دی اور کہا کہ میں اس وقت یہاں رہ سکتا ہوں جب تک کہ میں سورت

جانے والی کشتی میں سوار ہوؤں۔ جعفر آباد اور اوناہ کی آبادی آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے۔ آج سے دو سال پہلے جب میں نے ان شہروں کو دیکھا تھا اس وقت سے لے کر اب تک ان میں بڑا فرق ہوگیا ہے۔ اب ہر شہر میں مکانوں کی تعداد پندرہ سو کے قریب ہوگئی ہے۔ جب میں نے اس کی وجہ پوچھی تو بوڑھے گورنر نے مسکرا کر کہا کہ آبادی اوخوش حالی کی وجہ اچھی حکومت ہے۔ میں نے فوراً کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کیونکہ اوناہ نواب آف جوناگڑھ کے ماتحت ہے جس کی حکومت اس کی اپنے رائے کے مطابق ظالمانہ ہے۔ اس نے جواب دیا کہ اوناہ کا گورنر نواب کا غلام ہے جوکہ ایک اچھا آدمی ہے' اگر اسے گورنر کے عہدے پر برقرار رکھا گیا' جس کے کہ امکانات کم ہیں' تو یقین ہے کہ اوناہ کا شہر جعفر آباد کے مقابلے میں زیادہ ترقی کرے گا۔

جعفر آباد ایک بڑا شہر ہے۔ یہ تین جاگیروں میں سے ایک ہے' یہ تین جاگیریں ہیں جنجرہ' جو بمبئی کے قریب ہے' بیچن معہ سات گاؤں کے' سورت کے قریب اور جعفر آباد جزیرہ نما میں۔ یہ پونا کے پیشوا نے سری عبدالکریم خاں کو جسے مقبول عام میں بلو میاں کہتے ہیں 1791ء میں بطور جاگیر دیئے تھے۔ شہر میں ایک قلعہ اور فصلیں ہیں' ن کو مرمت کی ضرورت ہے۔ جعفر آباد کی بندرگاہ اچھی حالت میں ہے اور چھوٹے جہازوں کے لئے بہت اچھی ہے۔ اس بندرگاہ سے منافع بخش تجارت بمبئی' سورت' اور گجرات کے دوسرے ساحلی شہروں میں ہوتی ہے۔ یہاں روئی' گھی اور مویشیوں کو در آمد کیا جاتا ہے۔ اگر اس کا بہتر انتظام کیا جائے تو یہ یقیناً ایک اچھی جگہ بن سکتی ہے۔

بارہواں باب

یہ نیا سال میں نے جعفر آباد میں وہاں کے گورنر سری محمد کے گھر میں اس کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے شروع کیا۔ سری محمد ایک ذہین' مہذب اور عوام دوست انسان ہے۔ پچھلے بارہ مہینوں کے اندر اندر میں تین ایسے گورنروں سے ملا ہوں کہ جو ایک زمانہ میں غلام تھے۔ جوڑیا بندر کا آنند خواص' اوناہ کا فتح محمد اور جعفر آباد کا سری محمد۔ وہ غلام کہ جو اپنے بہترین رویہ کی بنا پر مقبول ہوں تو ایسے لوگ آزاد لوگوں کے مقابلہ میں بہتر ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غلامی کے دوران اطاعت گزاری انہیں یہ سکھا دیتی ہے کہ اپنے ماتحتوں سے کیسے برتاؤ کرنا چاہئے لیکن خواجہ سرا اس دائرے میں نہیں آتے ہیں۔ ابتداء ہی سے ان کے ساتھ جو ظالمانہ سلوک کیا جاتا ہے اس کا زبردست اثر ان کی ذہنی صلاحیتوں پر پڑتا ہے' اس کے ردعمل میں وہ سازشی' کینہ پرور' منتقم المزاج اور بے رحم ہو جاتے ہیں۔ ان میں دوستانہ و ہمدردی کے تمام جذبات مفقود ہو جاتے ہیں۔

2 جنوری کی شام کو میں سری محمد سے رخصت ہوا اور ایک جہاز میں سورت جانے کے لئے روانہ ہوا کہ جس میں چونا لدا ہوا تھا۔ دس تاریخ کو مجھے نواب کی جانب سے محل میں بلایا گیا جہاں میں اس سے اور اس کے دو دامادوں سے ملا۔ نواب مجھ سے حسب روایت بڑی مہربانی کے ساتھ ملے اور مجھ سے میران سندھ کے معاملات پر تفصیل سے گفتگو کی۔ اس نے افغانستان میں انگریزوں کی کامیابی کے بارے میں بھی سوالات کئے۔ ہزہائی نس کی صحت بہت اچھی ہے۔ لیکن اگر انہیں اخلاقی معیار پر پرکھا جائے تو ان میں برائیاں نظر آئیں گی۔ ان کی صحبت میں کمینے' نچلے درجے کے اوباش لوگ ہیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ان کے مصاحب اب پہلے سے بھی زیادہ بدتر ہیں۔ وہ افیم کے نشہ کے ساتھ ساتھ اب شراب کے بھی رسیا ہوگئے ہیں۔ ان کو اس راہ پر لگانے والا یا ان کو بگاڑنے والا ان کا وزیر محمد علی ہے۔ جب بھی ہزہائی نس اپنے مصاحبوں کی محفل میں گفتگو کرتے ہیں' وہ "ہاں جناب' بالکل صحیح ہے' بے شک بے شک" اور اسی قسم کے خوشامدانہ جملے بولتے رہتے ہیں۔ چاہے نواب کی باتیں معقول ہوں یا نامعقول' یا ان کے مشاہدات درست یا غلط' ان

کے مطالبات صحیح ہوں یا غلط' یہ ان سب کے جواب میں سر ہلا کر انہیں درست کہتے رہتے ہیں۔ بعد میں جب میں ان کے دامادوں سے ملا تو وہ مجھ سے مل کر بے انتہا خوش ہوئے۔ انہوں نے بھی اپنے سسر کے طور طریقوں پر تنقید کی اور انہیں برا کہا۔

محل جاتے اور وہاں سے واپس آتے ہوئے میں نے پچھلی مرتبہ لگی ہوئی آگ کے تباہ کن اثرات دیکھے۔ تقریباً آدھا شہر جل کر راجھ ہوگیا ہے۔ شاندار مکانوں کی صرف دیواریں باقی رہ گئیں ہیں کہ جو عبرت کا سماں پیش کرتی ہیں۔

22 تاریخ کو مجھے خبر ملی کہ کیپٹن ایسٹ وک بیماری کی چھٹی پر بمبئی آرہا ہے' اس لئے اب میرے لئے واپس سندھ جانا بیکار تھا۔

30 مارچ کو میں نے نواب کی بڑی لڑکی اور میر اکبر علی کی بیوی کی وفات پر اس کی تجہیز و تکفین میں شرکت کی۔ وہ اس صبح کو پانچ بجے دق کے مرض میں وفات پا گئی تھی۔ اس کی عمر صرف اکیس سال تھی۔ اس کے چار بچے ہوئے مگر ان میں سے کوئی بھی زندہ نہیں رہا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ خاتون دوسری دو لڑکیوں کے مقابلہ میں اچھی طبیعت کی تھی۔ وہ اپنے باپ اور شوہر سے بے انتہا محبت کرتی تھی۔ اس کی بے وقت موت کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ سوتیلی ماں اس کے ساتھ ظالمانہ سلوک کرتی تھی۔ چونکہ یہ عورت نواب کی چہیتی ہے اس لئے کسی کو ہمت نہیں ہوتی کہ وہ اس کی مخالفت کرسکے۔ چونکہ میر اکبر علی کو دس دن ہوئے گیکواڑ بروڈہ بھیج دیا گیا تھا اس لئے وہ اپنی محبوب بیوی کی تجہیز و تکفین میں شریک نہیں ہوسکا۔ اس خاتون نے ایک غریب مغل کی بیٹی کو اپنا لیا تھا جس سے وہ اپنے بچوں کی طرح محبت کرتی تھی۔ اس کا نام اس نے اپنی دادی پر ولایتی خانم رکھا تھا۔ اس خوبصورت اور معصوم لڑکی کی آہ و بکا نے مجھ پر اس قدر اثر کیا کہ میں بھی اس موقع پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اسی حالت میں نے محل کو چھوڑا اور جنازے کے ساتھ شامل ہوا۔ اس وقت تک مجھے بالکل اندازہ نہ تھا کہ یہ لڑکی آگے چل کر میری بیوی بنے گی اور میرے کئی بچوں کی ماں ہوگی۔

پانچ مہینے تک میں نے اپنے منشی کے پرانے پیشہ کو جاری رکھا۔ مگر میری خواہش تھی کہ مجھے حکومت کی کوئی ملازمت مل جائے' اس غرض سے میں مسٹر پیلی سے ملنے گیا۔ ہوا یہ کہ جب میں مسٹر پیلی سے ملنے سیڑھیاں چڑھنے لگا تو ایک مسٹر میجر نے جو ایک کمرہ سے نکل رہا تھا مجھ سے کہا "خدا کے لئے اوپر مت آنا" ابتداء میں تو میں اس قسم کے استقبالیہ جملے سے حیران و ششدر ہوکر رہ گیا کہ ایک دوست کیسے یہ کہہ سکتا ہے لیکن جب میں

نے سیڑھیوں پر نظر ڈالی تو دیکھا ایک کالا سانپ کنڈلی مارے چوہے کو شکار کرنے کے لئے تیار ہے۔ مسٹر میجر چونکہ اس کے قریب تھے اس لئے سانپ نے انہیں غصہ سے گھورا' لیکن اس بہادر عیسائی نے اپنا جوتا اتارا کہ جس پر کیلیں تھیں اور وہ اسکے سر پر دے مارا چونکہ یہ اس کے جسم کے نازک حصہ پر پڑا تھا' اس لئے وہ تقریباً اس ضرب سے ختم ہوگیا۔ مزید یہ کہ مسٹر پیلی' میں نے' اور دوسرے ملازموں نے اسے مار مار کر ختم کردیا۔

اس کے بعد میرے نیک اور شریف میزبان نے مجھے اوپر آنے کی دعوت دی۔ میں کمرے میں جاکر بیٹھ گیا مگر جو حادثہ ہوا تھا اس نے میرے دل کی دھڑکنیں تیز کردی تھیں۔ زبان گنگ تھی اور چہرہ پیلا پڑا ہوا تھا۔ جب میں نے پانی کا ایک گلاس پیا تو اس سے میرا اعصابی تناؤ کم ہوا۔ میں نے مسٹر پیلی سے کہا کہ انسان کی خواہشات اور عزائم اس کو دنیاوی معاملات میں الجھا کر اس کی تباہی کا باعث بنتے ہیں۔ یہی حال میرا ہے کہ میں اپنی موجودہ آمدنی سے مطمئن نہ ہونے کی وجہ سے اس خواہش کے ساتھ یہاں آتا تھا کہ کوئی حکومت کی ملازمت حاصل کرسکوں۔ لیکن بجائے اس کے کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا' میری زندگی اور میرا مقصد دونوں ہی ختم ہونے والے تھے۔ وہ بوڑھا شریف آدمی میری باتیں سن کر مسکرایا' اور کہنے لگا کہ:

"لطف اللہ ان معمولی حادثوں سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہماری زندگی خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے حکم کے بغیر اسے کوئی نہیں چھین سکتا ہے۔"

اس نے کہا کہ وہ اس وقت مجھے ایک معمولی سا عہدہ پیش کرسکتا ہے۔ یہ کلرک اور مترجم کا ہے جس کی تنخواہ تیس روپیہ ماہانہ ہے۔ مزید یہ کہ وہ مجھے تیس روپیہ بطور فیس کے دے گا اگر میں اس کی بیٹی اور بیٹے کو ہندوستانی زبان پڑھا دوں۔ اس پیشکش کو میں نے فوراً قبول کرلیا اور اپنے سرپرست کا اس کی مہربانی اور اچھے سلوک پر شکریہ ادا کیا۔

19 دسمبر کو میں بمبئی گیا تاکہ مسٹر ایسٹ وک کو خدا حافظ کہوں۔ وہ بیماری کے بعد اپنی صحت کی بہتری کے لئے انگلستان جارہے تھے۔ ہم ایک سال کے وقفہ کے بعد ایک دوسرے کو دیکھ کر بے انتہا خوش ہوئے چونکہ اب اسے بخار نہیں تھا اس لئے ہم نے مختلف موضوعات پر کئی گھنٹوں گفتگو کی۔ چونکہ اسے اگلے اسٹیمر سے جانا تھا اس لئے میں سارے وقت اس کے ساتھ رہا اور اس کی جانب سے کئی سرکاری خطوط لکھے۔ ساتھ ہی میں اس کی ذاتی ضروریات کا بھی خیال رکھا۔

پہلی جنوری 1841ء کو جب ہم ایک دوسرے سے رخصت ہونے والے تھے تو اس نے

میری سفارش کرتے ہوئے مسٹر پیلی کے نام ایک خط لکھا' مجھے کچھ رقم اور چند چیزیں بطور تحفہ دیں۔ میں نے اس سے کہا کہ میں تو صرف اس سے ملنے کے لئے آیا تھا نہ کہ یہ تحفے تحائف لینے۔ لیکن جب میں نے دیکھا کہ اس سے اس کو افسوس ہو رہا ہے تو پھر میں نے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی۔ دوپہر کو میں نے اس کو بندرگاہ تک لے جانے کے لئے ایک آرام دہ گاڑی کا انتظام کیا۔ میں گاڑی میں اس کے ساتھ ہی بیٹھا اور اس کو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لئے رکھا کیونکہ اس وقت سردی سے وہ کانپ رہا تھا۔ اس حالت میں میں نے اسے وکٹوریہ اسٹیمر پر سوار کرایا۔ اسے ایک سلون میں لے جاکر ایک میٹرس پر لٹا دیا گیا۔ یہاں میں نے سردی سے بچاؤ کے لئے اس پر چادر ڈال دی۔ اس کے بعد مجھ سے جہاز چھوڑنے کے لئے کہا گیا۔ میں نے اسے دھڑکتے دل اور آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ الوداع کیا۔ پھر میں نے ان مصائب کے بارے میں سوچا کہ جو اسے اس بیماری کی حالت میں اور اس طویل سفر پر پیش آئیں گے۔

خدا کی وہ مخلوق کہ جس کی سمجھ محدود ہوتی ہے اور جو کم علمی کا شکار ہوتی ہے وہ بہت آسانی سے خوشی یا غم سے متاثر ہو جاتی ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ قادر مطلق لامحدود طاقت کا مالک ہے۔ اس کے لئے یہ ناممکن نہیں ہے کہ جس کو چاہے صحت دے اور جس کو چاہے عذاب میں مبتلا کر دے۔

پانچ تاریخ کی رات کو سورت جانے والی ایک کشتی میں' میں سوار ہو کر اور خدا کا نام لے کر سفر پر روانہ ہوا۔ ہوا کشتی کی موافقت میں اس قدر نہیں تھی کہ جیسی کہ اسے ہونا چاہئے تھا' لیکن گیارہ تاریخ کو ہم اپنی منزل مقصود پر بحفاظت پہنچ گئے۔ لیکن سفر کی تکالیف اور ہچکولوں نے ہمیں بری طرح سے تھکا دیا تھا۔ 12 تاریخ کو میں آفس گیا اور کیپٹن ایسٹ وک کا خط مسٹر پیلی کو دیا۔ خط پڑھ کر اس نے وعدہ کیا کہ جیسے ہی اسے موقع ملا وہ میری ترقی کے لئے کوشش کرے گا۔

حسب معمول میں نے اپنے فرائض کی ادائیگی شروع کردی۔ 4 فروری کو مسٹر پیلی کو نکن ضلع میں معائنہ کے لئے روانہ ہوئے اور مجھے کہا کہ اس سفر میں' دفتر کے دوسرے عملہ کے ساتھ' میں بھی چلوں۔ میں نے سفر کی تیاری کی اور ان کے ساتھ سورت بار جہاز پر سوار ہوگیا۔ یہاں سے ہم سات تاریخ کو آرام سے اپنی منزل کرنجا پہنچ گئے۔

جب ہم کرنجا لنگرانداز ہوئے تو یہاں پر میں نے کچھ چھوٹے چھوٹے جھونپڑے دیکھے کہ جن میں نیم برہنہ لوگ رہتے تھے۔ یہاں تین مکانات تھے جن میں سے ایک سرکاری

شراب کشید کرنے کا کارخانہ تھا' دوسرا ایک پارسی کا گھر تھا کہ جو اس کا انچارج تھا' اور تیسرا کاروان سرائے تھا۔ جسے بمبئی کے ایک باعزت اور شریف شخص محمد علی روگے' ناخدا نے تعمیر کرایا تھا۔ اس تعمیر کے پیچھے اس شخص کا فلاحی جذبہ کارفرما تھا تاکہ اس کاروان سرائے سے سیاحوں کو آرام پہنچے۔

کرنجا اور اس کے گردونواح کی آب و ہوا صحت بخش ہے۔ اس کے تین جانب سے سمندری ہوائیں آتی ہیں۔ اس خوبصورت جگہ میں نے تقریباً دو مہینے بڑے آرام سے گزارے

30 تاریخ کو مسٹر پیلی نے خود تو نیلگری جانے کی تیاریاں کیں۔ مجھے اور دوسرے کلرکوں کو حکم دیا کہ ہم بندرا جاکران کے قائم مقام مسٹر لانگ فورڈ سے ملیں۔ مسٹر پیلی کے تحت کام کرنے والے تمام اسٹاف کو اور خصوصیت سے مجھے ان کے جانے پر افسوس ہوا کیونکہ وہ عالی دماغ' ہمدرد اور شریفانہ خوبیوں کے مالک تھے اور ہم سب لوگوں کی صلاحیتوں سے بخوبی واقف تھے۔ رخصت کے وقت انہوں نے بہت اچھی تعریفی سند دی۔ ساتھ ہی میں انہوں نے اپنے جانشینوں کے نام خط لکھا کہ جس میں میرے بارے میں اچھے کلمات تھے۔ مجھے کچھ رقم بھی بطور انعام دی۔

دوسرے دن ہم بمبئی پہنچے۔ صبح کا ناشتہ کرنے کے بعد میں نے کچھ گاڑیاں کرایہ پر لیں' ایک اپنے سامان' ایک ملازمین' اور ایک اپنے لئے۔ یہاں سے ہم بندرا کے لئے روانہ ہوئے جہاں ہم گیارہ صبح صبح پہنچ گئے۔ صبح کے وقت جب ہم بمبئی سے روانہ ہونے والے تھے تو میرا ایک بدمعاش ملازم رحیم مجھے دغا دے گیا۔ وہ سودا سلف کے بہانے بازار گیا اور پھر واپس پلٹ کر نہیں آیا۔ میں نے اس کا پورے ایک گھنٹہ انتظار کیا اور بازار میں ہر جگہ اس کو تلاش کرایا' جب اس کا کوئی اتہ پتہ نہیں ملا تو میں نے خود گاڑی میں اپنا سامان رکھا اور کوشش کی کہ اپنے سفر کو آرام دہ بناؤں۔

بندرا میں' میں چھوٹی سی پارسی سرائے میں ٹھہرا۔ پارسی مالک کی لڑکی بڑی خوبصورت تھی۔ اس کا چہرہ بڑا دلکش تھا اور اس کی موجودگی کے ماحول کو خوشگوار بنا دیا تھا۔ جیسے ہی اس سے بات چیت شروع کی جاتی تھی' تو اس کے ساتھ اس کی سحرانگیز نگاہوں کے تیر دل کو زخمی کر دیتے تھے۔ یہ انگریزی تہذیب کے معیار کے مطابق مہذب لڑکی تھی۔ میں اس کو باعث فخر سمجھتا ہوں کہ میں نے اس کے خوبصورت ہاتھوں سے کھانے و پینے کی چیزیں لیں۔

شام کو میں' اور ہیڈ کلرک دونوں پہاڑی پر واقع مکان میں مسٹر لانگ فورڈ سے ملنے گئے تاکہ ہم ان سے اپنے بارے میں ہدایات لیں۔ مکان پر پہنچ کر ہم نے پیغام پہنچوایا کہ ہم حاضری کے لئے آئے ہیں۔ اس پر ملازم نے آکر ہمیں بتایا کہ "اس وقت تک انتظار کرو کہ جب تک تمہیں جانے کو نہیں کہا جائے۔" دو گھنٹے انتظار کرنے کے بعد ہمیں حاضری کی اجازت ملی۔ ہم اس کے سامنے گئے اور جھک کر آداب کیا۔ اس نے فوراً ہیڈ کلرک سے پوچھا کہ کیا ایسا کوئی ضروری کام ہے کہ جس میں اس کی اشد ضرورت ہو۔ جب اس نے کہا ایسا کوئی کام نہیں تو ہمیں بغیر کچھ کہے جانے کو کہا گیا اور حکم دیا گیا کہ ہم دس دن کے اندر اندر سورت پہنچ جائیں۔

مجھے اس بات کا موقع ہی نہیں ملا کہ میں اپنے نئے آقا سے کچھ بات چیت کر سکتا۔ بہرحال میں نے مسٹر پیلی کا وہ خط اس کے حوالہ کیا کہ جو انہوں نے میرے بارے میں لکھا تھا۔ اس نے ناگواری کے ساتھ میرے ہاتھ سے لیا' اس پر ایک سرسری نظر ڈالی اور فوراً ہی اسے پھاڑ دیا۔ اس کے بعد کہنے لگا کہ اسے مجھ سے اور کچھ نہیں کہنا سوائے اس کے کہ جو وہ ہیڈ کلرک سے کہہ چکا ہے اور یہ کہ کیپٹن جیکب اسے میرے بارے میں کچھ باتیں بتا چکا ہے۔ مجھے اس کا یہ انداز گفتگو اور اس کی اکڑ ذرا بھی اچھی نہیں لگی۔ دل تو یہ چاہا کہ میں اپنا استعفیٰ اسی وقت دے دوں۔ لیکن ہیڈ کلرک جو میرے ساتھ کھڑا تھا اور جس نے میرے چہرے کو دیکھ کر میرے خیالات و جذبات کا اندازہ لگا لیا تھا' میرے ہاتھ کو دبا کر منع کیا کہ میں خاموش رہوں۔ چنانچہ میں نے مسٹر لانگ فورڈ کو کچھ کہے بغیر شب بخیر کہا۔ واپس گھر جاتے ہوئے میں نے اپنے دوست بیز نجی' ہیڈ کلرک سے کہا کہ اس ملاقات کے بعد میں آنریبل کمپنی کی ملازمت سے متنفر ہوگیا ہوں کیونکہ اس میں وقتاً" فوقتاً" نئے آقا کے آنے پر انسان کو ذلیل و خوار ہونا پڑتا ہے۔ "کیا تم نے نہیں سنا" میں نے کہا "لانگ فورڈ نے کہا ہے کہ اس نے میرے بارے میں کیپٹن جیکب سے کچھ سنا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ یہ میرے حق میں نہیں ہوگا۔ اس لئے مجھے امید نہیں کہ اب میرا یہاں پرموشن ہو۔"

اس پر بازنجی نے جواب دیا کہ "اس پر گھبرانے کی کیا ضرورت ہے۔ مسٹر لانگ فورڈ ہمیشہ تو اس دفتر کا انچارج نہیں رہے گا۔ یہ تو صرف مسٹر پیلی کی جگہ کام کررہا ہے۔"

سرائے تک پہنچتے پہنچتے ہماری گفتگو ختم ہوگئی جہاں ہمارا استقبال مالک کی خوبصورت اور دلکش بیٹی نے اپنی میٹھی مسکراہٹوں سے کیا جسکو دیکھ کر میں اپنے تمام غم بھول گیا۔ ہم نے شام کا کھانا' جو اس پری پیکر نے کھلایا' اسے کھا کر اگلی صبح کے سفر کی تیاریاں کیں' گاڑیوں کا انتظام کرنے کے بعد ہم آرام سے سونے چلے گئے۔

یکم اپریل صبح ہم بندرا سے سورت کے لئے روانہ ہوگئے۔ ہم نے یہ سفر آرام سے کیا۔ راستے میں کئی جگہ گاڑیاں بدلیں' اس طرح آٹھ تاریخ کو بحفاظت اپنی منزل پر پہنچ گئے۔

20 نومبر کو مسٹر لانگ فورڈ نے مجھے حکم دیا کہ میں اس کے ساتھ کمبے چلوں جہاں اسے نواب سے اس علاقے کی نمک کی کانوں کے سلسلہ میں معاہدے میں میری مدد کی ضرورت تھی۔ 24 تاریخ کو میں دفتر کے کلرکوں کے ساتھ سورت سے کمبے جانے کے لئے روانہ ہوگیا۔ وہاں ہم 28 تاریخ کو پہنچ گئے۔ وہاں جانے کے فورا بعد گوپال بھائی جو کہ مقامی دفتر کا انچارج تھا' اسے اور مجھے یہ ہدایت ملی کہ نواب کی خدمت میں حاضر ہوا جائے اور نواب کو اس بات پر تیار کیا جائے کہ مسٹر لانگ فورڈ کے معاہدے کو بغیر کسی حیل و حجت کے فورا قبول کرلے۔ میں نے اور میرے ساتھی نے دربار کا لباس پہنا اور ساڑھے دس بجے دربار کے لئے روانہ ہوئے۔ ہزہائی نس کو چونکہ پہلے سے ہماری آمد کی اطلاع تھی۔ اس لئے ہمارا استقبال دربار کے ایک عہدیدار نے کیا اور ایک بڑے ہال میں اس کی حاضری میں لے جایا گیا۔ نواب اٹھارہ سال کا ایک نوجوان تھا جو کہ مسند پر گاؤ تکیوں کے سہارے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی حاضری میں اس وقت چار مصاحب تھے جو اسکے دائیں جانب تھوڑے فاصلے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دیکھنے میں یہ لوگ شریف نظر آتے تھے۔ نواب کے پیچھے گیلری کی کھڑکی میں پردے کے پیچھے ایک اور شخص بھی بیٹھا ہوا تھا جو دربار کی تمام کارروائی کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ ہمیں اس آدمی کا سر تو نظر آیا' مگر ہم پہچان نہیں سکے کہ وہ کون ہے اور وہاں کیا کررہا ہے؟ بعد میں ہمیں بتایا گیا کہ وہ نواب کا چچا ہے۔ جس کی لڑکی سے نواب کی شادی ہوئی ہے۔ وہ ہمیشہ اس پر نظر رکھتا ہے اور وہی ریاست کے انتظامات کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ مجموعی طور پر اگرچہ دربار میں ایشائی شان و شوکت و رعب و دبدبہ تو نہیں تھا مگر پھر بھی وہاں ریاست کی شان ضرور تھی جو کہ ایسے موقعوں پر ہوتی ہے۔

ہم ہزہائی نس کے سامنے بیٹھے۔ ایک دوسرے کی خیروعافیت دریافت کرنے کے بعد تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ میرا ساتھی' اگرچہ اعلیٰ عہدے پر تھا' مگر دربار کے ادب آداب سے واقفیت نہیں رکھتا۔ پہلے آہستگی کے ساتھ مجھ سے کہا کہ میں نواب سے اپنے مشن کے بارے میں بات کروں۔ میں نے نواب کو لانگ فورڈ کی جانب سے سلام پہنچایا۔ اس کے بعد میں نے اپنی تقریر شروع کی اور اس میں برطانوی حکومت کی طاقت کو بیان کرنے کے بعد بتایا کہ وہ انصاف و عدل کے ساتھ اپنی رعیت پر حکومت کر رہی ہے۔ اس کے بعد میں نے اس کے علاقہ کی نمک کی کانوں کی بات کی اور اسے بتایا کہ یہ اس کی حکومت کے لئے مشکل ہے کہ نمک کی تجارت میں ریاستی عہدے دار جو بدعنوانیاں کرتے ہیں اور حکومت کی آمدنی کو نقصان پہنچاتے ہیں اسے روکا جائے' اس لئے یہ اس کے مفاد میں ہے کہ انہیں برطانوی انتظامیہ کے حوالے کردے۔ نواب نے یہ پوری گفتگو بڑے غور سے سنی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس میں اتنی اہلیت یا طاقت نہیں کہ اس پر ہاں یا نہ کہے۔ یا بطور اقرار و انکار سرہلا کر اپنی رائے کا اظہار کرے۔ جب میں نے یہ صورتحال دیکھی تو میں نے اس سے یہ سوال کیا کہ اگر وہ اس منصوبہ کو جو اس کے سامنے پیش کیا گیا منظور نہیں کرتا ہے تو وہ اس کا فوری طور پر جواب دے تاکہ ہم مسٹر لانگ فورڈ کو مطلع کرسکیں کہ وہ اسکا کوئی دوسرا حل تلاش کریں۔

"درست" ہزہائی نس نے کہا: "یہ مت سوچو کہ جو کچھ کہا ہے میں اسے نامنظور کرتا ہوں۔ دوپہر میں' میں مسٹر لانگ فورڈ سے ملنے والا ہوں' اس معاملہ کا میں ان کے ساتھ فیصلہ کرلوں گا۔" لہٰذا ہم جو چاہتے تھے' اس کو حاصل کرنے کے بعد ہم نے اجازت لی اور انگریزی فیکٹری میں واپس آگئے۔

واپسی پر میں نے دربار کی ملاقات پر اپنی رپورٹ تیار کی اور اسے مسٹر لانگ فورڈ کی خدمت میں پیش کیا جس نے اس کی بہت تعریف کی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ چونکہ اب یہاں میری ضرورت نہیں ہے اس لئے بہتر یہ ہے کہ میں دوبارہ سورت چلا جاؤں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ میری فرض کی ادائیگی سے مطمئن ہے اور جیسے ہی موقع ملے گا وہ میرے پروموشن کے لئے کوشش کرے گا۔ میں نے اپنے بارے میں اس کی رائے پر شکریہ ادا کیا اور واپسی کی تیاریاں شروع کردیں۔ ہمارا سورت واپسی کا سفر کافی تیز تھا۔ یکم دسمبر کو میں نے یہاں کے دفتر میں آنے کی رپورٹ کردی۔ لیکن جب میں نے سنا کہ مسٹر لانگ فورڈ ہمیں ایک غیر صحت افزا مقام پر بھیجنے کا سوچ رہے ہیں تو اس پر میں نے اپنا استعفیٰ پیش

کردیا۔

اس طرح میں دفتر کی غلامی سے آزاد ہوا کہ جس نے میری زندگی کے سات سال یہاں پورے کرائے تھے یہاں ہر روز تیس روپیہ مہینہ کی خاطر میں اپنے فرائض سرانجام دیتا تھا۔ اب میں نے سہولت سے اپنا وقت انگریز شاگردوں کو پڑھانے پر لگا دیا۔ ان ہی میں سے ایک مسٹر سی جے ارسکن تھا۔ یہ ایک اعلیٰ صلاحیتوں اور خوبیوں کا نوجوان تھا جس کو میں بہت پسند کرتا تھا۔ وہ علم کو حاصل کرنے کا اس قدر شوقین تھا کہ چند مہینوں کے اندر اندر اس نے ہندوستانی، گجراتی اور فارسی زبانوں میں مہارت حاصل کرلی۔ اس نے میرا معاوضہ بھی خاطر خواہ دیا۔ اگرچہ اس زمانہ میں میری مالی حالت اچھی تھی، لیکن آمدنی و اخراجات کی وجہ سے میں عدم تحفظ کا شکار تھا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ میں کوئی مستقل ملازمت اختیار کروں۔ لہٰذا اس کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے میر سرفراز علی کو لکھا۔ 13 اپریل کو مجھے یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ میں اس امیر کے ایک لڑکے کو روز ایک گھنٹہ انگریزی زبان سکھاؤں۔ اگرچہ میری تنخواہ معمولی تھی، مگر چند روز بعد ہی میں میرے شاگرد نے محسوس کیا کہ زبان سیکھنے کے لئے ایک گھنٹہ کافی نہیں ہے۔ اس نے میری تنخواہ بڑھا کر پچاس روپیہ مہینہ کردی۔ ساتھ ہی میں مفت کھانا اور گاڑی کا انتظام تھا۔ اس پر میں نے اپنے سارے انگریز شاگردوں کو سوائے مسٹر ارسکن کے چھوڑ دیا۔

نواب بھی مجھے اپنے اس داماد کی ملازمت میں دیکھ کر خوش ہوا کہ جو سورت میں رہ گیا تھا۔ دوسرا داماد بیوی کی وفات پر بروڈہ چلا گیا تھا۔ اس نے مجھے گولڈ سمتھ کی نیچرل ہسٹری تحفہ میں دی۔ یہ اسے کسی انگریز دوست نے دی تھی۔ اس نے یہ درخواست بھی کہ میں اس کا فارسی میں ترجمہ کروں اور وہ میری اس محنت کے عوض مجھے معقول رقم دے گا۔ میں نے اس کی یہ پیشکش بڑی خوشی سے قبول کرلی۔ میں نے تقریباً دو سو صفحات ترجمہ کئے۔ میں جیسے جیسے ترجمہ کرتا اس کو فوراً نواب کی خدمت میں لے جاتا جو ہر صفحہ کو بڑے شوق سے پڑھتا پھر اسے حفاظت سے رکھتا۔

7 اگست کو مجھے میر جعفر علی خاں کا ایک رقعہ ملا جس میں مجھ سے درخواست کی گئی تھی کہ میں فوراً نواب کی خدمت میں حاضر ہوں کیونکہ وہ ہیضہ کی بیماری میں مبتلا ہے۔ یہ بیماری اسے اس وقت لگی کہ جب وہ اسٹیمر کارنگ کو دیکھ کر واپس آرہا تھا۔ اس رقعہ کو دیکھتے ہی میں فوراً محل کی طرف بھاگا۔ وہاں پہنچنے پر میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر جے ٹاس ہزہائی نس کے کمرہ سے ہدایات دیتا ہوا نکل رہا تھا۔ اس کے ساتھ پارسی ایجنٹ تھا۔ میں کمرہ میں

داخل ہوا تو میں نے نواب کو بری حالت میں دیکھا۔ اس کا چہرہ بدل گیا تھا' آنکھیں دھنس گئیں تھیں' آواز کمزور ہو گئی تھی۔ درحقیقت میں نے اسے جس حالت میں دیکھا وہاں دوا کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے فلسفی وزیر اور اس کے لال بجھکڑ مصاحبوں نے اس کی زندگی کے دن پورے کرانے میں اس کی بہت مدد کی۔ مجھے اس کو اس حالت میں دیکھ کر افسوس ہوا اور سوچنے لگا کہ اس کی تمام دولت' طاقت اور شان و شوکت اس کی زندگی بچانے میں کوئی مدد نہیں کر سکتی ہیں۔

اسی دوران میں اطلاع دی گئی کہ نواب کی چہیتی بیوی اور لڑکی اس سے ملنے آرہی ہیں اس پر ہم سب لوگ فوراً کمرے سے باہر چلے گئے۔ ان ملاقاتوں نے بوڑھے آدمی کے بقیہ ہوش و حواس کو اور بھی ختم کردیا۔ آخرکار چار بجے کے قریب موت نے اسے ان تمام پریشانیوں سے نجات دلا دی۔ اس طرح انسٹھ سال کی عمر میں اس کی وفات ہوئی۔ اکتیس سال تک اس نے بطور نواب عیش کی زندگی گزاری۔

اس موقع پر اس کے نوجوان داماد کا غم' پریشانی اور زبوں حالی بیان کرنے سے باہر ہے۔ میں نے اس کو سمجھایا کہ بہتر یہ ہے کہ وہ فوراً ایک خط اپنے باپ کو بڑودہ میں لکھے کیونکہ اس وقت اسے ایسے شخص کی ضرورت ہے جسے تجربہ ہو اور جو حالات سے نمٹنا جانتا ہو۔ اس کے بعد میری درخواست پر اس نے شاہی خزانہ پر مہر لگوا دی کہ جس میں تمام حساب کتاب اور سرکاری ریکارڈ تھا۔ صبح کو ہم نے خزانہ کی مہر توڑ کر وہاں سے تجہیز و تکفین کے لئے روپیہ لینا چاہا تو یہ دیکھ کر ہماری حیرانی کی انتہا نہیں رہی کہ صندوق میں کوئی روپیہ نہیں تھا۔ جبکہ 8333 روپیہ پانچ آنے اور چار پیسے نواب کی پنشن کی رقم کلکٹر کے خزانہ سے چند دن ہوئے آئی تھی۔ وزیر نے ظاہر یہ کیا کہ وہ اپنے آقا کی وفات پر اس قدر صدمہ کا شکار ہے کہ اسے کچھ پتہ نہیں کہ یہ روپیہ وہاں سے کیسے غائب ہوگیا۔ اس کے ماتحت بھی اس معاملہ پر خاموش رہے۔ ان کمروں کو دوبارہ سے تالہ لگایا گیا اور مہربند کردیا گیا۔ میر جعفر علی نے اپنے بینکر سے پانچ سو روپیہ تجہیز و تکفین کے لئے لئے۔ یہ بھی دنیا کے تماشے ہیں کہ ایک شخص جس کی سالانہ آمدنی دو لاکھ روپیہ ہو' جب وہ مرے تو اس کے پاس اس قدر روپیہ بھی نہ ہوں کہ اس کے آخری سفر کی تیاری کی جا سکے۔

نواب کے مرنے کے بعد اس کے دادا کے رشتہ دار اور اس کی بیوی کہ جسے اس نے نظرانداز کردیا تھا ان سب نے مل کر مرنے والے کے خاندان سے انتقام لینے کی تیاریاں شروع کردیں۔

دونوں مخالف جماعتوں نے ایک دوسرے پر الزامات لگا کر حکومت کو درخواستیں بھیجنی شروع کردیں۔ اس موقع پر یہ مناسب سمجھا گیا کہ میر سرفراز علی کو بمبئی جانا چاہئے تاکہ وہ وہاں جاکر بذات خود اپنے لڑکے' بہو' اور اس کے بچوں کے لئے حکومت سے اپیل کرسکے۔ اس مقصد کے لئے اس نے مجھ سے ساتھ چلنے کی درخواست کی' لہٰذا تین اکتوبر کو میں سورت سے بمبئی کے لئے اس بوڑھے شریف آدمی کے ساتھ روانہ ہوا کہ جس کی خوشگوار اور قابل قدر صحبت میں' میں نے دو مہینے گزارے۔ میں نے اس کی جانب سے حکومت کے لئے دو درخواستیں تیار کیں جسے اس نے بہت زیادہ پسند کیا اور خوش ہوکر مجھے پانچ سو روپیہ کا انعام دیا۔ اس کے علاوہ اس نے ایک تعریفی خط اپنے ہاتھ سے لکھ کر مجھے بھجوایا۔ جسے میں نے اپنے ریکارڈ میں بطور یادگار رکھ لیا۔ وہ آنریبل گورنر سے تین مرتبہ ملا۔ اس کے بعد اسے حکومت کی طرف سے جواب دیا گیا کہ اس کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا جائے گا۔ جواب ملنے کے بعد ہم نے واپس سورت جانے کی تیاریاں شروع کردیں اور اس طرح یکم دسمبر کو واپس پہنچ گئے۔ چند دنوں بعد ہی مرحوم نواب کی جائیداد کو حکومت نے ضبط کرلیا جبکہ دونوں پارٹیاں اس توقع میں ہیں کہ حکومت اعلیہ سے کیا احکامات آتے ہیں اور انہیں اس میں سے کس قدر حصہ ملتا ہے۔

28 تاریخ کو سورت کے مجسٹریٹ نے مجھ سے درخواست کی کہ میں فوراً راجکوٹ میں پولیٹکل ایجنٹ کے پاس بطور شہادت پیش ہوں۔ میں فوراً راجکوٹ کے لئے روانہ ہوا اور وہاں مجھے چھ ہفتے گزارنا پڑے جس کی وجہ سے نہ صرف میرا مالی نقصان ہوا بلکہ پریشانی بھی ہوئی۔

نواب کی وفات کے چودہ مہینے بعد ہندوستان کی حکومت اعلیہ نے بمبئی حکومت کے ذریعہ یہ افسوسناک خبر پہنچائی کہ نواب کا خطاب ختم کردیا گیا ہے۔ اس کی تنخواہ بند کردی گئی ہے۔ اس کے وہ رشتہ دار کے جو واقعی مالی امداد کے مستحق ہیں انہیں حکومت کی جانب سے وظیفے ملیں گے۔ یہ خبر سن کر میرے امیر دوست اور اس کا خاندان ششدر رہ گئے۔ اس فیصلہ پر میر جعفر نے اپنے بڑوں سے مشورہ کیا۔ انہوں نے رائے دی کہ وہ بمبئی جاکر اپنا کیس حکومت کے سامنے پیش کرے۔ اگر اسے وہاں کامیابی نہیں ہوتی ہے تو پھر اسے انگلستان جانا چاہئے۔ اس رائے کی روشنی میں اس نے خشکی کے ذریعہ پریذیڈنسی جانے کی تیاریاں شروع کردیں۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ ہمارے ماہر نجوم نے نیک ساعت مقرر کرکے ہمارے سفر کے دن کا تعین کیا۔ اس طرح دسمبر کے مہینہ میں ہم

ایک بار پھر سورت سے بمبئی کے لئے روانہ ہوئے۔ اس بار سفر میں ہم شکار کرتے ہوئے گئے اور دسمبر کے آخر میں منزل مقصود پر پہنچے۔ ہم نے بمبئی میں پانچ ہفتہ قیام کیا۔ اس عرصہ میں میر جعفر علی خاں نے گورنر سے تین مرتبہ ملاقات کی اور اپنا مقدمہ تحریری طور پر حکومت کے سامنے پیش کیا۔ مگر جب اسے کوئی فیصلہ کن جواب نہیں ملا تو یہی طے پایا کہ انگلستان جایا جائے اور وہاں اپیل کی جائے۔ اس سفر کے لئے اس نے ایک انگریز مسٹر۔ ٹی ۔ جے ۔ اے اسکاٹ اور مجھے بطور سیکرٹری اور مترجم کے ساتھ چلنے کی درخواست کی۔

چار فروری کو ہم سورت روانہ ہوئے تاکہ انگلستان کے طویل سفر پر جانے کی تیاری کریں۔ 12 مارچ 1844ء کو ہم اپنے گھر والوں اور دوستوں سے رخصت ہوکر سیلون کے راستہ دنیا کے دوسرے کونے پر جانے کے لئے روانہ ہوئے۔ سیلون تک کے سفر کے لئے ہم نے سر جیمس کارنک نامی اسٹیمر کو کرایہ پر لیا۔ وہاں پہنچ کر ہم ایک بڑے جہاز پر سوار ہوئے جس کا نام بینٹنک تھا اور جو پی اینڈ او کمپنی سے تعلق رکھتا تھا۔

تیرھواں باب

13 تاریخ کی دوپہر کو ہم نے اپنے ذاتی اور سرکاری معاملات کو نمٹایا اور دوسری صبح کو ہم خدا کا نام لے کر کہ جس کی ذات کی لامحدود دانشمندی کے ایک ایٹم میں ہماری پوری سائنس ابد تا ابد قائم رہنے والی ہے' اس طویل سفر پر روانہ ہوئے۔ چار تاریخ کو ہم نے دور سے ون گورلا دیکھا۔ 15 تاریخ کو پرتگیزیوں کی نوآباد گوا سے گزرے۔ 16 کو پیجن جزیرے سے گزرتے ہوئے منگلور کو دیکھا۔ 17 کو کالی کٹ و کوچین کو دیکھا۔ 18 تاریخ کو تین بجے موسم اس قدر خراب ہوگیا کہ نہ صرف ہمارے ساتھی عبادت و دعا میں مصروف ہوگئے بلکہ جہاز کا عملہ بھی اس صورتحال سے پریشان ہوگیا۔ کپتان دوولیرگر جو ایک فرانسیسی تھا' اور اس جہاز کو کمانڈ کررہا تھا' اضطرار کے عالم میں منہ میں سگار دبائے اور شراب کا نشہ دماغ میں لئے کبھی اوپر چلا تھا اور کبھی نیچے۔ چونکہ میں اس کی چہل قدمی کے راستہ میں بیٹھا ہوا تھا' اس لئے ہر بار وہ میرے قریب سے گزرتا تھا۔ اس لئے ایک بار رک کر وہ مجھ سے کہنے لگا کہ:

"میرے دوست ہزہائی نس اور ان کے ساتھیوں سے کہو کہ مردوں جیسا حوصلہ رکھیں اور ذرا سی ہوا کے زور سے نہ ڈریں۔" اسی شام کو ہم نے کیمپ کیمورن کو دیکھا۔ قدیم ہندوستان کی یہ چٹان خوبصورت منظر پیش کررہی تھی۔ موسم کل کی طرح سے دوسرے دن بھی اسی قدر سخت تھا' یہ موسم آنے والے دو دنوں میں اسی طرح سے رہا۔ اب میں نے بھی خود کو اضطراری عالم میں پایا۔ چونکہ ہچکولوں کی وجہ سے طبیعت کافی خراب ہوگئی تھی اور اس نے بے آرامی میں اضافہ کردیا تھا۔ کپتان دوویرگر نے بتایا کہ ہم گلف آف منار آدم کے پل کے سامنے ہیں یہاں پر ہمیشہ طوفانی موسم رہتا ہے۔ اس لئے اس سے گزر کر حالات بہتر ہو جائیں گے۔ اس کی یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی اور 20 تاریخ کی صبح کو ہم نے سیلون کے خوبصورت پوائنٹ دوگال کو دیکھا کہ جو ہم سے چالیس میل کے فاصلہ پر ہوگا۔

سیلون کے خوبصورت جزیرے کا منظر اتنا ہی دلکش ہوتا چلا گیا جتنا کہ ہم اس کے قریب

ہوتے چلے گئے۔ آخر کار ہم بندرگاہ پر لنگرانداز ہوئے۔ وہاں پہنچتے ہی کالے رنگ کے مقامی باشندوں نے ہمیں گھیر لیا۔ انہیں سنہالی کہتے ہیں۔ یہ نام ان کے قدیم جزیرے سنگال دیپ کے نام سے ہے۔ ان کی زبان مجھے کرخت معلوم ہوئی' ایسے ہی جیسے کہ کسی مٹکے میں کنکریاں بھر کر اسے ہلاؤ اور اس سے جو آواز پیدا ہو' اسے سنہالی زبان سمجھ لو۔ لیکن وہ انگریزی اچھی بولتے ہیں۔ جب تک ہم جہاز سے اترتے اور اپنا سامان بندرگاہ تک لاتے اس وقت تک شام کا اندھیرا ہوگیا۔ اس جلدی میں ہمیں کہا گیا کہ ہم ایک انگلش ہوٹل میں قیام کریں لہٰذا ہم وہاں پہنچے اور آرام کے ساتھ وہاں پر رہائش اختیار کی۔

صبح صبح جب ہم سو کر اٹھے تو ہماری حیرانی اور کراہیت کی اس وقت انتہا نہیں رہی کہ جب ہم نے سوروں کے ایک غول کو بھاگتے' غراتے اور ڈھاڑتے ہوئے اپنے کمروں کے قریب دیکھا۔ اس نفرت انگیز منظر کو دیکھتے ہی ہم نے فیصلہ کرلیا کہ اس انگریز ہوٹل کو فوراً چھوڑ دینا چاہئے۔ ہمارے معلوم کرنے پر بتایا گیا کہ اس جزیزے میں کئی مسلمانوں کے گھر ہیں۔ ان میں سے ایک گھر ایک بہت ہی شریف آدمی جس کا نام مکا مورکر ہے اس کی ملکیت ہے۔ اس نے مہربانی کرتے ہوئے یہ ہمیں کرایہ پر دے دیا۔ جہاں ہم فوراً ہی چلے گئے۔ یہاں ہم اپنے میزبان کی مہمان نوازی سے بہت متاثر ہوئے۔ اس زمانہ کے عیسائیوں نے خود کی اصلاح کرنے کے بجائے اپنے مذہب کی اصلاح کردی ہے۔ وہ اپنی پارلیمینٹ کے قوانین کے تحت جو چاہتے ہیں وہ کھاتے اور پیتے ہیں اور قطعی توریت و بائبل کے اصولوں کی پروا نہیں کرتے ہیں۔

اس جزیرے کے جانور ہندوستان سے مختلف نہیں ہیں۔ سوائے چند کے' جن میں سے ہاتھی ایک ہے۔ یہاں کے ہاتھی' ہندوستان کے جنگلوں کے پرورش کردہ ہاتھیوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ خوبصورت ہوتے ہیں۔ یہاں پر بھورے اور سفید رنگ کے ہاتھی بھی نظر آئے جبکہ یہ ہندوستان میں کم ہی ملتے ہیں۔

دوسرے دن پانچ مقامی باشندے ہم سے ملاقات کے لئے آئے۔ یہ خوبصورت لوگ تھے جن کا گندمی رنگ چمک رہا تھا۔ ویسے پرانی طرز کے لمبے جبے پہنے ہوئے تھے۔ ان کے سروں پر گھیروالی خوبصورت پگڑیاں تھیں۔ انہوں نے جب خود کو متعارف کرایا تو معلوم ہوا کہ جزیزہ کے سابق حکمرانوں کے وزیروں اوران کے اعلیٰ عہدیداروں کے خاندان سے تھے۔ اگرچہ ان کا اقتدار مکمل طور پر ختم ہو چکا تھا مگر مٹی ہوئی شان و شوکت ان کے چہروں سے نظر آتی تھی۔ ان سے میری جو گفتگو ہوئی اس سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ یہ

لوگ نہ صرف ذہین بلکہ تمام معاملات سے باخبر تھے۔ اس ملک کی آبادی بدھ مت کو ماننے والی ہے۔ عام آدمی کو مرنے کے بعد دفن کیا جاتا ہے جبکہ بدھست بھکشو کو مرنے کے بعد جلایا جاتا ہے۔ اس جزیرہ میں دو عام بیماریاں ہیں۔ ایک کوڑھ اور دوسری نیل پا۔

22 تاریخ کو صبح مجھے احمد لبا نامی ایک مسلمان کی جانب سے دعوت نامہ ملا کہ میں اس کے ساتھ اس کے گاؤں کے مکان پر ناشتہ کروں۔ یہ مکان دارچینی کے ایک باغ میں واقع تھا۔ صبح کو آٹھ بجے میں نے گاڑی میں اس جزیرے کے دیہات کو دیکھا' یہ ہر طرف سبز اور خوبصورت درختوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ راستہ میں جگہ جگہ پانی کے چشمے اور جھیلیں تھیں۔ میں اس کو سفر نہیں کہوں گا کیونکہ ایسا ہی تھا کہ جیسے کوئی باغ میں چہل قدمی کرے اور تازہ ہوا و خوشبو سے خود کو تازہ دم کرے۔ جب میں اپنے میزبان کے باغ والے مکان پہنچا تو یہاں میرا استقبال بڑی گرمجوشی سے کیا گیا۔ چونکہ ہم ایک دوسرے کی زبان نہیں جانتے تھے اس لئے انگریزی میں گفتگو ہوئی۔ اس زبان میں میرا میزبان مہارت رکھتا تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے میں نے اس شاندار باغ میں اس کے ساتھ چہل قدمی کی اس نے دارچینی کے علاوہ دوسرے مسالہ جات کے درخت دکھائے جیسے الائچی' لونگ اور جائفل۔ اس پرمسرت اور پر علم چہل قدمی کے بعد ہم ناشتہ کے لئے میز پر آئے۔ جہاں موسم کے مطابق خوش ذائقہ کھانے چنے ہوئے تھے اسی دوران میں ایک بذلہ سنج نوجوان جو لبا کا رشتہ دار تھا اور جس کا نام تمبے صاحب تھا' وہ ناشتہ کے لئے ہمارے ساتھ شریک ہوا۔ میرے میزبان نے اس سے چائے بنانے کو کہا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرانی ہوئی کہ دودھ اور شکر کی جگہ جیساکہ ہمارا دستور ہے' اس نے نمک' کالی مرچیں اور گھی کی کافی مقدار ملائی۔ لہٰذا وہ چائے جو میں نے وہاں پی میرے لئے وہ کسی بھی بدذائقہ دوا سے کم نہ تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اپنے دوستوں کو ناراض کروں' اس لئے کھاتے وقت میں اس کی چند گھونٹیں پی لیا کرتا تھا اور ظاہر یہ کرتا تھا کہ میں اس سے ذائقہ سے لطف اندوز ہورہا ہوں۔ بدقسمتی سے تھوڑی تھوڑی کرکے پینے کو میرے میزبانوں نے یہ سمجھا کہ یہ مجھے پسند آئی ہے۔ اس لئے انہوں دوبارہ سے خاص میرے لئے چائے کے کپ کو بھر دیا۔ اب یہ مجھے پسند آتی یا نہ آتی میں نے اسے دوستانہ انداز میں اپنے حلق میں انڈیل لیا۔ تھوڑی دیر کے لئے تو میرے پیٹ میں ایک سنسنی پیدا ہوئی اور اس کے اثر سے مجھے متلی بھی ہونے لگی لیکن میں نے ان سب تکالیف کو ہمت سے برداشت کرلیا۔ یہاں میں ضرور کہوں گا یہ سب کچھ میری منافقت کی سزا تھی کہ جس کا میں حقدار تھا۔

جب ہم ناشتہ کر چکے تو وہ مجھے دوسرے کمرے میں لے گیا کہ جہاں حقہ لایا گیا جو ہم نے دل بھر کے پیا۔ یہاں ہم نے ہندوستان کی حکومت پر بات چیت کی۔ پھر اس سے رخصت ہو کر اپنی رہائش گاہ پر آیا۔ جب میں نے اپنے دوستوں کو یہ احوال سنایا تو وہ اس سے بڑے لطف اندوز ہوئے۔ لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے اس چائے کو پی کر ایک نیا تجربہ حاصل کیا۔ اس نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا بلکہ میرے لئے بطور دوا کام کیا۔

25 تاریخ کی صبح کو ہم نے بندرگاہ پر بڑی بھیانک آواز سنی۔ ہم بھاگ کر وہاں گئے تاکہ اس کا سبب معلوم کریں۔ ہم یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ اسٹیمر .بینٹنک سمندر کو چیرتا ہوا' اپنے چاروں پہیوں سے شور مچاتا اور آسمان کی طرف دھواں اڑاتا آرہا ہے۔ اگر آپ سمندر کے اس دیو کو دیکھ لیں تو آپ اس شیطان کے بارے میں سوچنا پڑے گا کہ جو چیختا' دھاڑتا سب کو نگلنے کے لئے چلا آرہا ہے۔ 26 تاریخ کو ہم اس قوی ہیکل جہاز میں سوار ہوئے اور خوبصورت سیلون کے جزیرے کو الوداع کہا۔

جہاز پر ہمیں اس کے کمانڈنگ افسر سے متعارف کرایا گیا۔ جس کا نام کیپٹن کیلاک تھا۔ وہ ایک عمدہ اخلاق کا شریف آدمی تھا کہ جس کا سائز جہاز کی مطابقت سے تھا۔ اس کے بعد ہمیں ہمارے کیبن دکھائے گئے۔ خوش قسمتی سے یہ جہاز کی دوسری اسٹوری پر تھے۔ جہاز اگرچہ بہت بڑا تھا' مگر ہم نے دیکھا کہ اس پر کافی ہجوم ہے۔ اس پر جہاز کے عملہ کے علاوہ تقریباً تین سو مسافر تھے۔ اڑھائی بجے لنگر اٹھایا گیا اور اسٹیمر اپنی طوفانی طاقت کے ساتھ جتنی تیزی سے ہو سکتا تھا روانہ ہوا۔ ہم سب نے خود کو جہاز پر آرام دہ پایا۔ اس کی وجہ یہ تھی جہاز کا کپتان اور اس کا عملہ مسافروں کی سہولت کا خیال رکھے ہوئے تھا۔ اس لئے مجھے یہ کہنے میں کوئی تردد نہیں کہ اس جہاز کے مسافر گھروں سے زیادہ یہاں آرام سے تھے۔ وہ انگریز کہ جو اس جہاز پر تھے وہ خوب کھانے و شراب پینے والے تھے۔ ان میں سب ہی چار' پانچ یا بعض تو چھ بار دن میں کھایا کرتے تھے۔ مجھے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ خود ہماری بھوک بھی کسی سے کم نہ تھی۔ ہمیں ہر قسم کا کھانا جس کی فرمائش کی جاتی تھی' فوراً مہیا کر دیا جاتا تھا۔ اس طرح ہمارے آرام کا ہر طرح سے خیال رکھا گیا۔

2 اپریل کو ہم نے سوکوترا جزیزہ کو دور سے دیکھا۔ اس کا اندازہ ہمیں ایک دن پہلے ہی ہو گیا تھا کیونکہ بہت سے سمندری پرندے اس سمت میں اڑ رہے تھے۔ یہ سمندری پرندہ بوسٹون ہے کہ جس کو قدرت نے سمندر کے اوپر اڑنے کی بے پناہ طاقت دی ہے۔ ہم نے

جس جگہ سے اس جزیرہ کو دیکھا تھا وہاں سے اس کا فاصلہ کوئی دو سو میل ہوگا۔ اس لئے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ پرندے صبح کو اڑتے ہوں گے اور شام کو آرام کی غرض سے واپس جزیرے میں چلے جاتے ہوں گے اس طرح یہ دن میں پانچ سو میل اڑتے ہوں گے۔ یہ قادر مطلق کی طاقت کا ایک نمونہ ہے۔ کائنات کے ایک ذرہ میں انسان اس کی شان اور آرٹ کو دیکھ سکتا ہے۔ اس کے لئے صرف دیکھنے والی آنکھ اور فہم کی ضرورت ہے۔ میں نے سمندر کے اس حصہ میں ایک اور حیرت ناک چیز دیکھی۔ اڑتی ہوئی مچھلیاں۔ اس جھتے میں جو کہ ہمارے اسٹیمر پر اڑتی ہوئی جا رہی تھیں' چند جہاز میں گر گئیں۔ ان میں سے ایک کو میں نے پکڑ لیا۔ اس کو قریب سے دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ ایک خوبصورت مخلوق ہے کہ جسے قدرت نے دو پر دیئے ہیں' ان میں سے ایک پانی میں استعمال ہوتا ہے' دوسرا ہوا میں اڑنے کے لئے جب اس کو فرائی کیا گیا تو یہ مزے میں بھی اچھی تھی۔

4 تاریخ کی صبح کو ہم عدن پہنچ کر لنگرانداز ہوئے۔ سیلون سے اس کا فاصلہ 2215 میل کا ہے۔ اب تک ہمارا یہ سفر انتہائی خوشگوار اور آرام دہ تھا۔ سیلون سے یہاں تک پانی بڑا پرسکون تھا۔ یہاں پہنچنے پر اجازت دی گئی کہ جس کی مرضی ہو وہ جہاز سے جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہم سب فوراً اترے اور آٹھ دن کے وقفہ کے بعد خود کو زمین کی آغوش میں پایا۔ یہاں پر پہیوں سے چلنے والی کوئی گاڑی نہیں ہوتی ہے' اس لئے ہمارے لئے سوائے اس کے اور کوئی دوسرا راستہ نہ تھا کہ گدھے کرایہ پر لے کر شہر دیکھنے جائیں۔ بندرگاہ سے شہر کا فاصلہ دس میل ہے۔ کچھ ملکوں کی خوبیاں دوسرے ملکوں کی برائیاں ہوتی ہیں۔ مثلاً ہندوستان میں گدھے پر سوار ہونا ذلت کی نشانی ہے۔ یہاں آپ کسی کو گدھے پر سوار نہیں دیکھیں گے سوائے مجرموں کے' جن کا منہ کالا کرکے انہیں گدھے پر الٹا کرکے بٹھایا جاتا ہے۔ ہماری جماعت کا سربراہ میر جعفر علی خاں کہ جن کا وزن سترہ اسٹون تھا' اس کے بارے میں خیال ہوا کہ کسی گدھے کے لئے اتنا وزن اٹھانا بڑا مشکل ہوگا۔ دوسرے وہ خود بھی اس کی سواری کے لئے تیار نہیں ہوا۔ اس نے ایک گدھے کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر ہوا میں بلند کیا اور اس کے عرب مالک سے کہا کہ جسے میں اپنے ہاتھوں سے اٹھا سکتا ہوں وہ کیسے میرا بوجھ برداشت کرسکتا ہے۔ اس دوران ایک خچر والا بری طرح سے بھاگتا ہوا آیا اور اس نے اپنے ایک موٹے خچر کو اس قوی ہیکل شخص کی خدمت میں پیش کیا۔ جن سے اس پیش کش کو فوراً قبول کیا اور اس شخص کو معاوضہ میں معقول رقم دی۔ اس کے بعد ہم گاؤں دیکھنے چلے۔ آپ نے جب تک اسے نہیں دیکھا ہے اسے شہر کہہ سکتے

ہیں۔ لیکن اگر آپ نے اسے دیکھ لیا تو مجھے یقین ہے کہ آپ اسے بدروحوں کی آماجگاہ کہیں گے۔ یہ نہ تو شہر ہے اور نہ گاؤں' بلکہ ویران پہاڑیوں کے درمیان جو غار ہے اس میں چند جھونپڑیاں ہیں جو کہ ایک سرکل میں واقع ہیں۔ ان سب کا کل رقبہ تین میل کے قریب ہوگا۔

جہاں تک اس کی فوجی اہمیت کا تعلق ہے تو یہ ایک اہم جگہ ہے۔ لیکن ضروری ہے کہ وہ یہاں مناسب دروازہ اور کچھ برج بنوائیں۔ مگر دوسری طرف جیسا کہ اس کا نام عدن ہے اور جس کے معنی جنت کے ہیں' یہ اس نام کے بالکل متضاد ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ نام اس کو اس اصول پر دیا گیا ہے جیساکہ ہم حبشی غلام کو کافور کہتے ہیں۔ جہاں تک آپ کی نظر جائے یہاں پر کوئی سبزہ او ردرخت نظر نہیں آتا ہے نہ ہی یہاں پر سوائے ایک کنویں کے کہیں تازہ پانی ملتا ہے۔ یہ کنواں حکومت کی نگرانی میں ہے اور پانی کو اونچی قیمت پر فروخت کیا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایک ایسی جگہ کے جہاں پانی ہو اور نہ سبزہ' وہاں جانوروں کے بارے کچھ اگر نہ کہا جائے تو بہتر ہے۔ یہاں کے لوگ مفلوک الحال اور دیکھنے میں انتہائی پنج نظر آتے ہیں۔ وہ ننگے پیر اور ننگے سر جسم پر صرف ایک لنگی لپیٹے رہتے ہیں۔ مجھے یہاں پر صرف پانچ یا چھ لوگ نظر آئے کہ جنھوں نے پگڑیاں باندھ رکھی تھیں۔ ان میں سے ایک ادریسی سید تھا' جوکہ ان غریب لوگوں کا امام ہے اور ایک شکستہ مسجد میں کہ جو گرنے والی ہے وہاں نماز پڑھاتا تھا۔ ہم نے ایک سایہ دار چھت کے نیچے قیام کیا کہ جو ایک ہندوستان تاجر کی تھی۔ یہاں ہم نے کھانا پکایا' کھایا' پھر سونے کے لئے لیٹ گئے۔ ہم اس قدر تھک گئے تھے کہ رات گہری نیند سوئے اور صبح اس وقت اٹھے کہ جب سورج کی شعاعیں ہمارے چہروں پر پڑیں۔ منہ ہاتھ دھوکر ناشتہ کے بعد ہم نے واپس اپنے اسٹیمر پر جانا چاہا مگر چونکہ یہ جمعہ کا دن تھا اس لئے یہ طے ہوا کہ ہم نماز کے بعد روانہ ہوں گے۔ نماز کے وقت پر ہم مسجد جانے کے لئے روانہ ہوئے کہ جہاں سے مکہ کا فاصلہ بھی زیادہ دور نہیں تھا۔ یہاں پر سید نے بڑا اچھا وعظ کیا اور نماز پڑھائی۔ اس کے بعد ہم بندرگاہ پہنچے اور وہاں جہاز پر سوار ہوکر عدن کو الوداع کیا۔

چھ تاریخ کو ہم باب المندب سے گزر کر بحر قلزوم میں داخل ہوئے۔ انگریز اس کو بحر مردار کہتے ہیں۔ دس بجے کے قریب موکا کے سامنے آئے اور سمندر کے بائیں جانب چھوٹے چھوٹے جزیروں کے پاس سے گزرے۔ میں نے قطب نما کے ذریعہ اس بات کو نوٹ کیا کہ اس جگہ مکہ مشرق سے آہستہ آہستہ ہٹ رہا ہے۔ جب میں نے یہ بات اپنے

ساتھیوں کو بتائی تو وہ اس پر یقین کرنے کے بجائے مجھ پر ہنسنے لگے اور کہنے لگے کہ انگریزی کتابوں کے پڑھنے کے بعد میرے مذہبی عقائد کمزور ہوگئے ہیں۔ "یہ کیسے ممکن ہے؟" انہوں نے کہا کہ "کعبہ' خدا کا مقدس گھر اور اس کائنات کا مرکز' کیسے اپنی جگہ بدل سکتا ہے۔"

دوسرے نے مذاق میں کہا کہ "اس نے یقیناً اپنے انگریز دوستوں کے ساتھ مل کر خوب شراب پی لی ہوگی' اس لئے یہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ حقیقت سے دور ہے۔" اس دوران گفتگو میں میرے تیسرے دوست نے کہ جو ایک حکیم تھا' نشست پر پہلو بدلتے ہوئے اپنے نوجوان آقا سے کہا: "کیا ہزہائی نس نے اس سے پہلے اس قسم کی نامعقول باتیں سنی ہیں؟ ہر وہ شخص کے جو صحیح الدماغ ہے کبھی یہ نہیں کہے گا کہ کعبہ اپنی پوزیشن بدل سکتا ہے۔"

ان تمام باتوں کو میں نے خاموشی سے بغیر ایک لفظ بولے سنا۔ اس کے بعد میں نے اپنے موقف کو ایک اور ثبوت کے ساتھ دہرایا۔ ایک عرب ملاح جو عدن سے ہمارے جہاز پر آیا تھا اس نے دوپہر کی نماز اسی سمت میں پڑھی جس کی جانب میں نے بتایا تھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس عرب نے اسی سمت نماز پڑھی جس کا اشارہ میں نے کیا تھا؟" میں نے یہ بات اپنے دوستوں سے پوچھی۔

انہوں نے فوراً جواب دیا کہ "ہمارا خیال ہے کہ وہ یہودی ہے' لیکن ہم ایک مترجم کے ذریعہ اس سے کچھ سوالات پوچھیں گے اور اس اہم موضوع پر اس سے تشفی چاہیں گے۔" انہوں نے ایسا ہی کیا' اور اپنی حماقت کا انہیں اچھا صلہ ملا۔ سب سے پہلے تو یہ ہوا کہ ایک نوجوان فرانسیسی جو مترجم تھا' اس سوال کے پوچھنے پر خوب ہنسا' دوسرے اس بدو عرب نے اس کا بڑا طنزیہ جواب دیا اور کہنے لگا کہ سویز اور قاہرہ میں کہ جہاں مسلمان آباد ہیں وہ سب اس سمت میں نماز پڑھتے ہیں۔ "اگر تم ہندوستانی" اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا "اس خدا اور اس کے پیغمبر پر ایمان رکھتے ہو تو جیسا وہ کرتے ہیں اس پر عمل کرو' اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو پھر جہنم کی آگ کے لئے تیار رہو۔"

رات کو ہم نے شہر جدہ کی روشنیاں دیکھیں' وہ مشہور بندرگاہ کہ جہاں تمام ہندوستان کے مسلمان جو حج کے لئے جاتے ہیں' پہلے یہاں پر جہاز سے اترتے ہیں جہاں تک لفظ جدہ' جس کے معنی دادی کے ہیں' اس کا تعلق ہے' میں نے کسی کتاب میں پڑھا ہے کہ جب ہمارے جدامجد کو جنت سے نکالا گیا تو حضرت آدم کو سیلون میں پھینکا گیا اور حوا اس علاقہ میں آئیں۔ وہ دونوں کچھ عرصہ ویرانوں میں بھٹکتے رہے۔ آخرکار وہ دونوں یروشلم کی مقدس

زمین پر ایک دوسرے سے ملے۔ بوڑھی خاتون نے جیساکہ کہا جاتا ہے' آخری عمر میں یہ خواہش ظاہر کی کہ اسے اس سرزمین پر لے جایا جائے کہ جہاں اس نے پہلی مرتبہ قدم رکھے تھے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ جب یہاں اس کا انتقال ہوا تو اسے اسی جگہ دفن کیا گیا۔ چنانچہ زمانہ قدیم سے اس جگہ کو جدہ کہا جاتا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ اس شہر کے کسی علاقہ میں ایک بڑے سائز کی قبر ہے جو اماں حوا کا مزار کہلاتا ہے۔

7 اور 8 اپریل کے دن آرام سے گزرے۔ لیکن آٹھ تاریخ کو شمال کی جانب سے چلنے والی ہوا کی وجہ سے سمندر طوفانی ہوگیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ عام طور سے سمندر کا یہ حصہ ہمیشہ طلاطم کی حالت میں رہتا ہے۔ یہ صورت حال 12 کی شام تک رہی' یہاں تک کہ ہم سویز کی بندرگاہ پہنچ گئے۔ یہ عدن سے 1300 میل کے فاصلہ پر ہے۔ ہم جہاز سے ایک کشتی میں سوار ہوئے تاکہ وہ ہمیں بندرگاہ تک لے جائے۔ اس کشتی کو چونکہ ہم نے کرایہ پر لیا تھا اس لئے اس میں ہم آٹھ ہندوستانی انگریز سیکرٹری مسٹرٹی جے اے اسکاٹ اور اس کی بیوی و بچے کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ اس کشتی میں ہمیں سردی اور دوسری تکالیف کا تجربہ ہوا۔ چونکہ سمندر میں پانی نیچے چلا گیا تھا اس لئے وہ زمین میں دھنس جاتی تھی۔ شام ہوتے ہوتے اس قدر سردی ہوگئی تھی کہ اس نے ہم سب کو بے چین کردیا۔ سب سے زیادہ بری حالت میر جعفر علی خاں کی ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اپنی حماقت سے اپنے کوٹ کو اسٹیمر پر ہی چھوڑ دیا تھا۔ میں نے اسے اپنا کوٹ دینا چاہا مگر اس نے مہذب انداز میں میری پیشکش کو قبول نہیں کیا اور کہا یہ کہ یہ اس کے سائز سے بہت چھوٹا ہے۔ اسی دوران میں اس نے مشورہ دیا کہ دو کمبل کشتی میں پڑے ہیں جن کے مالک کے بارے میں کسی کو علم نہیں۔ ان میں سے ایک مسٹر اسکاٹ نے لے لیا ہے۔ کیا میں دوسرا کمبل اس کے لئے لا سکتا ہوں؟ جب میں وہ کمبل لینے گیا تو مسٹر اسکاٹ نے مجھے اس کے لینے سے روک دیا اور مجھ سے اس طرح سے مخاطب ہوا کہ جیسے ہم ایک دوسرے سے بالکل واقف نہیں۔ اس نے کہا کہ چونکہ وہ پہلا ہے کہ جس نے اس کمبل کو لیا ہے' اس لئے اب وہ اپنے باپ پیٹر کو بھی یہ کمبل لینے نہیں دے گا۔ میں نے اس سے ملامت سے کہا کہ اس کمبل کی مجھ کو ضرورت نہیں بلکہ یہ تمہارے آقا کے لئے چاہئے۔ اس پر اس نے جواب دیا کہ "اپنے آقا سے جاکر کہہ دو کہ میں اس دنیا میں کسی اور کے لئے مرنے پر تیار نہیں۔" لیکن یہ سب کچھ آقا سے کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی کیونکہ وہ یہ سب کچھ سن رہا تھا اور دیکھ بھی رہا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزوں کے کردار میں کس

قدر خود غرضی چھپی ہوئی ہے۔

شام کو ساڑھے سات بجے ہم سویز کی گودی میں پہنچے۔ وہاں سے ہمیں ایک سرائے میں لے جایا گیا۔ خدا کا شکر کہ ہمیں آرام دہ کمرے، عمدہ کھانا اور صاف ستھرے بستر ملے۔ دوپہر کی تکالیف کے بعد کہ ہم سب نے برداشت کیا تھا جب میں نے دیکھا کہ قاہرہ کی نارنگیاں فروخت کرنے کے لئے ہوٹل میں لائی گئیں تو میں نے چند خرید لیں۔ وہ مٹھاس اور خوشبو میں اس قدر عمدہ تھیں کہ مجھے یاد نہیں کہ میں نے اپنی زندگی میں اس قدر خوش ذائقہ پھل کبھی کھائے ہوں۔ میرے ساتھیوں نے بھی انہیں پسند کیا۔ انہوں نے نہ صرف وہ تمام نارنگیاں کھا لیں کہ جو میں نے خریدی تھیں بلکہ بڑی تعداد سفر میں آئندہ ضروریات پوری کرنے کے لئے خرید بھی لیں۔

13 تاریخ کو دوپہر کے وقت ہم سویز سے رخصت ہوئے۔ ہمارے سامان کو تو اونٹوں پر لادا گیا اور ہمیں گاڑیوں میں سوار کردیا گیا۔ ان گاڑیوں میں چار آدمی تھے، پانچواں ان کا ڈرائیور تھا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی ہم چاروں ہندوستانیوں کو ایک ہی گاڑی میں جگہ ملی اور ہم اس ہجوم سے بچ گئے کہ جس میں انگریز اور دوسرے غیرملکی ملے جلے ہوتے ہیں۔ رات کا سفر ہمارا یا تو باتیں کرنے میں گزرا یا ہم اونگھتے اور سوتے رہے۔ آدھی رات کو ہم نے راستہ میں قیام کیا کہ جہاں ہم صبح تک آرام سے سوئے۔ صبح ناشتہ کے بعد ہم دوبارہ سے روانہ ہوئے اور المصر یا قاہرہ پہنچے۔ یہ بڑا خوبصورت نظارہ تھا کہ ویران صحرا کے کنارے پر اونچی و عالی شان عمارتیں کے گنبدوں کے سنہری کلس دور سے چمکتے ہوئے نظر آتے تھے، یہ آنے والوں کو بے انتہا متاثر کرتے تھے۔ یہ مصر کا دارالحکومت تھا۔

شہر کے مکانات روائتی عرب طرز تعمیر کا نمونہ تھے۔ تنگ اور چھوٹی گلیاں کہ جن میں سے دو آدمی ساتھ ساتھ مشکل سے گزر سکیں۔ ان گلیوں میں بنے یہ مکانات بے ترتیبی اور الجھن کا تاثر دیتے تھے۔ یہاں عورتیں و مرد فربہ، سفید رنگ کے ہیں۔ مصری عورتوں کی آنکھیں غیر معولی طور پر خوبصورت ہیں۔ گدھے پر سواری کرنا یہاں کوئی معیوب بات نہیں ہے۔ آپ کو یہاں امراء کے گھرانوں کی عورتیں بھی گدھے پر سواری کرتی نظر آئیں گی۔ جب یہ پیدل چل چل کر تھک جاتی ہیں تو گدھے والے کو آواز دے کر بلاتی ہیں اور اس پر سوار ہوکر اپنی منزل کی طرف چل پڑتی ہیں۔ یہاں پر عام لوگوں کی زبان عربی ہے۔ لیکن دربار اور حکمران خاندانوں میں ترکی بولی جاتی ہے۔

قاہرہ میں ہم ایک عیسائی طبیب کے گھر پر ٹھہرے۔ سفر کی تھکان کے بعد رات بڑے

آرام سے گزری۔ 15 تاریخ کی صبح کو ہمارے نوجوان آقا کے پاس ٹرانزٹ کمپنی کا ہیڈ ڈائریکٹر مسٹر جے بتاولدی جو کہ اعلیٰ عہدیدار' باصلاحیت اور مالدار شخص ہے' وہ ملاقات کے لئے آیا۔ یہ شاید ویسے تو فرانسیسی ہے مگر انگریزی خوب بولتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ اطالوی زبان سے بھی واقف ہے۔ اس نے میر جعفر علی خاں سے درخواست کی کہ وہ محمد علی پاشا سے دوپہر کو اس گارڈن ہاؤس میں ضرور ملاقات کریں۔ اس پر وہ تیار ہوگیا۔

اس صبح کو میں نے درخواست کی کہ میں اہرام مصر دیکھنا چاہتا ہوں جو کہ عجائبات عالم میں سے ایک ہو۔ لیکن مجھے اس وقت سخت افسوس ہوا کہ میری درخواست اس وجہ سے رد کردی گئی کہ میں دوپہر تک واپس نہیں آسکوں گا۔ کہ جہاں میری بحیثیت مترجم کے اشد ضرورت ہوگی۔ لیکن میں نے اپنے آقا سے درخواست کی کہ مجھے صرف دو گھنٹہ کی چھٹی دے دی جائے۔ لہٰذا میں ایک تیز رفتار گدھے پر سوار کر امام شافعی کے مزار کی جانب روانہ ہوا جو کہ شہر کے مشرق میں ایک میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہاں پہنچ کر جو کچھ میں نے دیکھا اس پر مجھے رونا آگیا کہ اس مشہور مصلح کی قبر کو کہ جو مسلمان شہزادوں کے بالکل سامنے ہے' اس بری حالت میں ہے۔ اس کا گنبد شکستہ حالت میں ہے' اندر سے مقبرہ بالکل بوسیدہ ہو چکا ہے اور جگہ جگہ جنگلی جھاڑیاں اگی ہوئی ہیں۔ بہرحال میں نے اس کی ظاہری حالت پر زیادہ توجہ نہ دی اور بزرگ کی مقدس ہڈیوں پر فاتحہ پڑھ کر اپنے دل کو تسلی دی۔

اس برتر بزرگ کی پیدائش جیساکہ مورخوں نے ہمیں بتایا ہے فلسطین کے شہر عقلان میں 767ء کو ہوئی۔ جب وہ بچہ ہی تو تو اسے مکہ لے جایا گیا جہاں اس کی ابتدائی تعلیم ہوئی۔ وہ اس قدر باصلاحیت تھا کہ پندرہ سال کی عمر میں ہی اسلامی فقہ پر کئی کتابیں لکھ چکا تھا کہ جن کا علمیت میں اور کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ وہ 814ء میں مصر آیا اور اس کے پانچ سال بعد اس نے اس دنیائے فانی سے کوچ کرکے ابدی دنیا کی راہ لی۔

دوپہر کو پوری تیاریوں کے بعد ہم شوبرا میں شاہی باغ کے مکان میں مسٹر جے بتالدی کی معیت میں' محمد علی بادشاہ سے ملنے کیلئے روانہ ہوئے۔ دو میل چلنے کے بعد ہم باغ میں پہنچے۔ ہمیں فوراً اندر آنے کی اجازت مل گئی۔ داخل ہونے کے بعد میں نے جو کچھ دیکھا وہ کسی جنت سے کم نہیں تھا۔ پھلوں اور پھولوں کے درخت ترتیب سے لگے ہوئے تھے۔ یہ پھولوں اور پھلوں سے لدے ہوئے تھے۔ ان کو زراعت کے جدید طریقوں سے پرورش کیا گیا تھا۔ پگڈنڈیا چھوٹے چھوٹے پتھروں سے بنائی گئی تھیں۔ جب ہم محل میں داخل ہوئے تو میں نے دیکھا کہ پوری عمارت سفید رنگ کی تھی۔ اس کے بیچ میں ایک فوارہ تھا۔ چھت

اونچی اور خوبصورت تھی۔ محل کے ستون ایک ہی پتھرے سے تراشے ہوئے تھے۔ ان پر اس قدر عمدہ پالش تھی کہ وہ آئینہ کی طرح چمک رہے تھے۔

ہمیں حکومت کا ایک عہدیدار کہ جو شاندار لباس میں ملبوث تھا' لیکر چلا۔ جب ہم شمال کی جانب ایک کمرے میں داخل ہوئے تو یہاں ہم نے مشہور زمانہ شہزادے محمد علی پاشاہ کودیکھا۔ وہ سادہ لباس پہنے ہوئے تھا۔ سرخ ترکی ٹوپی اور نیلے رنگ کا کوٹ۔ جب ہمارا تعارف کرایا گیا تو ہم نے ایک ایک کرکے ہزہائی نس کے دائیں ہاتھ کو چھوا اور ترکی آداب کے مطابق' اس کو بوسہ دیا۔ اس کے بعد ہم اس کے دائیں جانب دیوان پر بیٹھ گئے۔ میر جعفر علی خاں نے اسے دو قیمتی کشمیری شال بطور تحفہ پیش کئے جو اس نے خوشی سے قبول کرلئے۔

اب اس کے بعد باتیں شروع ہوئیں جن کو ایک دوسرے تک پہنچانے کے لئے تین مترجموں اور تین زبانوں کا استعمال ہوا۔ میں انگریزی میں مسٹر بتالدی کو بتاتا تھا وہ اس کو فرنچ میں ہزہائی نس کے مترجم کو فرانسیسی مین بتاتا تھا اور پھر وہ اس کو ترکی میں پاشاہ تک پہنچاتا تھا۔ ایک دوسرے کی خیریت پوچھنے کے بعد' میرے نوجوان آقا نے بولنا شروع کیا۔ اس نے اس خوشامدانہ اسلوب کو اختیار کیا جو انگریزوں کو مخاطب کرتے وقت کیا جاتا ہے۔ اس نے کہا کہ اس نے ہزہائی نس کی اچھی حکومت کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے کہ کس طرح سے وہ ذاتی دلچسپی لے کر حکومت کو دانشمندانہ طریقہ سے چلا رہے ہیں۔ وہ خدا کا شکر ادا کرتا ہے کہ اب اس نے اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ لیا ہے۔ اس نے جو کچھ سنا تھا وہ اس کے سامنے ہے۔

اس پر بوڑھے پاشاہ نے جواب دیا کہ: "کچھ تو ہم نے کیا ہے' مگر ابھی بہت کچھ کرنے کے لئے ہے۔" اس کے بعد ہزہائی نس نے ہندوستان میں انگریزی حکومت کے بارے میں سوالات کئے۔ جن کا جواب مختصر طور پر دیا گیا۔ اس کے بعد کافی لائی گئی اور ہم سب کو پیش کی گئی۔ ہم ایک ایک کرکے اٹھے اور اپنے اپنے ہاتھوں کو بوسہ دے کر جو کہ ترکی آداب میں سے ہے ہم نے ہزہائی نس کی تعظیم کی۔ پھر ہم نے کافی کو اسی طرح سے پیا کہ جیسے انگریز اپنے دوستوں کے نام پر شراب پیتے ہیں۔ کافی کے بعد ہم اس عظیم شخصیت سے رخصت ہوکر گھر کے لئے روانہ ہوئے۔ ہمیں خوشی تھی کہ ہم پاشاہ سے ملے اور اس سے گفتگو کی۔ اگرچہ یہ ایک ان پڑھ شخص ہے لیکن اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے ترقی کرتا ہوا حکمرانی کے درجہ تک جا پہنچا۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے یورپ میں کرام ویل اور بونا

پارٹ اور ہمارے ہاں حیدر علی و رنجیت سنگھ۔

محمد علی پاشاہ درمیانی قدم کا دبلا پتلا مگر بناوٹ میں مکمل تھا۔ اس کا رنگ تقریباً گورا تھا۔ اس کا سرگول اور خوبصورت تھا۔ اس کا ماتھا اونچا اور چوڑا تھا کہ جس پر کئی جھریاں نظر آتی تھیں۔ اس کا چہرہ بیضوی تھا کہ جس پر چھوٹی سفید داڑھی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات متاثر کرنے والے تھے۔ اس کی ناک عقابی تھی۔ کالی آنکھیں چمکیلی اور تیز تھیں جو گہری بھوؤں کے نیچے پر رعب نظر آتی تھیں۔ اس کے بارے میں مجموعی تاثر سنجیدگی کا تھا۔ اس کی چال ڈھال سے اس کی ذہنی صلاحیتوں کے بارے میں پتہ چلتا تھا کہ جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتی تھیں۔ ادب و آداب اور تمیز میں اس کا اندازہ انتہائی دل لبھانے والا تھا۔ اس وقت اس کی عمر اسی سال کی تھی اس نے تقریباً چالیس سال تک مصر پر حکومت کی۔

16 تاریخ کو ہم ایک چھوٹے اسٹیمر پر سوار ہوکر دریائے نیل سے سکندریہ گئے۔ دریا کے دونوں کنارے کے مناظر بڑے خوبصورت تھے۔ ہم نے دریا میں کئی مگرمچھوں کو دیکھا کہ جو اپنے شکار کے تعاقب میں دوڑ رہے تھے۔ انہیں ہمارے اسٹیمر کی آواز نے بھی پریشان نہیں کیا۔ انہیں قدرت نے بے انتہا توانائی دی ہے۔ اس لئے وہ تیز رفتاری کے ساتھ موجوں کے ساتھ یا ان کے بہاؤ کے خلاف تیر سکتے ہیں۔

17 تاریخ کو ہم مشہور زمانہ سکندریہ کی بندرگاہ پہنچے۔ اس وقت یہ مصر کے بڑے شہروں میں سے ہے۔ زمانہ قدیم میں یہ مشرق میں تجارت کا مرکز تھا۔ یہاں پر ہم نے مسٹر تبالدی کی بہن مسز لارکنگ کے ہاں قیام کیا۔ ایک لمبے، خوبصورت، اور صحت مند شخص نے اسٹیمر سے ہمارا سامان اتروانے میں مدد کی، بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ یہ مسٹر لارکنگ خود تھے۔ اس شریف عیسائی سے جوکہ انتہائی مہذب اور مہمان نواز تھا ہمارے ساتھ بھائیوں جیسا سلو کیا اور ہمیں اپنے گھر لے گیا کہ جہاں سے ہم دریا اور شہر دونوں کو بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ جب ہم اس کے گھر پہنچے تو اس نے مسز لارکنگ سے ہمارا تعارف کرایا۔ وہ خاتون خوبصورتی اور شرافت کی مکمل تصویر تھی۔ اس کی ان خوبیوں کی تعریف کرنا یا تو کسی شاعر کا کام ہے یا کسی آرٹسٹ کا کہ جو اس کی تصویر میں رنگوں کے ذریعہ اس کے دلکش خدوخال اور اندرونی نیکیوں کو اجاگر کرسکے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ بحیثیت نثرنگار میں اس کی تعریف کرنے سے معذور ہوں۔ یہ خوبصورت خاتون کئی زبانیں جانتی تھی لیکن وہ صرف دو زبانیں بولتی تھی۔ فرانسیسی میں اپنے شوہر سے، اور عربی میں ہم سے اور اپنے ملازموں سے۔ یہ پہلا موقع تھا

کہ میں نے کسی عورت کے منہ سے اس سائنٹیفک زبان میں فصاحت و بلاغت کے موتیوں کو اس طرح سے بکھرتا ہوا دیکھا ہو۔ اس کا لب و لہجہ بہت ہی عمدہ تھا۔ وہ نازک مضامین کو بڑے دلکش انداز میں بیان کرتی تھی۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ جب بھی میں نے اس سے بات کی مجھے یہ احساس ہوا کہ میں کسی جنت کی حور سے گفتگو کررہا ہوں۔ مسٹر لارکنگ پورے مصر میں سب سے زیادہ خوش قسمت انسان تھا کیونکہ اس کو خدا نے سات اچھی چیزوں سے نواز رکھا تھا۔ اچھی صحت' خوبصورت بیوی' ایک صحت مند بچہ' اچھی عادت' اچھی قسمت' اچھا نام اور خوش حالی۔ میں نے دعا کی کہ وہ ہمیشہ خوشی و مسرت کی زندگی گزارے۔

کھانا جلدی کھایا گیا۔ ہمارے ساتھ یہ خوبصورت جوڑا بھی شریک طعام تھا۔ دوپہر کو ہمارے لئے گاڑی کا انتظام کیا گیا۔ ہم سکندریہ کے شہر سے ہوتے ہوئے ایک گارڈن ہاؤس گئے کہ جو مسٹر ٹربرن کا تھا۔ یہ مسٹر لارکنگ کا سسر تھا۔ یہاں ہمیں اس وقت تک رہنے کا موقع ملا کہ جب تک اسٹیمر کے ذریعہ انگلستان روانہ ہوں۔

دوسرے دن ہم نے مسٹر ٹربرن سے ان کے گھر پر ملاقات کی۔ انہوں نے بغیر کسی تکلفات کے ہمارا استقبال کیا۔ واپسی پر انہوں نے اپنے ملازموں سے سختی کے ساتھ کہا کہ وہ ہمارا پورا پورا خیال رکھیں اور ہماری ہر ضرورت کو پورا کریں۔ شام کو ہمیں مسٹر ٹربرن کے ایک دوسرے داماد مسٹر اسٹراناری ٹوسی زا' جو یونانی قونصل ہے' اس کے ہاں کھانے کی دعوت دی گئی۔ اس کا گھر کسی محل کی طرح سے آراستہ و پیراستہ تھا اور کسی بھی شہزادے کی رہائش کے لئے موزوں تھا۔ یہاں بھی ہمارا استقبال ہمارے شریف میزبان' اس کی خوبصورت بیوی اور اس کی نوجوان بہن نے کیا۔ یہ دونوں پریاں' اپنی خوبصورتی اور دلکشی میں مسز لارکنگ سے بھی بڑھی ہوئی تھیں۔ مکان میں ہر قسم کے سجاوٹ چیزیں تھیں۔ ہماری اس قدر خاطر تواضع ہوئی کہ ہندوستان میں ہمارے عیسائی دوستوں نے نے کبھی اس طرح سے ہمارے ساتھ سلوک نہیں کیا تھا۔ دس بجے رات کو ہم گھر واپس ہوئے۔ ہمارے دلوں میں ان نیک دل لوگوں کے لئے بے انتہا عزت و احترام کے جذبات تھے۔

ہمیں سکندریہ میں چھ دن قیام کرنا پڑا۔ اس عرصہ میں میں شہر کے اندر و باہر سیاحت کی غرض سے جاتا رہا اور جب بھی موقع ملا میں نے لوگوں سے معلومات اکٹھی کیں۔

بہت سے عیسائی مصنفوں نے یا تو اپنے علم کی کمی یا اس تعصب کی بنا پر کہ جو انہیں ہمارے مذہب سے ہے' (گبن اور دوسرے مشہور مورخوں کے علاوہ) ہمارے خلیفہ حضرت

عمر پر یہ الزام لگایا ہے کہ انہوں نے سکندریہ کے مشہور کتب خانے کی کتابوں کو اس شہر کے پانچ ہزار حماموں میں بطور ایندھن استعمال کرایا۔ یہ اس قسم کی بات ہے کہ جیسے ڈاکٹر اسمتھ نے اپنی کتاب میں تین جگہ یہ لکھا ہے کہ مسلمانوں کے پیغمبر مدینہ میں پیدا ہوئے' اور ان کے مقبرے کی زیارت کے لئے لوگ وہاں بطور حج جاتے ہیں۔ اسی طرح سے ڈاکٹر فلپ پرنس نے اپنی کتاب "یونیورسل ہسٹری" کے صفحہ نمبر 57 پر لکھا ہے کہ ایک مسلمان اپنے مذہب کے مطابق دن میں تین مرتبہ وضو کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مصنف جب بھی کسی موضوع پر قلم اٹھائے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس سے پوری طرح واقف ہو۔ اسے موضوع کی جانچ' پڑتال اور مکمل علم کے بعد اس کے بارے میں اپنی رائے دینی چاہئے۔ سب سے پہلے تو انہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اسلام اپنے ماننے والوں کو یہ سکھاتا ہے کہ تمام کاغذات کو پاک سمجھو اور انہیں کبھی اپنے پاؤں تلے مت لاؤ' نہ ہی انہیں گندی و ناپاک جگہ پر پھینکو' کیونکہ ان میں خدائے پاک کا نام لکھا ہوا ہو سکتا ہے۔ یہ موجودہ زمانے کے عیسائیوں کے اس رویہ سے بالکل مختلف ہے کہ جو بائیبل بھی پروا نہیں کرتے ہیں اور وہ اس کے صفحات اگر بوسیدہ ہو جائیں یا پھٹ جائیں تو انہیں بے دردی سے پھینک دیتے ہیں۔

اس لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ خلیفہ عمر ایسا حکم دیں۔ کیونکہ انہوں نے تو بیت المقدس جانے پر یہ حکم دیا تھا کہ وہاں کی یونیورسٹی کی حکومت کیجانب سے مرمت کرائی جائے۔ انہوں نے تو چرچ میں اس لئے نماز نہیں پڑھتی تھی کہ ان کے بعد مسلمان اس جگہ کو مقدس سمجھ کر کہیں اسے مسجد میں تبدیل نہ کردیں۔ اس کے علاوہ عمرو بن العاص جوکہ سائنس اور ادب میں بے انتہا دلچسپی رکھتے تھے اور خود ایک اچھے شاعر تھے وہ کبھی بھی اس قسم کے جنونی اور احمقانہ حکم پر عمل نہیں کرتے۔

24 تاریخ کو دوپہر کے وقت ہم نے اپنے عیسائی میزبانوں کو الوداع کہا اور گریٹ لیور پول اسٹیمر پر سوار ہوکر اسکندریہ کی بندرگاہ سے روانہ ہوئے۔ اس جہاز کے کیبن ہمیں بنیشنک سے زیادہ آرام دہ معلوم ہوئے۔ اس جہاز پر مسافروں کا خیال بھی زیادہ رکھا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ جس قدر انگلستان کی طرف جاتے ہیں اس قدر انگریزوں میں تمیز اور خوش اخلاقی پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ ہمارا جہاز اسکندریہ سے چلا تو سمندر خاموش و پرسکون تھا۔ 26 تاریخ کو ہم نے دور سے کینڈیا کا جزیرہ دیکھا۔ 28 تاریخ کو ہم مالٹا پہنچ گئے۔ چونکہ یہاں اسٹیمر کو کوئلہ لینا تھا' اس لئے وہاں ایک دن کے لئے رکنا پڑ گیا۔

29 تاریخ کو ہمارا سفر دوبارہ سے شروع ہوا۔ اسٹیمر کا انجن شور مچاتا ہوا پوری طاقت سے سمندر کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ ہم نے مالٹا کا جزیرہ ایک بجے دوپہر کو چھوڑا' رات کو ہم سسلی کے خوبصورت جزیرے کے قریب گزرے۔ یہاں پر ماؤنٹ اٹینا پوری طرح سے نظر آرہا تھا جو اپنی آتش فشانی کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہ دن ہو یا رات ایک خوبصورت منظر پیش کرتا ہے۔

4 تاریخ کی دوپہر کو ہم جبرالٹر پہنچے۔ جہاز میں بوائلر کی خرابی کی وجہ سے یہاں ہمیں ایک دن رکنا پڑا۔ مسافروں کو اجازت دی گئی کہ وہ ساحل پر جا سکتے ہیں۔ لہٰذا ہم نے بھی اس سے فائدہ اٹھایا اور شہر دیکھنے چلے گئے کہ جو کبھی مسلمانوں کے قبضہ میں تھا۔ اور اب اس پر انگریزوں کی حکومت ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں جبرالٹر کے قلعہ کے استحکام اور مضبوط کو دیکھ کر حیران و ششدر ہوگیا۔ یہ دنیا کے ناقابل تسخیر قلعوں میں سے ایک ہے۔ یہ ایک بڑی چٹان پر واقع ہے کہ جو سمندر میں گھسی ہوئی ہے۔ اس کے ایک طرف اطلانٹک سمندر ہے اور دوسری طرف بحر روم۔ اس کی وجہ سے اسپین کا ملک بارعب نظر آتا ہے جوکہ اس سے ایک خاکنائے کے ذریعہ ملا ہوا ہے۔ جبرالٹر کی چٹان کے اردگرد گیلریاں اور گارڈز کے لئے کمرے بنائے گئے ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے اوپر قطار میں ہیں' ان کے اندر سوراخ ہیں کہ جن سے چاروں طرف گولہ باری ہو سکتی ہے۔

712 میں یہ ناقابل تسخیر قلعہ مسلمان جنرل طارق بن زیاد نے فتح کرلیا تھا۔ اس کے بعد سے اس کا نام بدل کر جبل الطارق ہوگیا تھا' اسی سے موجودہ نام جبرالٹر نکلا ہے۔ تقریباً 780 سال تک یہ مسلمانوں کی حکومت میں رہا۔ لیکن پھر 1402ء میں غرناطہ کے بادشاہ ابوعبداللہ اور اس جانشینوں کی نالائقی کی وجہ سے یہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کے بعد سے اسپین کے حکمران یہاں حکومت کرتے تھے۔ 212 سال تک یہ ان کے قبضہ میں رہا۔ یہاں تک کہ 1704ء میں قسمت نے اسے انگریزوں کے حوالہ کردیا۔ جوکہ اب تک اس کے قانونی حکمران ہیں۔ اس شہر کی آبادی سات ہزار کے قریب ہے۔ آبادی میں انگریز' یہودی اور پرتگیزی شامل ہیں جو سپاہی یہاں تعینات ہیں ان کی تعداد دو ہزار ہے۔

5 تاریخ کی رات تک بوائلر کی مرمت ہوگئی اور دوبارہ سے اپنے سفر پر روانہ ہوگئے۔ خاموش سمندر' خوشگوار ماحول' کپتان اور اس کے عملہ کا تعاون' ان سب نے مل کر ہمارے سفر کو پرمسرت بنا دیا۔ 10 مئی کو ہمارا جہاز ایک جگہ رکا جو "مدرنگ" کے نام سے تھا یہاں پر مسافروں کو کچھ دن رکنا پڑا اور ان کے معائنہ کے بعد جب انہیں مصری پلیگ کے

جراثیم سے آزاد اور صحت مند پایا تو جہاز کو آگے جانے کی اجازت ملی۔ جب ہمارا جہاز لنگرانداز تھا اس زمانہ میں ایک دن میرا دوست مسٹر ریئل' جو بنگال میں ملازم تھا' وہ میری کیبن میں آیا اور مجھے سوتے سے اٹھایا اور کہنے لگا کہ ہمارے جہاز کے قریب میں مقامی لڑکیوں کو دیکھا گیا ہے۔ اگرچہ سردی بہت تھی' اور ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے میں اس سردی میں اتنی جلدی اٹھنے کا عادی نہ تھا' لیکن لڑکیوں کو دیکھنے کے شوق میں' میں نے خود کو شال میں لپیٹا اور اپنے دوست کے ساتھ باہر آگیا۔ جب میں عرشہ پر گیا تو دیکھا کہ ہمارا جہاز عجیب و غریب ماحول میں گھرا ہوا ہے۔ ہمارے بائیں جانب خوبصورت میدان پھیلا ہوا تھا۔ دوسری جانب آئل آف وائٹ تھا' جہاں شاندار پہاڑ اپنی سفید چوٹیوں کے ساتھ سمندر میں ابھرا کھڑا تھا۔ ہمارے جہاز کے اردگرد بہت سی چھوٹی کشتیاں تھیں' ان میں اور تماشہ بینوں کے ساتھ ساتھ خوبصورت لڑکیاں بھی تھیں' پہلی نظر میں تو ان کی خوبصورتی سے میری آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔

اتنے طویل عرصہ کے بعد کسی کو جب کچھ دنوں کے لئے قرنطینہ میں رکھا جائے اور اس بات کی اجازت نہ دی جائے کہ اس کے اردگرد جو بھی اچھی چیزیں ہیں ان سے وہ کوئی رابطہ بھی رکھ سکے تو میں سمجھتا ہوں کہ کسی بھی انسان کے لئے یہ سب سے زیادہ تکلیف دہ عمل ہے۔ ہم نے تین دن اس طرح سے گزارے۔ چوتھے دن اس وقت ہماری خوشی کی انتہا نہیں رہی کہ جب ہمارے جہاز نے حرکت کی۔ ایک گھنٹہ کے بعد یہ ساؤتھ ہمپٹن کی گودی میں حفاظت کے ساتھ داخل ہوا۔ اس بحفاظت سفر کے لئے ہم نے خدا کا شکر ادا کیا۔

چودھواں باب

14 مئی کو صبح سات بجے ہم کسٹم ہاؤس کے قریب اترے یہاں ہمارا سامان بغیر کسی وقت کے گزر گیا۔ یہاں ہم ایک عمدہ ہوٹل میں ٹھہرے جو یونین ہوٹل کے نام سے مشہور تھا۔ جہاں سے شہر اور سمندر دونوں کو اچھی طرح سے دیکھا جا سکتا تھا۔ ہماری جماعت کو یہاں کے مقامی لوگ اس طرح سے دیکھ رہے تھے کہ جیسے ہم دنیا کے سات عجوبوں میں سے ایک ہوں۔ میں نے اتفاق سے قاہرہ سے ایک ترکی لباس خرید لیا تھا اس لئے لوگوں نے میری ہیئت پر مجھے زیادہ نہیں گھورا۔ میرے دوستوں میں' سوائے میر جعفر کے' سب بازار جانے کے لئے بے چین تھے۔ اس لئے ناشتہ کے فوراً بعد وہ اپنے معمولی سے ہندوستانی لباس میں مارکیٹ چلے گئے۔ جہاں لوگوں نے نہ صرف حیرانی سے انہیں دیکھنا شروع کردیا بلکہ ان کے پیچھے ایک مجمع جمع ہوگیا۔ اس صورت حال سے ناراض ہوکر' وہ لوگ کچھ خریدے بغیر واپس ہوٹل آگئے۔ ہوٹل میں داخل ہوتے وقت انہوں نے واپس مڑ کر ان لوگوں کو دیکھا جو تجسس کے مارے ان کے ساتھ آئے تھے۔ حاضرین نے زور سے نعرہ لگایا "ہرا" اس پر ہر طرف سے یہی آوازیں آنے لگیں۔ اس پر ہمارے طبیب بدرالدین نے غصہ سے کہا "سفید شیطان" پھر مجھ سے مخاطب ہوکر کہنے لگا کہ : "ان لوگوں کو کسی ذات اور عمر کا کوئی احترام نہیں ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ان لوگوں کو پتھر ماروں۔"

"ایسا مت کریں حکیم صاحب" میں نے کہا : "ورنہ اس ہوٹل اور آپ کے لئے مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ یہ لوگ کسی سے نہیں ڈرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ یہ لوگ بہت زیادہ متجسس ہیں۔ لیکن ان لوگوں نے آپ کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا ہے۔ لہٰذا ان کو ان کے حال پر چھوڑیئے۔"

15 تاریخ کی صبح کو ہم ریل کے ذریعہ لندن روانہ ہوئے۔ اس میں بیٹھ کر ہمیں اندازہ ہوا کہ سفر کس قدر خوشگوار ہوتا ہے۔ راستہ میں ہم خوبصورت کھیتوں' درختوں' چشموں' گاؤں' شہروں اور قصبوں کا نظارہ کرتے گئے۔ ریل کی تیزی میں یہ مناظر آنکھوں کے سامنے آتے و جاتے تھے۔ یہ ایک عجیب و غریب تجربہ تھا جو ہمیں ہوا۔ جب ریل اپنی منزل پر رکی

اور ہم پلیٹ فارم پر اترے تو ہم نے دیکھا کہ یہ کشادہ صحت ہے۔ جس کا فرش تمام کا تمام کالے پتھر سے بنا ہوا ہے۔

چند ہی منٹوں میں دو گھوڑا گاڑیاں ہمارے نزدیک آئیں۔ ہم ان میں سوار ہو کر مشہور زمانہ شہر لندن روانہ ہوئے۔ گلی کے بعد گلی اور چوراہے کے بعد چوراہا جس طرف سے بھی ہم گزرے' وہ تمام فرش بند' صاف اور ترتیب کے ساتھ تھے۔ ان پر عورتیں و مرد چلتے نظر آتے تھے۔ تمام عورتیں خوبصورت تھیں جبکہ مرد صحت مند تھے۔ امراء اور ڈیوکوں کے محلات اپنی طرز تعمیر کی وجہ سے صاف نظر آتے تھے۔ انہیں میں سے ایک گھر میں میں نے دیکھا کہ دو شریف لوگ اعلیٰ لباس پہنے اپنے سروں پر مٹی ڈالے ہوئے ہیں۔ اس سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ شاید ان کے ہاں کوئی موت ہوئی ہوگی۔ جب میں نے مسٹر اسکاٹ سے جو میرے قریب بیٹھا ہوا تھا یہ سوال کیا تو اس نے ہنس کر کہا کہ اب تک یہاں پر پرانا دستور ہے کہ کچھ لوگ اپنے بالوں پر پوڈر لگاتے ہیں۔ اس لئے یہ ماتمی نشانی نہیں بلکہ فیشن ہے۔ بہرحال یہ شہر کہ جس کی آبادی بیس لاکھ کے قریب ہوگی یہاں دنیا کی تمام دولت جمع ہے۔ ہم ان عجائبات اور حیران کرنے والی چیزوں کا مشاہدہ کرتے ہوئے بروک سٹریٹ پہنچے اور یہاں ایک عالی شان عمارت میورارٹ ہوٹل میں اترے۔

اس ہوٹل میں وہ ساری سہولتیں تھیں کہ جن کی ایک شہزادے کو ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں ہم تین دن تک ٹھہرے۔ لیکن پھر ہمارا رہنما اس کے بہت زیادہ کرایہ سے خوفزدہ ہوگیا جو دو سو روپیہ روزانہ تھا۔ اس لئے ہم نے ایک نجی مکان نمبر 7 سلون اسٹریٹ میں کرایہ پر لیا۔

آخر کار ایک طویل سفر کے بعد ہم نے یہاں پر رہائش اختیار کی۔ اب ایک ایسی سرزمین پر تھے کہ جہاں سورج اتنا کمزور ہے کہ جیسے وہ چاند ہو۔ قطب ستارہ یہاں پر عمودی ہے۔ مجموعی طور پر یہ سرزمین زرخیز ہے۔ لوگ ذہین مہذب اور مستعد ہیں۔ یہاں کی زبان' رسم و آداب ہم سے بالکل مختلف ہیں۔ یہاں پر ہی تقریباً بیس لوگوں کے ہاتھوں میں ہمارے ملک کی تقدیر ہے۔ میرا یقین ہے کہ جو کچھ بھی ہے یہ سب خدا کی مرضی سے ہے کہ جس کی وجہ سے یہ چھوٹا سا جزیرہ جو دنیا کے نقشہ پر ایک تل کی طرح نظر آتا ہے اسکے قبضہ میں دنیا کا بڑا حصہ ہے اور جو قبضہ میں نہیں ہے وہ اس سے خوف زدہ ہے۔

16 تاریخ کو میں ساڑھے تین سال بعد اپنے پرانے دوست اور آقا کیپٹن ایسٹ وک سے ملا۔ ان سے مل کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔

ہم نے ایک ہفتہ گھر میں خاموشی سے گزارا۔ میرا مطلب ہے میرا چیف اور ان کے ملازم گھر پر رہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے اس وقت بھی آرام نہیں کیا جب کہ میں گھر پر ہوتا تھا۔ میرا کام بحیثیت سیکرٹری اور مترجم کے بڑا جاں لیوا تھا۔ کیونکہ میرے ساتھیوں میں سے کسی کو انگریزی نہیں آتی تھی' اس لئے ہر جگہ میری ضرورت پڑتی تھی بات چیت ہو' یا تجارتی لین دین۔

اسی دوران میں نے دو لوگوں سے دوستی کرلی جوکہ یہاں کے معاشرے میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے ان میں سے ایک الفرڈ لاتھم تھا اور دوسرا آر پلس فورڈ' ان میں پہلا ایک تاجر تھا' جبکہ دوسرا پارلیمینٹ کا ممبر۔ ان دونوں حضرات کی دوستی کی وجہ سے یہاں کے بارے میں میری معلومات میں اضافہ ہوا' اور میں نے بہت سی جگہیں کچھ خرچ کئے بغیر دیکھ لیں۔

24 تاریخ کو ہمارے مہربان دوست ہمیں شہر کی مشہور جگہیں دکھانے لے گئے۔ پہلی چیز جو ہم نے شہر میں دیکھی وہ شاندار پل تھے۔ خاص طور سے "آئرن برج" اور "سونگنگ برج"۔ ہمیں یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ ان دیوہیکل پلوں کو کس طرح سے لوہے کے بڑے بڑے ستونوں کے ساتھ ملا کر بنایا گیا ہے۔ اس سے ہم نے یہ اندازہ لگایا کہ اس ملک میں لوہے کی کانیں ہوں گی۔ کیونکہ ان پلوں کے علاوہ ہم نے لوہے کا استعمال اور عمارتوں میں بھی دیکھا۔ کوئی مکان ایسا نہیں تھا کہ جہاں لوہے کی ریلنگ نہ ہوں' کچھ مکانوں کی تو چھت بھی لوہے کی تھی۔ کچھ باغات کی لوہے کے جنگلوں سے حفاظت کی گئی تھی۔ ادھر ادھر گھومنے کے بعد سینٹ ہال کیتھڈرل گئے۔ یہ ایک ایسی عمارت ہے کہ جو میرے خیال سے دنیا میں اپنا ہمسر نہیں رکھتی ہے۔

یہاں پر مجھے جو چیز پسند نہیں آئی وہ لاتعداد مجسموں اور بتوں کی موجودگی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ یہ سب بڑی خوبصورتی اور آرٹ کے اصولوں پر تراشے گئے ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ان کی پوجا نہیں کی جاتی ہے' کیونکہ یہ پروٹسٹنٹ فرقے میں جائز نہیں ہے۔ لیکن ایک مذہبی عمارت جوکہ مذہبی فرائض کی ادائیگی کے لئے ہو' چاہے وہ معمولی ہو یا شاندار' اسکو سادہ ہونا چاہئے تاکہ عبادت گزاروں کی توجہ وعظ اور عبادت سے نہ بھٹکے۔ کیتھڈرل دیکھنے کے بعد ہم ایک زمین دوز راستے میں داخل ہوئے جو ٹیمزٹنل کے نام سے مشہور ہے۔

25 تاریخ کو ہمارے مہربان دوست مسٹر و مسز لاتھم نے ہمیں اطالوی اوپیرا کی دعوت دی۔ شام کو آٹھ بجے ہم اس عمارت کی طرف گئے۔ داخل ہوکر دیکھا کہ یہ ایک محل تھا جو

لوہے کے ستونوں پر کھڑا تھا۔ اس کا اندرونی حصہ شاندار تھا۔ اس کے اوپری حصہ میں چھوٹے چھوٹے کمرے یا باکس تھے کہ جن میں چار یا پانچ لوگ بیٹھ سکتے تھے۔ ہر مجسٹی اور شاہی خاندان کی نشستیں اسٹیج کے دائیں جانب تھیں۔ ہماری نشست اسٹیج کے بالکل سامنے تھی اور اس قطار میں تھی کہ جہاں شاہی خاندان بیٹھتا ہے۔ ہم آدھ گھنٹے وہاں آرام سے بیٹھے رہے اور اس محل کی شان و شوکت سے مرعوب ہوتے رہے۔ ہم نے دیکھا کہ یہاں جو گیس کی روشنی تھی اسے اپنی مرضی سے زیادہ و کم کیا جا سکتا تھا۔ ہزاروں لیمپوں کو کسی بھی وقت کم کر کے رات کا سماں پیدا کیا جاتا تھا اور کبھی وہ اتنا روشن ہوتے کہ دن کا گمان ہوتا تھا۔

ساڑھے آٹھ بجے پردے اٹھائے گئے۔ دو خوبصورت خواتین کے جنہوں نے انتہائی غیرشائستہ لباس پہن رکھا تھا اور ایک بوڑھا آدمی کے جوان کے باپ کی نمائندگی کر رہا تھا' یہ تینوں اسٹیج پر آئے۔ انہوں نے کچھ گایا' میرا خیال ہے کہ وہ کوئی تاریخی گیت ہوگا۔ گیت کے ساتھ موسیقی بھی تھی۔ انہوں نے جو رقص کیا اس سے ان کی اس فن میں مہارت ظاہر ہوتی تھی۔ خواتین جب رقص کرتے ہوئے گھومتی تھیں تو ان کا لباس ہوا میں اڑ کر ان کے جسم کے اس حصہ کو نمایاں کرتا تھا کہ جسے دیکھنا بداخلاقی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس قسم کی باتوں سے مجمع کو لبھاتا تھا۔ ہم نے میوزک سے تو لطف اٹھایا' مگر انہوں نے جو کچھ گایا اس کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھ سکے۔

جب ہماری شناسائی یہاں کے امراء اور اشراف لوگوں سے ہوئی تو کوئی شام ایسی نہیں ہوتی تھی کہ جس میں ہمیں دعوت نہ ملتی ہو۔ اس لئے ہماری شامیں سیرو تفریح اور اچھی صحبت میں گزرنے لگیں۔ جہاں تک میرا تعلق تھا اگر مجھے اپنے چیف کے ساتھ کہیں جانا نہیں ہوتا تھا تو میں تھیٹر چلا جاتا تھا' خاص طور سے ہے مارکیٹ تھیٹر یا لیسیم' کبھی اکیلا اور کبھی اپنے دوست اور شاگرد کیپٹن ٹی - پوسٹن کے ساتھ جو یہاں پر معہ اپنی عالم اور دل آویز بیوی کے ہمراہ آیا ہوا تھا۔

27 تاریخ کو میں نے مسٹر و مسز ایسٹ وک کے ہمراہ کھانا کھایا اور ان کے ساتھ خوبصورت شام گزاری۔ انہوں نے اپنے دوستوں اور قریبی رشتہ داروں کو مجھ سے ملوانے کے لئے بلوایا تھا۔ 28 تاریخ کو ہمیں ایک فینسی ہال کے لئے دعوت دی گئی۔ یہاں ہم نے لوگوں کو مختلف ملکوں کے لباس میں دیکھا۔ ایک صاحب جنہوں نے ایرانی لباس زیب تن کر رکھا تھا' جب وہ میرے قریب گزرا تو وہ مجھے نہ صرف لباس بلکہ عادات سے بھی مغل

معلوم ہوا۔ میرے چیف کے داماد نے جب اسے دیکھا تو اس سے جاکر ملا' اور سلام کرنے کے بعد اس سے پوچھا کہ وہ شیراز سے کب آیا ہے؟ لیکن درحقیقت ہم نے دھوکہ کھایا تھا' کیونکہ اس شخص نے جواب دینے کے بجائے مسکرا کر ہماری طرف دیکھا۔ اس نے جب انگریزی بولی تو پتہ چلا کہ وہ انگریز ہے اور اس کی داڑھی بھی نقلی ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تردد نہیں کہ اس کی نقلی داڑھی اصلی کے مقابل میں بہتر تھی۔

30 تاریخ کو اپنے چیف کے ساتھ میں لیڈن ہال اسٹریٹ میں انڈیا ہاؤس گیا۔ وہ اس کو مکان کہتے ہیں' مگر درحقیقت یہ محل ہے۔ اس میں کئی کمرے اور ہال ہیں جوکہ خوبصورتی سے سجے ہوئے ہیں۔ یہی وہ جگہ ہے کہ جہاں میرے پیارے وطن کی قسمت ان 24 آدمیوں کے ہاتھ میں ہے کہ جو آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈارکٹر کہلاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ انڈیا کی حکومت کو یہاں سے چلاتے ہیں۔ ہماری آمد پر دو نقیب ہمیں محل کے درمیان میں جو کمرے میں وہاں لے گئے۔ جہاں ہم چیئرمین' اور ڈپٹی سے ملے کہ جو اس کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ چیئرمین کا نام جان شیفرڈ تھا اور اس کے ڈپٹی کا نام سر ہنری وی لاک۔ دونوں اشخاص سنجیدہ اور ذہین معلوم ہوتے تھے۔ ان دونوں نے بڑے اخلاق سے ہمارا استقبال کیا۔ پہلے سر ہنری وی لاک نے فارسی میں گفتگو شروع ہوئی۔ لیکن جب اسے ہمارے مطالب کو سمجھانے میں دقت ہوئی تو اس نے ترجمہ کی ذمہ داری مجھ پر ڈال دی۔ چنانچہ میں نے نوجوان چیف کی جانب سے پورا کیس پیش کیا اس میں جہاں ضرورت پڑی میں نے اپنی طرف سے اضافے کردیئے۔ ان دونوں حضرات کے ریمارکس سے میں نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ یہ تھا کہ ہمارے نوجوان چیف کا اپنے حق کے لئے یہاں پر آنا ایک ناعاقبت اندیشانہ فعل تھا۔ یہ کام وہ اپنے ملک میں رہتے ہوئے صرف انہیں لکھ کر بھی کر سکتا تھا۔ اس کے لئے کوئی ضرورت نہ تھی کہ یہ طویل سفر کیا جاتا اور اتنا پیسہ خرچ کیا جاتا۔ انہیں اس بارے میں کوئی زیادہ علم نہ تھا یا پروا بھی نہ تھی کہ انہیں کے آدمی لارڈ ایلن برو گورنر جنرل کے جابرانہ قلم کی ایک جنبش نے میرے چیف کو تمام حقوق سے محروم کردیا اور اسی لئے وہ مجبور ہوا کہ انصاف کے لئے یہاں آئے۔

آدھ گھنٹے کی اس گفتگو کے بعد ہم نے ان عظیم شخصیتوں سے رخصت لی۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کے پاس ہندوستانی معاملات کی ڈوری ہے۔ بعد میں ایک ہمدرد شخص کے ہمراہ ہم اوپر کی منزل پر گئے کہ جہاں آنریبل کمپنی کا میوزیم ہے۔ یہاں پر دنیا بھر سے جمع کی ہوئی قیمتی اشیاء ہیں۔ یہاں ہمارا تعارف تین عالموں سے کرایا گیا۔ جان شکسپیر جوکہ

ہندوستانی لغت کا مصنف ہے' پروفیسر ولسن جو کہ مانا ہوا مشرقی علوم کا اسکالر ہے' اور کرنل ڈبلیو ایچ سیکس۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ مسٹر شیکسپیر نے چونکہ اردو لغت لکھی ہے میں نے ہندوستانی میں ان سے ایک طویل جملہ بولا۔ لیکن افسوس کہ وہ اس زبان کا لفظ بھی نہیں بول سکا کہ جس میں اس نے کئی مفید کتابوں کی تصنیف کی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پروفیسر ایک عالم شخص ہے اس کا اندازہ اس گفتگو سے ہوا کہ جو اس نے ہمارے ساتھ کی تھی۔ تیسرے آدمی کے بار میں معلوم ہوا کہ وہ ڈائریکٹروں میں سے ایک ہے اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی کا رکن بھی ہے۔ وہ لمبا' دبلا اور خوش شکل تھا۔ دیکھنے میں وہ کوئی عرب امیر معلوم ہوتا تھا۔ طویل عرصہ تک ہندوستان میں رہنے کی وجہ سے وہ ہماری زبانوں اور ہماری عادات و رسومات سے بخوبی واقف ہے۔ اس لئے یہ حادثاتی بات ہمارے لئے باعث مسرت ہوئی۔ اس کی مہربانی اور خوش اخلاق کی وجہ سے اس سے دوستی کرنے کا دل چاہا۔ لندن کے قیام کے دوران میں اس سے اکثر ملتا رہا اور اس سے گفتگو کرتا رہا۔ اس کا رویہ میرے ساتھ ہمیشہ ہمدردانہ رہا۔ میں نے اسے ایک عالی مرتبت' اعلیٰ خصوصیات رکھنے والا اور فہم و ادراک سے بھرپور شخص پایا۔

ایک شام مسٹر لاتھم مجھے رائل انسٹی ٹیوشن لے گئے۔ یہاں میری شناسائی تین یا چار اشخاص سے ہوئی کہ جن کے نام میں اب فراموش کر چکا ہوں لیکن انہوں نے میرے ساتھ بھائیوں جیسا سلوک کیا۔ انہوں نے مجھے اپنے قریب بٹھایا اور جو چیزیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھی اس کی پوری پوری وضاحت کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ انگلستان میں وہ لوگ کہ جو عہدے و مرتبہ میں سب سے اونچے ہیں وہی سب سے زیادہ مہذب اور شائستہ ہیں۔ یہاں پروفیسر فراڈے نے بڑی خوبصورتی سے اناٹومی پر لیکچر دیا۔ پچھلے کئی سالوں سے یہ میرا پسندیدہ مضمون تھا۔ اس لئے مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ میں نے اس لیکچر سے جو کچھ سیکھا وہ میں ایک سال کی محنت اور کتابوں کے مطالعہ کے بعد بھی نہیں سیکھ سکتا تھا۔ مسٹر لاتھم نے میرے لئے یہ اجازت بھی لے دی تھی کہ میں بغیر کسی فیس کے جہاں چاہوں وہاں جا سکتا ہوں۔ انہوں نے مہربانی کرتے ہوئے سینٹ جارج ہسپتال اور کالج آف سرجنز کے سپرنٹنڈنٹ سے یہ اجازت لے دی تھی کہ جب کبھی ان کے ہاں انسانی جسم کی جراحت ہو تو وہ مجھے دیکھنے کی اجازت دے دیں گے۔

یکم جون کو ہمارا تعارف کرنل ٹی وڈ سے ہوا۔ اس نے اور اس کی بیوی نے ہمیں اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ اس کی بیوی ایک اعلیٰ مرتبت خاتون تھی اس کی دونوں لڑکیاں

بے حد حسین تھیں۔ اعلیٰ تعلیم نے ان کی خوبیوں میں اور اضافہ کردیا تھا۔ اس کے بعد ہم ایسٹ انڈیا ہاؤس ایک بار اور گئے۔ یہاں سے ہمیں مسٹر پلس فورڈ برٹش میوزیم اور زولوجیکل گارڈن لے گئے۔

دو تاریخ کو چونکہ اتوار تھا' اس لئے پورا شہر ویران اور سنسان تھا۔ اس دن نہ تو کوئی دکان کھلی ہوئی تھی' نہ کوئی گاڑی تھی۔ نہ آدمی بس جوکہ اور دنوں میں ادھر سے ادھر جاتی نظر آتی تھیں۔ لیکن تمام لوگوں نے اپنے گھروں میں صاف ستھرے لباس پہن رکھے تھے۔ ہمارے انگریز ملازموں نے بھی رات کو ہی اپنا کام ختم کرلیا تھا اور دن کو وہ بھی عمدہ لباس پہن کر عبادت کے لئے چرچ چلے گئے۔ اتوار ان کا سبت ہے' جس طرح کہ جمعہ مسلمانوں میں اور ہفتہ یہودیوں میں۔ سبت عبرانی اور عربی میں سنیچر کے دن کے لئے ہے۔ اتوار کے لئے نہیں۔ چونکہ یہ چھٹی کا دن تھا' اس لئے ہم تفریح کے لئے ہائی گیٹ ہیم اسٹیٹ چلے گئے۔ جہاں تازہ ہوا سے لطف اندوز ہوکر ہم گھر آئے۔

تین تاریخ کی صبح کو ہم نے ایک عالم شخص جسکا نام ڈاکٹر یورنگ تھا اس سے ملاقات کی اور اس کی عالمانہ گفتگو سے بہت کچھ سیکھا۔ دوپہر کو ہم ہاؤس آف لارڈز اور پارلیمینٹ گئے۔ یہاں ہم نے شکر کے مسئلہ پر عمدہ تقاریر سنیں۔

چار تاریخ کو مجھے جارج ہسپتال کی طرف سے دعوت نامہ ملا۔ یہاں پر ڈاکٹر کٹلر اور مسٹر پریس کوٹ ہیوٹ میرے ساتھ مہربانی سے پیش آئے۔ انہوں نے پورے ہسپتال کا چکر لگوایا اور پھر ایک لاش کی جراحت دکھانے لے گئے۔ اس کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ ہم جو جالینوس کے نظریات فارسی و عربی میں پڑھتے ہیں وہ سب قیاسات پر مبنی ہیں' اور کسی کو انسانی جسم کے بارے میں مکمل واقفیت اس وقت تک نہیں ہوسکتی ہے جب تک کہ وہ اس کی جراحت نہ کرے۔

پانچ تاریخ کو ہم ایس کوٹ میں ریس دیکھنے گئے۔ یہ شہر سے چاند میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہاں لوگوں کا ایک مجمع تھا جو یہ دیکھ رہا تھا کہ کون سا گھوڑا جیتے گا اور کون سا ہارے گا۔ ان ریسوں میں لوگ کافی پیسہ ہارتے و جیتتے ہیں۔ اس ریس میں جو گھوڑے شرکت کرتے ہیں' میرے خیالمیں وہ دنیا کے بہترین گھوڑے ہوتے ہیں۔ ہمیں یہاں تفریح سے زیادہ غرض نہ تھی بلکہ یہ مقصد تھا کہ ہم اپنے حکمران کو قریب سے دیکھ سکیں۔ ہمارا یہ مقصد پورا ہوگیا۔ ہم نے محترمہ ملکہ اور ان کے شوہر کو آداب کیا۔ جس کا جواب انہوں نے بڑی شائستگی سے دیا۔ ہمارا خیال ہے کہ ہمارے لباس' چہرے اور پگڑیوں کو اتارے بغیر

ہمارے آداب نے شاہی جوڑے کی توجہ ہماری طرف کردی' ان کے ساتھ جو درباری تھے وہ بھی ہمیں دیکھ کر متجسس ہوئے۔ لیکن اس میں عام لوگوں جیسی بے ہودگی نہ تھی۔ جن لوگوں کو خدا کے برتر عظمت رہنا ہے' ان کے دماغ بھی اعلیٰ ہوتے ہیں۔

سات تاریخ کو ہم سول انجینئرنگ کے انسٹی ٹیوشن ہاؤس گئے اور یہاں اس کے صدر مسٹر والکر سے گفتگو کی۔ اس کے سیکرٹری مسٹر سی' من بائی سے بھی ملے۔ یہ دونوں حضرات انتہائی قابل تھے۔

آٹھ تاریخ کو ہم رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے دفتر گئے۔ یہاں پر ہم نے جیالوجی پر ڈاکٹر فالکویز کا لیکچر سنا۔ اس کے بعد ہمارے سابق گورنر جنرل لارڈ آکلینڈ نے تقریر کی۔ جس کو ہم نہیں سمجھ سکے۔ انہوں نے اس قدر مشکل زبان استعمال کی کہ جو ہم غیرملکیوں کے لئے لاطینی تھی۔ چونکہ یہ تقریر ہماری سمجھ سے باہر تھی اس لئے ہم نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے لارڈز اور امراء سے بات چیت کی۔

9 تاریخ کو اتوار کے دن میں ایک انگریز دوست کے ہمراہ رشمنڈ کے گاؤں گیا۔ دس تاریخ کو میں نے ایک میٹنگ میں شرکت کی۔ جو کہ آرٹ کی ہمت افزائی' صنعت و تجارت کے فروغ کی ایک سوسائٹی نے منعقد کرائی تھی۔ اس کی صدارت پرنس البرٹ نے کی۔ ہماری یہ عزت افزائی تھی کہ ہماری نشستیں ڈیوک آف ستھرلینڈ کے قریب تھیں۔ میری ان کے ساتھ بڑے دوستانہ ماحول میں بات چیت ہوئی۔ جب پرنس آئے تو سب نے کھڑے ہوکر ان کا استقبال کیا۔ ہم نے اپنے ایشیائی طریقہ سے انہیں آداب کیا۔ پرنس نے سب کا شکریہ ادا کیا اور ڈائس پر کرسی صدارت پر جا بیٹھے۔ اس کے بعد ایک کے بعد ایک کرکے ہر صنعت کار نے اپنی بنائی ہوئی چیزیں پرنس کو دکھائیں اور ان کی تفصیلات بتائیں۔ پرنس اور دوسرے لوگوں نے ان چیزوں کی تعریف کی۔ حاضرین کی طرف سے بھی انہیں داد و تحسین سے نوازا گیا۔ اس کے بعد ہم نیچے اتر کر ایک ہال میں گئے کہ جہاں پینٹ کی گئی اشیاء تھیں۔ جب ہم ان اشیاء کو دیکھ رہے تھے تو ایک بار پھر پرنس سے ہماری ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کمال مہربانی سے میرے چیف سے وہی سوال پوچھا کہ جو ہر انگریز پوچھتا ہے یعنی "آپ کو یہ ملک کیسا لگا؟" میں نے ترجمہ کرکے اس کا جواب دیا۔ یہ ہمیں بہت اچھا لگا۔ دوسرا سوال تھا کہ ہم نے انگلستان میں سب سے اچھی بات کیا دیکھی؟" میں نے اپنے چیف کی طرف سے جواب دیتے ہوئے کہا کہ "اعلیٰ خاندان کے لوگوں کی شائستگی سب سے اچھی لگی۔" اس پر پرنس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ پھر وہ آگے بڑھ گئے۔

اس طرح پرنس سے یہ ہمارا حادثاتی انٹرویو ختم ہوا۔

اسی دوپہر کو ہم نے ایک چینی نمائش دیکھی اور رات کو فینسی بال میں شرکت کی جو کہ پہلے والے کے مقابلے میں زیادہ اچھا تھا۔

ہم برٹش میوزیم کی اپنی پہلی والی سیر سے مطمئن نہیں تھے۔ اس لئے پندرہ تاریخ کو دوبارہ وہاں گئے' اور وہ سب چیزیں دیکھیں کہ جو پہلے نہیں دیکھ سکے تھے۔ اس کے بعد ہم ویسٹ منسٹر ایبے دیکھنے گئے کہ جو گوتھک طرز تعمیر کی ایک شاندار اور خوبصورت عمارت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسے ہنری سوم نے تعمیر کرایا تھا۔ اس کی تعمیر کی تاریخ 1221ء ہے۔ اس گرجے میں کوئر (گانے والوں کی جگہ) کا جو فرش ہے اس سے میں بے انتہا متاثر ہوا۔ یہ پچکاری کیا ہوا ہے اور اس میں رنگ برنگے قیمتی پتھر لگے ہوئے ہیں۔ اس کا سامنے والا حصہ کہ جو سلیمان کا دروازہ کہلاتا ہے' دیکھنے والے کے سامنے ایک شاندار منظر پیش کرتا ہے۔ اس مقدس جگہ میں ہی انگلستان کے مشہور لوگوں کے مجسمے ہیں' مگر اس قدر نہیں کہ جتنے سینٹ پال میں ہیں۔ ایک شائستہ نوجوان ایبٹ ہمیں مغربی دروازے پر لے گیا جہاں سے ہم نے اس کے اندرونی منظر کو اچھی طرح سے دیکھا اور ہم اس کی اونچی چھت اور ستونوں کی قطاروں کو دیکھ کر بڑے متاثر ہوئے۔ اس کی اوپر والی گیلری میں شیشے والی کھڑکیوں کی قطار تھی کہ جن سے گزر کر روشنی اندر آتی تھی۔ مگر روشنی چکاچوند پیدا نہیں کرتی تھی بلکہ ٹھنڈک کا احساس دلاتی تھی۔ اس کی سیر کرانے کے بعد ایبٹ ہمیں اس ہال میں لے گیا کہ جہاں انگلستان کے حکمرانوں کی تاج پوشی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ وہ بڑی سی کرسی کہ جس پر یہ بیٹھتے ہیں وہ پرانے فیشن کی ہے۔ ہم نے جانے سے پہلے اس کرسی کو چھوا' جو کہ امپائر کی سیٹ ہے' وہاں سے ایبٹ کی رہائش گاہ پر گئے جو کہ ایبے کے قریب ہی تھی جہاں ہم سب کی بہترین مشروب یعنی پانی سے خاطر کی گئی۔ اس کے بعد ہم نے اپنے میزبان سے صلیب اور اپنے ہلال کے موضوع پر بات کی۔ میرا چیف تو گھر چلا گیا اور میں یہاں سے اپنے دوست کیپٹن پوسٹن کے ساتھ آنریبل ڈبلیو بی بیرنگ جو کہ بورڈ آف کنٹرول کا ممبر ہے' اس سے ملنے چلا گیا۔

سیکرٹری ہم سے خوش اخلاقی کے ساتھ ملا۔ وہ تیس سالہ نوجوان تھا۔ جس نے مجھ سے ہندوستان کی حکومت کے بارے میں کئی سوالات کئے جن کا جواب میں نے اپنی حکومت کے حق میں دیا مگر میں نے دیکھا کہ وہ میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ کیپٹن پوسٹن نے اس سے کچھ دیر گفتگو کی۔ اس کے بعد ہم اس سے رخصت ہوئے۔

14 تاریخ کو ہم لارڈ اسٹلے کے ہاں شام کی پارٹی میں گئے۔ یہاں ہمارا تعارف وائس کاؤنٹ جوسے لین اور ان کی بیگم سے ہوا جوکہ انگلستان کی حسین ترین عورتوں میں سے تھیں۔ مجھے یہ عزت افزائی ملی کہ میں نے اس جنت کی حور کے ساتھ شطرنج کھیلی۔ اس کے ساتھ بازیاں کھیلیں اور دونوں میں ہار کر اسے خوش کیا۔

19 تاریخ کو میں نے انڈیا ہاؤس میں کورٹ آف پروپرائٹرز کی میٹنگ میں شرکت کی۔ یہاں میں نے مسٹر سیلون کی تقریر سنی جس میں انہوں نے ہندوستان میں برطانوی حکومت اور وہاں کے لوگوں کی فلاح و بہبود کے بارے میں کہا۔

25 تاریخ کو ہم نے بورڈ آف کنٹرول کے صدر لارڈ این سے ملاقات کی۔ گفتگو کے دوران ہمیں احساس ہوا کہ ہندوستان کے معاملات کے بارے میں ان کا رویہ دوسروں کے مقابلہ میں بالکل جدا تھا۔

27 تاریخ کو ہم نے شام کی ایک پارٹی میں شرکت کی کہ جہاں پر خوبصورت عورتوں اور مردوں کا مجمع تھا۔ یہاں پر میری ملاقات عربی کے عالم کرنل رائلز سے ہوئی جس سے کہ میں بیس سال قبل ویرا میں ملا تھا۔ میں نے اسے یاد دلایا کہ دونوں جگہ جہاں ہم ایک دوسرے سے ملے وہ کس قدر مختلف ہیں۔ اس نے کہا کہ فرق صرف جگہ میں نہیں وقت میں بھی ہے۔ میں ایک بار اس کے گھر پر بھی ملنے گیا۔ مگر وہ ہم سے ملاقات کے لئے نہیں آیا۔ شاید وہ خود کو ابھی تک ہندوستان ہی میں سمجھتا تھا اور پتہ نہیں تھا کہ اب وہ آزادی کی سرزمین رہ رہا تھا کہ جہاں ہم سب برابر تھے۔

28 تاریخ کو ہم ریجنٹ پارک میں عجیب و غریب چیز "دیوراما" دیکھنے چلے گئے۔ اس جادو والی جگہ پر جب ہم پہنچے تو ہمیں ایک تاریک کمرے میں لے جایا گیا جہاں ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اس جگہ بیٹھ کر ہمیں ڈر ہوا کہ نہ جانے اس تیرہ تاریک کمرے میں ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ لیکن موسیقی کی آوازوں نے ہمارے خطرات کو دور کردیا۔ پھر اچانک ہمارے سامنے کہرآلود صبح کا منظر آیا اس میں ہم نے ایک مسخری شکل والے سبزی بیچنے والے کو دریا کے کنارے دیکھا جہاں اس نے کشتی سے اپنا سامان اتارا۔ وہ خود سردی سے کانپ رہا تھا۔ اس کی بیوی اور بچہ کشتی میں سو رہے تھے۔ اس میں دریا اور پانی کی موجیں بالکل قدرتی معلوم ہورہی تھیں۔ دریا کے کنارے سے ایک محل دکھایا گیا کہ جس میں رہنے والے اپنے اپنے کاموں میں مصروف نظر آرہے تھے۔ اس دوران سورج تیزی سے چمکنا شروع ہوگیا اور اس کی شعاعیں چاروں طرف پھیل گئیں۔ پھر شام ہوگئی۔ یہاں پر منظر

بدل گیا۔ اس قدر تبدیلی آئی کہ سبزی بیچنے والا ایک خوبصورت لڑکی میں تبدیل ہوگیا۔ اب آسمان پر ستارے نظر آنے لگے۔ چاند کونے سے ابھرتا دکھائی دینے لگا اور اپنی لاعلم روشنی سے پورے منظر کو منور کر دیا۔ محل بھی جگمگاتا نظر آنے لگا جہاں لمپ اور جھاڑ فانوس روشن تھے۔ اس کے بعد یہ منظر بھی آہستہ آہستہ غائب ہوگیا۔ اس کے بعد پھر اندھیرا ہوگیا اور دور سے موسیقی کی آواز آنے لگی۔ اس کے بعد صبح کی روشنی دوبارہ سے ہوئی۔ اس بار چرچ کے اندرونی حصہ کو دکھایا گیا۔ شروع میں یہ خالی تھا' مگر دوسرے ہی لمحہ میں عبادت گزاروں سے بھرا ہوا نظر آیا۔ صبح دوپہر میں بدلی اور پھر چند لمحوں میں شام ہوگئی اور رات ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی یہ شو ختم ہوا اور ہم ہاؤس کیپر کے ساتھ اس کمرے سے باہر آئے۔ اس مکان کا راز یہ تھا کہ یہ مکان ایک طرف تو بالکل بند تھا مگر دوسری طرف اس میں کھڑکیاں تھیں کہ جن سے روشنی نکل کر سامنے پردے پر پڑتی تھی اور اس سے نظر کا دھوکہ ہوتا تھا اور ہم یہ مناظر دیکھتے تھے۔ لیکن پانی کیسے حرکت کرتا تھا؟ چاند سورج کیسے لگتے تھے؟ صبح و شام کیسے ہوتی تھی؟ اور وقت کیسے بدلتا تھا؟ یہ سب باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔

لہٰذا جب ہم گھر آئے ہیں تو کچھ تو پریشان تھے اور کچھ مطمئن کہ ہم نے جو کچھ دیکھا وہ ایک نیا تجربہ تھا۔ میرے کچھ ساتھیوں کا تو خیال تھا کہ یہ مکان بدروحوں کا مرکز تھا۔

29 تاریخ کو مجھے کالج آف سرجنز کو دیکھنے کی اجازت مل گئی۔ جہاں میں پروفیسر اوون سے ملا۔ اس نے اپنے اسسٹنٹ کو کہا کہ میں جو بھی دیکھنا چاہوں وہ مجھے دکھا دے اور ہر چیز کی تفصیلات سے مجھے آگاہ کرے۔ میں نے ساری عمارت کو گھوم کے دیکھا۔ ان انسانی جسموں کو بھی دیکھا کہ آدھے اور پورے طالب علموں کے مطالعہ کے لئے ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ طالب علم ان کے مطالعہ کے بعد تھوڑے وقت میں اور آسانی سے اناٹومی کے مضمون میں ماہر ہوسکتے تھے۔

یکم جولائی کو ہم نیشنل گیلری دیکھنے گئے۔ یہاں سے ایک تھیٹر گئے کہ جہاں پر ڈوبلر' بازی گر تماشہ دکھاتا تھا۔ ہم اس کی شعبدہ بازی سے بہت متاثر ہوئے کہ جس میں اس کی بندوق خودبخود فائر کرنے لگی۔ ایک خشک مچھلی سے خرگوش برآمد ہوا' گھڑیوں کو بند کردیا' رومالوں کو آگ لگا دی' اور پھر انہیں دوبارہ سے اصلی حالت میں لے آیا۔ مگر ہمارے ہندوستانی بازی گر ان کے مقابلہ میں اعلیٰ پایہ کے ہیں۔

یورپین بازی گروں کو جدید زمانہ کی تمام سہولتیں میسر ہیں کہ جن کو استعمال کرتے

ہوئے وہ بہتر طریقہ سے اپنا شو دکھاتے ہیں۔ جس ہال میں وہ کرتب دکھاتے ہیں اسے جب چاہیں روشن کرتے ہیں اور جب چاہیں وہاں اندھیرا ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہندوستانی بازی گر کھلے میدان میں لوگوں کے سامنے کھڑا ہوتا ہے اور اس قسم کے کرتب دکھاتا ہے کہ جس میں نیولا پورے سانپ کو نگل جاتا ہے۔ اس کا منہ خون سے بھر جاتا ہے۔ پھر بازی گر اس کی دم سے سانپ کو زندہ برآمد کرلیتا ہے۔ ایک ہندوستانی بازی گر اپنے بچے کو خنجر گھونپتا ہے' اور اپنی بیوی کا گلا کاٹتا ہے' آپ ان کے زخموں سے خون بہتا ہوا دیکھتے ہیں' لیکن پھر آپ دیکھتے ہیں کہ سب ٹھیک ٹھاک ہے۔

میں نے خود ایک مرتبہ ایک برہمن بازی گر سے دوستی کرلی تھی جس کا نام لال بھاٹ تھا۔ وہ یہ ظاہر کرتا تھا کہ اسے دیوی دیوتاؤں کی طرف سے یہ صلاحیت ودیعت کی گئی ہے کہ وہ یہ شعبدہ بازی کرے۔ قدیم زمانے میں لوگ ان ہی شعبدوں کو معجزے سمجھتے تھے۔ ایک بار میں اپنے دو یورپین دوستوں کو جن کے نام ڈاکٹر جے پیچ اور ڈاکٹر ڈبلیو لیگرٹ تھے انہیں سورت لے گیا کہ جہاں وہ رہتا تھا۔ وہ دونوں ڈاکٹر اس پر بڑے حیران ہوئے کہ وہ شخص تالی بجا کر الائچی اور چھالیہ ہاتھ سے نکال لیتا تھا۔ اس نے میرے ایک دوست سے کہا کہ وہ اس کی زمرد کی انگوٹھی کو مضبوطی سے پکڑ لے جہاں سے وہ دو یا تین منٹ میں غائب ہوگئی اور ڈاکٹر لیگرٹ کے کوٹ کے اندر سے ملی۔

جولائی کا پہلا ہفتہ سستی و کاہلی کے ساتھ گزرا۔ میں دوپہر کو کین سنگٹن گارڈن میں چہل قدمی کرنے چلا جایا کرتا تھا جہاں میں ایک یا دو گھنٹہ بیٹھ کر فطرت کے حسن سے لطف اٹھاتا تھا۔

دس تاریخ کو میں اپنے چیف کے ساتھ پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ گیا جوکہ ریجنٹ سٹریٹ میں واقع ہے۔ گیارہ تاریخ کو ہم اس شہر کی عدالت دیکھنے گئے جہاں ہماری ملاقات لارڈ چانسلر سے ہوئی۔

دوسرے دن میرے چیف نے حکم دیا کہ میں روسی شہزادے کو اسٹلے تھیٹر میں آنے کی دعوت دوں کہ جہاں ہم نے ایک بوکس اپنے لئے مخصوص کرا لیا تھا۔ میں نے فوراً اس پر عمل کیا اور شہزادے تک یہ پیغام پہنچایا جس نے یہ دعوت فوراً قبول کرلی۔ جب میں شہزادے سے ملنے گیا تو اس کے ساتھ ایک لمبا' صحت مند اور خوبصورت انگریز نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اسے میری گفتگو سے دلچسپی پیدا ہوئی ہے۔ جب شہزادے نے یہ دیکھا تو اس نے مجھے اس سے روشناس کرایا۔ اس کا نام لارڈ جان الفنسٹن تھا' جوکہ

مدراس کا گورنر رہ چکا تھا۔ مجھے اس سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ میری تھوڑی دیر کی گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس کی ذہنی صلاحیتیں بھی اس طرح سے اعلیٰ ہیں جیسے کہ وہ ظاہری طور پر نظر آتا ہے۔

شام کو شہزادہ وقت پر آگیا اور ہم سب مل کر تھیٹر گئے۔ رات کا شو قابل تعریف تھا۔ اس تھیٹر کے گھوڑے انسان کی زبان اور موسیقی کی دھنوں کو اچھی طرح سے سمجھتے تھے۔ کیونکہ وہ موسیقی کی لے اور احکامات پر دوڑتے تھے' پلٹتے تھے اور کھڑے ہو جاتے تھے۔ ان میں سے ایک گھوڑے پر ایک خوبصورت لڑکی کھڑی ہوگئی اور پھر اسے پوری تیزی سے اسٹیج پر دوڑایا۔ اسی دوڑ کے دوران اس کے ایک ساتھی نے اس کی طرف گیند پھینکی جو اس نے چابک دستی سے ہوا میں پکڑ لی جس کو اس نے اچھالنا شروع کردیا۔ کھیل یہاں پر ہی پورا نہیں ہوا۔ وہ ہر بار ایک نئی گیند پکڑتی تھی اور اسے اچھالتی تھی' یہاں تک کہ اس کے پاس سات گیندیں ہوگئیں کہ جنہیں وہ اچھال رہی تھی اور پکڑ رہی تھی۔ اسی دوران گھوڑا برابر دوڑے جارہا تھا۔ اس کے بعد چین سے جنگ کو ایکٹ کیا گیا۔ اس طرح سے یہ تماشہ ختم ہوا۔

17 تاریخ کو ہم نے سنا کہ شہر میں ایک بونا آیا ہوا ہے' لہٰذا ہم اسے دیکھنے کے لئے چلے گئے اس کا قد 28 انچ تھا اور عمر تیرہ سال تھی۔ اس میں بونو والی کسی قسم کی جسمانی خرابی نہیں تھی۔ نہ تو اس کے ٹخنے مڑے ہوئے تھے اور نہ ہی اس کی پیٹھ پر کوب تھا۔ وہ جنرل ٹام تھمب کہلاتا تھا۔ اس سے بات چیت کے بعد ہمیں اندازہ ہوا کہ وہ ذہنی طور پر صحت مند ہے۔ وہ ملٹری کی یونیفارم پہنے ہوئے تھا۔ سر پر وردی والی ٹوپی اور ایک طرف تلوار لٹکی ہوئی تھی۔ اس ہیئت میں وہ بڑا شاندار نظر آتا تھا اور ساتھ میں اسے دیکھنے والے ہنسنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ خاص طور سے اس وقت کہ جب وہ محبت کے گیت گاتا تھا اور کسی لڑکی کے ساتھ رقص کرتا تھا جو کہ اس سے کئی گنا بڑی ہوتی تھی۔

24 تاریخ کو ہمیں مسٹر لاتھم نے دعوت دی کہ ہم ونڈسر میں ان کے گھر ایک دن گزاریں۔ لہٰذا ہم صبح جلدی ٹرین سے روانہ ہوئے ایک گھنٹہ کے اندر اندر وہاں پہنچ گئے۔ یہ شہر خوب آباد ہے اور دریائے ٹیمز کے کنارے واقع ہے۔ چونکہ ہمارے میزبان اجازت لے لی تھی اس لئے ہم اس کے مشہور قلعہ کو دیکھنے گئے۔ اس کے بعد مسٹر لاتھم کے گھر ہم نے پورا دن گزارا۔

31 تاریخ کو ہمارے دوست بلنفورڈ گرین وچ میں کھانے کی دعوت دی۔ ہم لندن سے

ایک اسٹیمر میں روانہ ہوئے اور آدھ گھنٹے میں وہاں پہنچ گئے۔ گرین وچ کا شہر دریا کے کنارے واقع ہے اور کافی آباد ہے۔ یہاں پر بیمار ملاحوں کے لئے ایک بہترین ہسپتال ہے۔ یہ شہر اپنے خوبصورت باغ اور رصدگاہ کی وجہ سے بھی مشہور ہے جو کہ ایک پہاڑی کی چوٹی پر ہے۔

اگست کا مہینہ کام کاج میں گزر گیا۔ ایک دن میں بازار میں جارہا تھا کہ کسی نے بتایا کہ کچھ امریکی مصری ہال میں آئے ہوئے ہیں۔ میں وہاں گیا اور داخلہ کی فیس ادا کر کے ہال میں داخل ہوا کہ جہاں ریڈ انڈین جن کی تعداد نو ہوگی وہ کھالوں کا لباس پہنے، پروں اور تنکوں کو سر پر لگائے انتہائی غیرمہذب حالت میں کھڑے تھے۔ ان کا رنگ انتہائی گندمی تھا۔ دیکھنے میں وہ بالکل جنگلی نظر آتے تھے۔ جسمانی طور پر وہ متوازن اعضا رکھتے تھے سوائے بازوؤں کے جو بہت پتلے تھے۔ وہ جو زبان بولتے تھے وہ آواز سے مراٹھی لگتی تھی۔ ایک انگریز ان کی ترجمانی کررہا تھا وہ جو کچھ کہہ رہے تھے وہ بالکل سیدھی سادھی اور فطری باتیں تھیں۔ وہ اپنے جسم اور ماتھے کو ہندوؤں کی طرح پینٹ کئے ہوئے تھے۔

اس دن مجھے مسٹر پلسفورڈ کی جانب سے ٹیلی سکوپ کی شکل میں ایک خوبصورت تحفہ ملا۔ اس کو میں نے ہچکچاہٹ کے ساتھ قبول کرلیا۔ میرے نزدیک اس تحفہ کی اس لئے بڑی قدر و قیمت تھی کیونکہ یہ اس شخص کی جانب سے تھا کہ جو میرے ملک اور خود میری فلاح و بہبود کا خیال رکھتا ہے۔

26 تاریخ کو ہمیں خبر ملی کہ ہماری ملکہ معظمہ کے ہاں شہزادے کی ولادت ہوئی ہے۔ اس پر ایشیائی رسم کے مطابق میرے چیف نے مبارکباد کا خط لکھ کر مجھے ونڈسر کے قلعہ بھیجا کہ جہاں ملکہ مقیم تھیں۔ میں نے وہ خط سیکرٹری کو دیا اور اس کا جواب لے کر دوپہر ہی کو واپس آگیا۔

27 تاریخ کو ہم نے لارڈ بلوم فیلڈ کے لئے ایک تعارفی خط لیا اور کیپٹن ٹی پوسٹن کی ہمراہی میں ان سے ملنے کے لئے وولوچ روانہ ہوئے۔ ہمیں اطلاع دی گئی کہ ہم دوپہر میں ان سے ملاقات کرسکتے ہیں۔ اس عرصہ میں ایک افسر جو ہماری میزبانی کررہا تھا اس نے ہمیں مختلف چیزیں دکھائیں۔ دراصل یہ سر چارلس فوربس تھے کہ جنہوں نے ہمیں وولوچ جانے کا مشورہ دیا تھا۔ انہوں نے ہمارے قیام کے دوران ہماری ہر طرح سے مدد کی اور ہماری مشکلات کو دور کرنے کی کوشش کی۔ یہ نیک دل شخص ہندوستان کے سرپرستوں میں سے تھا۔

اس عرصہ میں ہمارے چیف کو کورٹ آف ڈائرکٹرز سے کی درخواست کا جواب مل چکا تھا اور چیئرمین نے یہ یقین دلایا تھا کہ اس کے معاملات کا انصاف کے ساتھ جائزہ لیا جائے گا۔ اس لئے میں نے اپنے چیف کو اس پر آمادہ کیا کہ اب اس خوبصورت اور سحرزدہ شہر میں زیادہ عرصہ رہنے کا کوئی فائدہ نہیں اور جتنی جلدی ہوسکے یہاں سے رخصت ہونا چاہیے۔ چنانچہ ہم نے واپسی کے لئے جہاز میں اپنی سیٹیں مخصوص کرالیں۔ اس کے بعد ہمیں جو ایک مہینہ کا وقت ملا اس میں ہم دوستوں سے ملے اور وہ جگہیں دیکھیں جو باقی رہ گئی تھیں۔ آخری زمانہ میں ہماری دوستی سلطان ترکی کے سفیر سید امین الدین ال علی سے ہوئی کہ جسے ال آفندی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ہمیں اس سے کئی بار ملنے کا موقع ملا خلیفہ اسلام کے اس نمائندے سے کئی موضوعات پر گفتگو رہی۔ میرے چیف نے اسے ہندوستان کی بنی ہوئی ایک قیمتی تلوار اس کو پیش کی۔ 12 ستمبر کو ہم نے اس سے آخری ملاقات کی۔ اس موقع پر اس نے اپنی محبت اور دوستی کا یقین دلایا۔ رخصت کے وقت اس نے میرے چیف کو ایک قیمتی ترکی کتاب پیش کی اور ایسی ہی کتاب دستخط کرکے مجھے دی۔ ہندوستان کی حکومت کے بارے میں ایک طویل گفتگو کے بعد ہم اس سے جدا ہوئے۔ ہم نے اسے یقین دلایا کہ جب بھی ترکی کے خلیفہ کو ہماری خدمات کی ضرورت ہو' ہم اس کے لئے ہر وقت آمادہ ہیں۔

اب یہاں میں انگریزوں کے کردار کے بارے میں کچھ کہنا چاہوں گا۔ وہ مکمل طور پر قانون کی پابندی کرتے ہیں اور اپنے سے اعلیٰ عہدیداروں یا رتبہ والوں کے احکامات کی تعمیل کرتے ہیں۔ ان میں وطن سے محبت کا جذبہ دوسری تمام اقوام کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ اپنی عورتوں پر وہ اعتماد کرتے ہیں' ان کی اطاعت کرتے ہیں اور ان کے آگے اعتدال کی حد سے زیادہ فروتنی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ درحقیقت اس ملک میں عورتوں کو بہت زیادہ آزادی دے دی گئی ہے اس کے نتیجہ میں جو خرابیاں پیدا ہورہی ہیں وہ قابل افسوس ہیں۔

اب میں 1844ء سے 1854ء کے دور کو نہیں چھیڑتا۔ اس عرصہ میں' میں نے کئی نشیب و فراز دیکھے۔ ان کی تفصیل کے لئے مجھے ایک دوسری کتاب لکھنی ہوگی۔ میرا ارادہ ہے کہ یہ میں اس وقت لکھوں گا کہ جب میں میر جعفر کی ملازمت سے ریٹائر ہوکر اپنے وقت کا مالک ہوں گا۔

مختصر یہ کہ ہم نے 13 اکتوبر کو انگلستان چھوڑا اور 12 نومبر کو بمبئی پہنچ گئے۔ بخیریت واپسی کے لئے ہم خدا کے شکرگزار ہیں۔

یہاں ہم پندرہ دن تک ٹھہرے رہے۔ اس دوران میں ہم نے سرکاری کاموں میں وقت گزارا۔ آنر یبل گورنر سے ملاقات کی۔ اس کو دوستوں' اور کمپنی کے اعلیٰ عہدیداروں کے خطوط دیئے۔ بمبئی کے دوستوں سے ملاقاتیں کیں۔ اس کے بعد میرا چیف سمندر کے ذریعہ سورت چلا گیا جبکہ میں نے خشکی کا راستہ اختیار کیا۔ اس طرح 5 دسمبر 1844ء میں' اپنے خوبصورت اور پیارے گھر پہنچا۔ میری بیوی' اس طویل سفر کے بعد' مجھے دیکھ کر بے انتہا خوش ہوئی اور میں خود بھی اپنی بیوی سے مل کر بے انتہا مسرور ہوا کیونکہ وہی اس دنیا میں میری پرخلوص ساتھی اور رفیق ہے جو ہر خوشی و غمی میں میرے ساتھ برابر کی شریک ہے۔

ظاہر ہے کہ اس سفر کی وجہ سے میرے چیف اور خود میری مالی حالت اپنے اپنے رتبہ کے مطابق متاثر ہوئی۔ لیکن ایک حادثہ جس سے میرا چیف دوچار ہوا کہ اس کی محبوب بیوی کی وفات تھی جو اس کے لئے دولت اور رتبہ کی وجہ تھی۔ اس کا انتقال 9 جنوری 1843ء کو تپ دق کی بیماری میں ہوا۔ 15 جنوری 1847ء کو میری بیوی بھی ہیضہ کی بیماری میں مبتلا ہوکر دارفانی کوسدھاری۔ اس صدمہ کا اثر مجھ پر اس قدر تھا کہ میں نے اس دنیا کو تیاگ نے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ لیکن میرے دوستوں اور ساتھیوں نے' خصوصیت سے میرے چیف نے دوبارہ سے مجھے دنیاوی الجھنوں میں پھنسا دیا اور دوبارہ سے میری گردن میں دنیا کی غلامی کا طوق ڈال دیا۔

12 جولائی 1847ء کو بروز پیر میری شادی ولایت خانم سے ہوئی کہ جو نجیب النساء بیگم کی منہ بولی بیٹی تھی۔ اس خاتون سے میرے ایک لڑکا اور تین لڑکیاں ہوئی ہیں۔ خدا ان سب کو اپنی امان میں رکھے۔ میری گھریلو ذمہ داریاں اب بڑھ گئی ہیں۔ میری عمر کافی ہو چکی ہے۔ میری آمدنی میری فیملی کی ضروریات سے کم ہے۔ لیکن میں نے خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے ہر چیز اس پر چھوڑ دی ہے۔ کیونکہ خدائے برتر نے پہلے کھانا پیدا کیا اور پھر مخلوق جوکہ اس کے سہارے زندہ رہتی ہے۔ (آمین)